بسم الله الرحمن الرحيم

علمی تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی بعنوان:

دوقومی نظریہ کی تشکیل میں اُردو کے اداروں اور شخصیات کے کردار کا تاریخی تجزیہ

محققہ

عظمیٰ پروین

زیرِ نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد شمس الدین

رئیس کلیہءفنون، جامعہ کراچی

شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی

۲۰۰۸ء
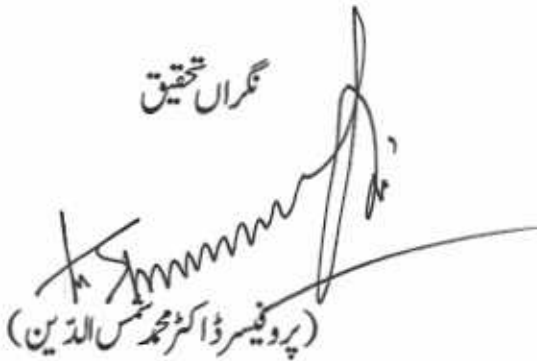
انتساب

میں اپنی تحقیقی کاوش اپنے محترم والدین اور پیارے بھائی فلائیٹ لیفٹیننٹ (فائٹر پائلٹ) محمد زبیر (شہید) کے نام کرتی ہوں جن کی محبتوں، شفقتوں اور دعاؤں نے مجھے علم کی عظمتوں سے ہمکنار کیا۔

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ تحقیق کار محترمہ عظمٰی پروین نے مذکورہ ہذا مقالہ بعنوان **"دوقومی نظریہ کی تشکیل میں اُردو کے اداروں اور شخصیات کے کردار کا تاریخی تجزیہ"** میری زیرِ نگرانی تکمیل تک پہنچایا۔ یہ مقالہ جامعہ کراچی کی ہدایات کے عین مطابق شعبہ اسلامی تاریخ میں فلسفے کی ڈگری کے اجراء کے لئے جملہ کوائف کا حامل ہے۔

نگراں تحقیق

(پروفیسر ڈاکٹر محمد شمس الدّین)

رئیس کلیہ فنون

جامعہ کراچی

خلاصہ

پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا۔ یہ نظریہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک قرآن وسنت اور دوسرا اردو زبان۔ دو قومی نظریے کی حقیقی تفہیم اور وضاحت کے بغیر قومی نصب العین اور اہداف کا شعور ممکن نہیں۔ لہذا اس کا سائنسی اور تاریخی تجزیہ لازمی ہے۔ تحریک پاکستان میں اسلام اور اردو باہم شریک اور ہم کار رہے۔ تحریک پاکستان کی اہم مسلم شخصیات نے مسلم سیاسی اقتدار کے لیے جن دو اہم لوازم کو اپنا علیحدہ تشخص بنا کر پیش کیا۔ انہیں مخالفین یعنی انگریزوں اور ہندوؤں نے بالآخر تسلیم کرلیا اور پاکستان بن گیا۔

پاکستان کو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیان جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں آئین کی تیاری بنیادی مسئلہ تھا اور زبان کے مسئلے کی وجہ سے آٹھ سال تک آئین نہ بن سکا تاہم جب اردو اور بنگالی زبان کو قومی زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا تو ۱۹۵۶ء میں پہلا آئین منظور ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء کے وفاقی دستور میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کا عہد کیا گیا۔ اردو عملاً پاکستان کی عوامی اور رابطے کی زبان ہے لیکن حکمران طبقے کے رویے اور سیاسی مصلحتوں نے اس کے نفاذ میں رخنہ اندازی کی۔ چنانچہ قومی نظریے کی جز ولاینفک کے طور پر اس کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اردو کا تنازعہ اپنے کامیاب منطقی اثبات سے ہمکنار نہ ہوتا تو قیام پاکستان کی تحریک نامعلوم مدت تک آسودہ منزل نہ ہوتی۔ اس کامرانی میں فروغ اردو کے تعلیمی، ادبی تحریکی اداروں اور تحریک قیام پاکستان کی بانی شخصیات کا کردار کلیدی نوعیت کا ہے۔ اس کردار کو تاریخی تجزیے کے ذریعے اسناد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جو ہمارے مقالے کا بنیادی مقصد ہے۔

اس مقالے میں ان تمام جزئیات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ جس کی وجہ سے اردو زبان اپنی علمی وتہذیبی، تاریخی اہمیت کے باوجود اب تک اپنا جائز مقام حاصل نہ کرسکی جب کہ حکومتی سرپرستی میں اردو کے فروغ کے ادارے قائم کیے گئے جو ہنوز اب تک مؤثر طور پر کام انجام نہیں دے پائے۔ اس مقالے میں ان وجوہات کو بھی جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ جو اردو زبان کے سرکاری نفاذ میں رکاوٹ بنے رہے۔ اس مقالے کو ان حالات کے تناظر میں دیکھا گیا ہے جو برصغیر، پاک وہند میں آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے غلبے سے وقوع پزیر ہوئے۔ مسلم حکمرانوں کے زیر اثر مفتوحین نے مساوات کے اصول کو معاشرتی درجہ بندی کے تحت پیدا ہونے والی ناانصافیوں کے خاتمے کے لیے اپنانے کی کوشش کی۔ جس کے لیے عملی تحریکات سولہویں صدی عیسوی میں زیادہ متحرک نظر آتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھویں صدی عیسوی میں قائم ہونے والا اقتدار انیسویں صدی عیسوی تک مختلف ضمنی مشکلات سے قطع نظر قائم رہا۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ ایک طویل عرصے تک دو مختلف مکتبہ ہائے فکر کی اقوام کا باہم شیروشکر ہونا اور حکومتی امور میں مفتوحین کا حکمرانوں کا دست راست ہونا دراصل مسلمانوں کی رواداری، حسن سلوک اور دونوں اقوام کے

درمیان بہترین تعلقات کا پتہ دیتا ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندو مسلم تعلقات میں اس وقت دراڑ پڑنا شروع ہوگئی جب انگریز تاجر کمپنی "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے ہندوستان میں سیاسی اثر ورسوخ حاصل کر لیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں یہ کوشش کی گئی کہ ہندوستان میں موجود دو بڑی اقوام کے مابین موجود مذہبی، سماجی اور معاشرتی اختلافات کا فائدہ اٹھایا جا سکے جس کی بنیاد وہ تاریخی ماخذات ہیں جو انگریزوں کی حکمت عملی سمجھنے کے لیے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں اپنے استحکام کے لیے انگریزوں نے انیسویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ جس کے تحت جدید ہندی کو اردو کے مدمقابل پروان چڑھایا گیا اس حکمت عملی کے باوجود انگریزوں کی جانب سے اردو زبان کی سرپرستی کی جاتی رہی اور آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر، جو خود اردو زبان کا شاعر تھا، اسے بادشاہ بنا دیا گیا انگریزوں کا یہ اقدام اردو زبان کی ہندوستان میں مقبولیت اور اہمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں برطانیہ کی براہ راست عملداری قائم ہوگئی تو ایسے اقدامات کیے گئے جو ہندوستان میں موجود مسلم آبادی کے لیے تذلیل وتحقیر کا باعث اور ہندوؤں کے لیے ترقی کا زینہ تھے۔ چنانچہ اسی عہد میں اردو ہندی تنازعہ، جس کی بنیاد ۱۸۰۰ء میں رکھی گئی تھی، پوری شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا۔ اس لسانی تنازع نے دو قومی نظریے کو جنم دیا۔ بہ ایں ہمہ دو قومی نظریے کی تشکیل میں سب سے اہم کردار انگریزوں نے ادا کیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں انقلاب فرانس نے دنیا کو سب سے پہلے جمہوری اقدار سے روشناس کرایا۔ چنانچہ انیسویں صدی میں انگریزوں نے ہندوستان میں اسی بنیاد پر سیاسی وانتظامی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی تاہم انہوں نے یہ فراموش کر دیا کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں جن کی تہذیب وثقافت، تاریخ اور رسم ورواج ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ اقوام کبھی بھی آپس میں ضم نہیں ہوسکتیں۔ یہ نقطہ آغاز تھا جس سے ہندوستان میں متحدہ قومیت، دو قومی نظریے، ہندو قومیت اور مسلم قومیت کی بحث وتمحیص کا آغاز ہوا۔ نتیجتاً ان موضوعات پر مختلف النوع دستیاب مواد سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بعد ازاں بیسویں صدی عیسوی میں دو قومی نظریے کو شدت کے ساتھ ابھارنے والے کئی عوامل میں سے، دو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں اردو زبان کے دو معروف ادوار کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ایک دور جس میں اردو زبان نے تشکیل پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا اور دوسرا وہ دور جس میں علیحدہ مملکت کا حصول تو ممکن ہو سکا لیکن اردو زبان کے نفاذ کا مسئلہ ہنوز اپنی جگہ موجود ہے۔ اردو زبان کو سرکاری حیثیت دلانے کے لیے کام کیا جاتا رہا مگر یہ کوششیں آئین (۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء) میں اس کو بنیادی حق دلانے میں کامیاب رہیں۔ لیکن اس کا عملی نفاذ ممکن نہ ہو سکا۔ تاہم کچھ پیش رفت ضرور ہوئی جس میں وفاقی اردو یونیورسٹی، اکادمی ادبیات پاکستان کا قیام، مقتدرہ قومی زبان اور اردو کو اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں میں رائج کرنے کی کوششیں نمایاں ہیں۔

Abstract

Pakistan came into existence on the basis of "Two Nation Theory". The Two Nation Theory was based upon two parts i.e. Quran Al Sunnah and the Urdu language. The two nations' vision and its real understanding without national aims and its parameters are not feasible. It is, therefore, essential to analyze the theory in the light of scientific and historical research. In the movement to obtain Pakistan, Islamic vision and Urdu language were jointly accepted as the integral part. The most important and prominent personalities in this movement declared it eminent that two nation theory is necessary for a separate homeland for the Muslims.

Pakistan faced critical difficulties in framing of its constitution from 1947 to 1956. After declaring Urdu and Bengali as the two national languages in the then United Pakistan as East and West Pakistan provinces the constitutional of Pakistan was framed. In 1956 the constitution was enforced in the country after acceptance of this issue by East and West Pakistan unanimously. Practically Urdu Language is the source of common relation of Pakistan citizens. The ruling elite's behaviour and politics stood as a hurdle in its imposition as official language. Therefore, the researcher has tried to study this historical background in depth. It may be concluded that if language was not successfully handled with positive conclusion then freedom of Pakistan movement may have suffered badly.

In the successful event for the promotion of Urdu in the movement of Pakistan, educational scholars and founders played a vital role. The action taken produced cogent reasons along with historical analysis is the fundamental aim of this thesis. Factors due to which Urdu language could not achieve its environmental educational and historical importance have been assessed in detail. Moreover, under the guidance of the government, several institutions were established for the promotion of Urdu language without any notable results. So far, in this thesis all cogent reasons have been highlighted, particularly the conditions where the Muslims in the Indo Pak Subcontinent had an upper hand in the 8th century when they ruled it. The Muslim rulers wanted to subside the injustice created in the social grading of conquered areas for which practical movement was more effective in the 16th century.

The regime of Muslim rulers in India established in 8th century continued till the 19th century faced many difficulties. However the regime was enforced and remained intact. It is also necessary to mention that two different nations were living together peacefully for a long time

and they were the right hand of the rulers in Muslims. Indeed the behaviour of Muslims was quite good and their treatment showed best relations to indicate the good regime of Muslim rulers.

In 18th century, a seed of hatred was sown in the relations between the Hindus and Muslims when the British merchants/traders through a company named East India Company established their political influence in India. In the beginning of 19th century they took advantage of the differences present in religious, social and living standards of the two nations. The British pondered to avail benefit from the circumstances. History reveals the policy of the British "to divide and rule".

The British established Fort William College in the beginning of 19th century wherein modern Hindi language was preferred on Urdu. However, the British continued to support Urdu as well. In order to show their respect for Urdu Language the British made Bahadur Shah Zafar, the last Mughal Emperor of India. Bahadur Shah Zafar was a great Urdu poet himself. But after the war of independence in 1857 when British had secured direct control of Indo-Pak subcontinent, they tried all means and ways to degrade the Muslims in every respect. However these steps were taken to upgrade and develop the Hindus and the Hindi language. Thus, the seed sown in 1800 now showed the results of linguistic hatred and paved the way for the Two Nation Theory. We can more clearly accept the fact that British were the creators of this theory.

The British tried to impose administrative and political changes in line with the changes adopted after the French revolution, as part of democratic standards. However, the British ignored the difference in culture, tradition and customs of various religions which lived in the region since long. These nations can never be made to intermix among themselves. Hence, the basis of various movements, like joint commission Two Nations Theory. Hindu nationhood and Muslim started at this point. The British took advantage of the different visions among Hindus and Muslims and paved the way for Two Nation theory in particular. Keeping all the factors in mind for the movement, two main events came on the rise. Our thesis analyzes two main periods of Urdu's revival. The first period when Urdu formed the basis of Pakistan's existence and the other period deals with the imposition of Urdu which was the basis of success of partition. Attempts have been made to impose Urdu as the state language. The constitutions of 1956, 1965 and 1973 stated its status but it was not materialized. In practice, however some institutions like Federal Urdu University, National Language Authority and Academy of Letters and higher academic institutions have attempted to use Urdu as medium of instruction.

دوقومی نظریہ کی تشکیل میں اُردو کے اداروں اور شخصیات کے کردار کا تاریخی تجزیہ

فہرست مضامین

حرفِ اوّل

حرفِ اوّل

گلوبل ولیج (Global village) میں ڈھلتی ہوئی دنیا اور الیکٹرونک (Electronic) میڈیا کے ذریعے سمٹے ہوئے اذھان تاریخ کو اکائی کے بجائے جزوی کائیوں کی تشکیل میں مبتلا حقائق کو سیاق وسباق کے حوالے سے دیکھنے سے قاصر ہوتے جارہے ہیں۔ پیش نظر موضوع "دوقومی نظریے کی تشکیل میں اردو کے اداروں اور شخصیات کے کردار کا تاریخی تجزیہ "اس وقت تک واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں آسکتا جب تک ہم ہندوستان کی تہذیبی اقدار کو کما حقہ سمجھنے کے قابل نہ ہو جائیں۔

قدیم ہندوستان تہذیب اور ماقبل تہذیب کے حوالے سے سوشیالوجی کے مروجہ اور متداولہ اصولوں سے گزرا ہوگا یعنی اس خطہ زمین پر جہاں جہاں زندگی گزارنے کے آثار تھے وہاں وہاں قبائل کی صورت میں نظام ہستی کا سلسلہ جاری وساری ہوتا گیا۔ موئنجو دڑو، ہڑپا، گندھارا، ایلورا اور اجنتا مذکورہ استدلال کی نشانیاں ہیں۔ قدیم ہندوستانی معاشرے میں آریاؤں کی آمد[1] سے ہلچل پیدا ہوئی اور یہیں سے ہندوستان بابل و نینوا کی تہذیبوں کے ہم پلہ قرار پایا۔ رگ وید[2] سے مذہبی قوانین کا دستاویزی انداز میں فروغ شروع ہوا۔ آریا چونکہ یونانی النسل تھے اور دریائے ایجا کے کنارے ہوتے ہوئے درّہ خیبر کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ پاکستان کا بالائی پنجاب براہ راست متاثر ہوا۔ بہر حال ان کی آمد نے مقامی باشندوں کو کنارے لگا دیا[3]۔ ذات پات کا نظام وضع ہوا اور آریا برہمن بن بیٹھے[4]۔ اس سے متعلقہ بے شمار کتب دستیاب ہیں۔ ٹائن۔ بی (Toynbee) کے "تہذیبی مطالعے" یا عبدالمجید سالک کی کتاب "مسلم ثقافت ہندوستان میں" اور اس طرح کی خالص اور اسلامی سماجی تاریخیں یا پھر مستند ہندو لکھنے والے مثلاً ڈاکٹر تارا چند اور ترپاٹھی وغیرہ کے مطالعے سے بھی مذکورہ نتیجہ باآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ دنیا کی ترقی میں زندگی کے آثار دریافت کرنے اور قوموں کی ہجرتوں نے بڑا کلیدی کردار ادا کیا ہے اور آج کی دنیا میں شاید ہی کسی خطے میں خالص اقوام آباد ہیں۔ پس اس میں محل نظر اتنی سی بات ہے کہ اس طرح کا قوموں کا ہجرت کرنا اور مقامیوں سے اختلاط یا میل جول میں کم سے کم تین نسلوں کا انتظار

کرنا پڑتا ہے۔آرنلڈ۔جے ٹائن بی کے مطابق:

"انسانی نفسیات محل وقوع کے تابع ہوتی ہے۔"۵

تو یہ تیسری نسل محل وقوع کے تابع ہوجاتی ہے اور مقامی، غیر مقامی کا فرق از خود مٹنے لگتا ہے۔

قدیم ہندوستان کو معاشرتی اکائی میں تبدیل ہونے کے حوالے سے مذکورہ نوعیت سے گزرنا پڑا۔ذات پات کے نظام کے زیر اثر ہی سہی برہمن کی سربراہی میں ہندوستان بحیثیت سماج اور ملک نہ صرف تاریخ کا حصہ ہے بلکہ اس کے مظاہرے تا حال دیکھے جا سکتے ہیں۔اسلامی تاریخ کا عمل دخل چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوا اور بلا رنگ و نسل،ذات پات کے جب مسلمانوں نے اقوام عالم میں بڑھنا شروع کیا۔جس طرح یونانیوں کے قیصر یا ایرانیوں کے دارا یا تاریخ انسانی میں کوئنستا ئن یا الیگزینڈر دی گریٹ(Alexander the Great) نے تاریخ کو ہمیشہ فاتح اور مفتوح کے معاملات اور مسائل کو سمجھنے میں مدد دی کہ کہ فاتحین کا کلچر (تہذیب و تمدن) کس طرح مفتوحین پر اثر انداز ہوتا ہے۔اسلامی تاریخ کا سفر ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور اس ہجرت میں بھی بہترین نظام حیات کے فروغ کے لیے راہ نہ صرف ہموار ہوتی ہے بلکہ اہل عرب کو وہ راستہ میسر آ جاتا ہے کہ جس کی تبلیغ و ترویج کو وہ اپنے لیے فرض سمجھتے ہیں نیز ساری دنیا کو بہترین زندگی گزارنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔۶ تاریخ انسانی میں ہمیشہ سازشوں سے جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔ اس کے لیے فاتحین کے پاس نظریہ حیات اور بہتر ٹیکنالوجی(Technology) کا ہونا ناگزیر ہے۔(قدیم جنگجوؤں کی بہادری کو ٹیکنالوجی(Technology) کے ذیل میں سمجھنا چاہیے۔)

اسلامی تاریخ اور اسلامی فکر نے دنیا کو ہر سطح پر متاثر کیا۔علم کی سطح پر تیرھویں صدی عیسوی تک دنیا پر اپنے افکار کے ذریعے گہرے نقوش مرتب کیے جب کہ حکمرانی کی سطح پر انیسویں صدی عیسوی تک ان کا شہرہ رہا۔تاریخی سطح پر یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ قومیں عروج پا کر غنودگی کا شکار ہوجاتی ہیں اور اس بات کو Thesis and Tethesis سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس لحاظ سے مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو برہمن کا پرد غات کیا ہوا معاشرہ،ان کا نظریہ حیات اور ان کے نمونے خواب غفلت سے گزر رہے تھے۔ہندوستانی باشندوں کی مشکلات کی بازگشت مسلم دنیا تک سنی جا رہی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اولاً مسلمانوں نے مقامی باشندوں کو اپنے سلوک سے نہ صرف

گرویدہ کیا بلکہ انہیں زندگی سے بھی آشنا کیا اور پھر محمد بن قاسم (۷۱۲ء/۹۲ھ) سے لے کر تیمور اور آلِ تیمور (۱۵۲۶ء) تک ہندوستان پر حملہ آوری سے قطع نظر ہندوستانی سماج پر نہ صرف تمدن کی سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے بلکہ ذات پات کے نظام کو بھی کاری ضرب لگائی یعنی مقامی باشندے اسلامی نظریہ حیات سے متاثر ہوئے اور جوق در جوق حلقہء بگوش اسلام ہوگئے۔ مسلمان صوفیاء نے اس سارے عمل میں اپنے کردار اور حسن سلوک سے ہندوستان کے باشندوں میں گھر کرلیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستان کی قدامت رخصت ہونے لگی اور ایک جدید ہندوستان کی نوعیت ابھرنا شروع ہوئی۔ جس میں بود و باش سے لے کر اقدار تک متاثر ہوئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی میل جول کسی حد تک ایک اکائی میں ڈھل گئے۔ اور یہ اکائی ہندوستان قرار پائی۔ مسلم آئیڈیالوجی (Ideology) یا اسلامی نظریہ حیات کی وسعت نے بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس فضا کو تیار کرنے میں سنسکرت کے زوال ۷ کا بھی ہاتھ تھا۔ سنسکرت کو برہمن ۸ نے مقدس (دیوبانی) قرار دے کر مار دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اسلامی نظریہ حیات کے فروغ میں انتہائی دشواریاں ہوتیں۔ مسلمانوں کی آمد تک ہندوؤں کی مقدس کتابوں کی فضا مقامی بولیوں میں تیار ہوچکی تھی۔ آریاؤں کی آمد کے وقت قابل ذکر مقامی بولیاں مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، پالی، دراوڑی، قدیم راجستھانی، اردھ ماگدھی تھیں۔ سنسکرت برہمن کی فاتحانہ سرگرمیوں کی نظر ہوچکی تھی۔ مقامی سطح پر مختلف بولیاں استعمال کی جاتی تھیں جبکہ سنسکرت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس خود ساختہ ماحول میں ہندومت کے مصلح گوتم بدھ ۹ نے ہندومت کی اصلاح (Reformation) کا بیڑا اٹھایا۔ جس سے مقامی بولیوں کو اہمیت ملنا شروع ہوئی۔ نتیجتاً سنسکرت کے زوال کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔ اس بات کے شواہد انسٹوپاس کے ذریعے مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں کہ جن کے کتبے سنسکرت کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے ہی چھٹی صدی ق۔م میں ہی مرکزی زبان کی ضرورت محسوس کی جانے لگی اور اس کمی کو اردو نے پورا کیا۔ (دکنی، ۱۰ ریختہ، ہندوی، ہندوستانی، ہندی، گوجری، گجری، ۱۱ مسلمانی، ترکاماٹا، زبان اہل ہند، زبان دہلوی، اردوئے معلیٰ)۔ اردو زبان ایک ایسی زبان ہے کہ جس کا تعلق قطعی طور پر کسی خاص خطے سے نہیں جوڑا جاسکتا بلکہ

پورا ہندوستان اس کی تشکیل میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو کا مطالعہ مختلف لسانی نظریات کی روشنی میں کرتے ہیں تو ہمیں دشواری یہ پیش آتی ہے کہ تقریباً ہر جگہ اردو کا چلن کسی شکل میں باآسانی مل جاتا ہے۔ اگر ہماری تفہیم کسی خاص خطّے سے جڑی ہوتی تو ہم اردو کی علاقائی نوعیت تک محدود کر کے سوچنے لگتے ہیں اور یہاں ہماری تفہیم پر ہماری خواہش کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ تحقیقی سطح پر دیکھنا اور سوچنا ہوگا کہ آیا وہ کیا اسباب وعلل ہیں کہ جن کے سبب درج ذیل مستند نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔

۲۔ اردو سندھ سے نکلی ہے۔

۳۔ اردو پنجاب سے نکلی ہے۔

۴۔ اردو دکن سے نکلی ہے۔

۵۔ اردو کا منبع ومولد ہریانی ہے۔

۶۔ اردو کھڑی بولی سے نکلی ہے۔

۷۔ اردو لشکری زبان ہے۔ وغیرہ وغیرہ

۱۔ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔[۱۲] یہ استدلال محمد حسین آزاد کا ہے۔ آزاد نے کھڑی بولی اور بڑی بولی کے تناظر میں اردو کے مولد کو سمجھنے کی سعی کی ہے۔ اور اس کے پیچھے لسانی محرکات زیادہ ہیں۔

۲۔ اردو سندھ سے نکلی ہے۔[۱۳] سید سلمان ندوی کا استدلال ہے اور اس تفہیم میں سندھ کا باب الاسلام ہونا نمایاں ہے۔ اس نئی زبان کا استدلال مسلمان لشکریوں کا مقامی باشندوں سے اختلاط ومیل جول کے باعث ہوا۔

۳۔ اردو پنجاب سے نکلی ہے۔ اس نظریے میں حافظ محمود شیرانی[۱۴] نے غزنوی اور غوری کے حملوں کو بنیاد بناتے ہوئے وسط ایشیا کے مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے میل جول کے نتیجے میں وجود میں آنے والی زبان قرار دیا۔

۴۔ دکن میں اردو کے حوالے سے نصیرالدین ہاشمی نے قدیم مخطوطات کو بنیاد بناتے ہوئے دکن کو اردو کا مولد

قرار دیا ہے۔

۵۔ اردو ہریانی سے نکلی ہے مسعود حسین خان نے دلّی کے اطراف کھڑی بولی کو اردو کی اساس قرار دیا۔

۶۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی، جولیس بلاک بیمز، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری وغیرہ اردو کا ماخذ کھڑی بولی کو بتاتے ہیں۔[15] اور اس کے استدلال میں وہ رزمیہ نظموں کو پیش کرتے ہیں جو ہندو سورماؤں کو جوش دلانے کے لیے مسلمانوں کی دہلی سے فتح سے قبل لکھی گئی تھیں۔

۷۔ اردو لشکری زبان ہے۔[16] اس زبان کے پیچھے اردو کا پرانا نام اردوئے معلّٰی [17] ہے۔ اس استدلال میں اردو کے لغوی معنیٰ کو زیادہ دخل ہے۔

ان مذکورہ بالا نظریات کی روشنی میں یہ بات باآسانی ثابت کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان جس میں سندھ، پنجاب، شمالی ہندوستان، اور جنوبی ہندوستان شامل ہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس زبان کی تشکیل میں شریک نظر آتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات طے شدہ ہے کہ اردو پورے غیر منقسم ہندوستان کی زبان تھی اور رسم الخط کے فرق کے ساتھ تا حال ہے۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان نے فرانسیسی زبان میں کتاب لکھی جس کا ترجمہ ۱۹۱۲ء میں سید علی بلگرامی نے تمدن ہند کے نام سے کیا۔ ۱۸۶۲ء کے سروے کے مطابق اس وقت ہندوستان میں ۵۶۰ زبانیں بولی جارہی تھیں۔ جس میں کلیدی زبانوں کا ایک جدول محقق نے پیش کیا۔ ہم ذیل میں ان زبانوں کا اور ان کے بولنے والوں کی تعداد کا ایک تخمینہ درج کرتے ہیں۔[18]

زبان کا نام	بولنے والوں کی تعداد	زبان کا نام	بولنے والوں کی تعداد
ہندوستانی	آٹھ کروڑ پچیس لاکھ	گجراتی	پچانوے لاکھ
بنگالی	تین کروڑ نوے لاکھ	کنٹری	پچاس لاکھ
تلنگی	ایک کروڑ ستر لاکھ	اوریا	ستر لاکھ
پنجابی	ایک کروڑ ساٹھ لاکھ	مالیالم	چالیس لاکھ
تامل	ایک کروڑ تیس لاکھ	سندھی	تیس لاکھ
		ہندی	تیس لاکھ

اس کے مطابق اس وقت آٹھ کروڑ پچیس لاکھ اردو بولنے والے ہیں جب کہ ہندی بولنے والے صرف تیس لاکھ ہیں اور تقریباً ہندوستان کی اس وقت آبادی پچیس کروڑ ہے۔ اس کا بہت واضح مطلب یہ ہوا کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل تک پورے ہندوستان میں اردو چھائی ہوئی ہے اور خط نستعلیق میں لکھی جارہی ہے۔ یہ صورتحال تو ان نظریات اور اردو کے پھیلاؤ کی ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ہم یورپ کے لوگوں سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کریں ان کے اردو پر احسانات سے روگردانی نہیں کرسکتے۔ اردو کی پہلی قواعد لاطینی زبان میں جان شیوا کیٹلر (John Joshua Keteler) نے لکھی۔ ۱۹ بعدازاں پادری بنجمن شلزے نے ۱۷۴۱ء میں ہندوستانی (زبان اردو) کی قواعد لکھی۔ 20 جب کہ اردو میں قواعد لکھنے کا سہرا جان گلکرسٹ کے سر ہے۔ ۲۱

دوقومی نظریے کی تشکیل:

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد مغلیہ حکومت کا زوال تیزی کے ساتھ شروع ہوا مگر اس سے قبل ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی سرگرمیاں اقتدار کے حصول کے لیے کوشاں نظر آنے لگی تھیں۔ ۲۲ یہی وجہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ اقتدار میں مغلیہ حکومت سے معاہدہ کرنا پڑا کہ وہ فورٹ ولیم کے قلعے تک محدود رہے گی۔ نیز تجارت کے علاوہ اسکے اور کوئی عزائم نہیں ہیں۔ ۲۳ اورنگزیب کی وفات کے بعد ہی مغلوں کا اقتدار زوال کی نشانیوں سے جڑتا چلا گیا۔ اورنگزیب کی اولاد اقتدار کے حصول کے لیے آپس میں نبردآزما ہوگئی۔ نتیجتاً ہندوستان کے دیگر سرداروں (بلامذہب وملت) اور ہر کس وناکس بلواسطہ یا بلاواسطہ اقتدار کے حصول کے لیے یا اقتدار سے جڑنے کے لیے نت نئی سازشوں میں ملوث ہوتا چلا گیا۔ ایسے میں ہندوستان میں آخری (چوتھی) غیر ملکی تجارتی کمپنی یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا مستقبل سامنے نظر آنے لگا۔ لہٰذا مذکورہ معاہدہ قصہ پارینہ بن گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا سب سے بڑا حریف فرانسیسی کمپنی یا فرانس نظر آنے لگا۔ ۲۴ سرنگاپٹم سے انگریزوں کے اقتدار کا آغاز ہوا یعنی ۱۷۵۷ء کی پلاسی جنگ ۲۵ اور پھر ۱۷۶۳ء میں بکسر کی لڑائی ۲۶ نے مقامیوں اور غیر مقامیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اور پھر ۱۷۷۴ء تک بنگال میں ریگولیٹنگ ایکٹ (Regulating Act) ایسٹ انڈیا کمپنی نے نافذ کردیا۔ ۲۷ جس کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کو مالیانہ وصول

کرنے کے حقوق حاصل ہو گئے۔۲۸ے بنگال کے بعد میسور کے علاقے کی باری آئی ۲۹ے یہ وہ زمانہ ہے کہ جب یورپ میں فرانس ۱۷۸۹ء انقلاب سے گزر رہا تھا۔ نیز یورپ کی علمی و ادبی فضا جدیدیت (Modernization) سے آشنا ہو چکی تھی۔ جدیدیت کے زیر اثر مادی نظریات کا پھیلاؤ اور پھر یورپ کی ترقی کے لیے مادری یا قومی زبان کو ناگزیر قرار دیا جا چکا تھا۔ ایسے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں عمل دخل یورپ کے لیے بالخصوص برطانیہ کے لیے نعمت غیر مترکبہ سے کم نہ تھا۔ کیونکہ جدیدیت کے زیر اثر نظریات کے پھیلاؤ اور ان پر عمل درآمد کے لیے وسائل درکار تھے۔۳۰ے ان وسائل کی کمی کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے کما حقہ پورا کیا۔

بنگالی ریگولیٹنگ ایکٹ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے فضا ساز گار ہوتی ہی چلی گئی۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" (Divide and rule) کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے مقامیوں کی ثقافت اور زبان پر بالخصوص توجہ دینی شروع کی۔۳۱ے ہر چند کہ برطانیہ میں ثقافت اور زبان کے ایسے ادارے موجود تھے کہ جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران ہندوستان میں تقرری سے قبل فیضیاب ہوتے رہے۔ لیکن اٹھارویں صدی تک آتے آتے ایسٹ انڈیا کمپنی کا دائرہ کار بڑھتا گیا کیونکہ انگریز اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ اگر انہیں ہندوستان میں سیاسی، تجارتی، معاشی اور تبلیغی محاذوں پر کامیابی حاصل کرنا ہے تو انہیں ہندوستان کی کوئی ایسی زبان پر توجہ دینی ہوگی جو عالمگیر حیثیت رکھتی ہو۔ چنانچہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اردو زبان پر توجہ دی گئی اور فارسی کی سرکاری حیثیت کو ختم کر دیا گیا۔ اردو کی ترقی کے لیے فورٹ ولیم کالج کا قیام ۱۸۰۰ء میں عمل میں آیا۔۳۲ے انگریزوں نے جہاں اردو کو آفاقیت تک پہنچایا وہیں انہوں نے جدید ہندی کو بھی جنم دیا جو آگے چل کر اردو ہندی نزاع کا سبب بنا۔۳۳ے اٹھارویں صدی سے پہلے ہندوستان میں علاقے کی نسبت سے ہندوستانی آباد تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے آخر تک آتے آتے ہندوستان میں دو قوموں کا تصور ابھر کر سامنے آیا اور قومیت کا وجود پوری شدت کے ساتھ ہندوستان میں پھیل گیا۔ یہی خلیج بالآخر دو قومی نظریے کا بھی تصور بنی۔۳۴ے

پاک و ہند کے حوالے سے دو قومی نظریے کا مطلب مسلمان اور ہندو ہیں یعنی دو قومی نظریہ واضح طور پر مذہبی بنیادوں پر مسلمان اور ہندو کے مختلف طریقہ ہائے زندگی نیز تصور خدا اور عبادات کے طور طریقوں سے عبارت ہے۔

ابوریحان البیرونی، اب سے ایک ہزار سال پہلے جب محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا تو ہندوؤں کے متعلق اس نے اپنے خیالات اس طور قلمبند کیے۔

"ہندو دین میں ہم سے کلی مغایرت رکھتے ہیں۔ غیروں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں اور ان کو ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، ان کے قریب جانا، یا ساتھ بٹھانا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے اور جس چیز میں غیر قوم کی آگ یا پانی سے کام لیا گیا ہے، جن دو چیزوں پر ضرورت زندگی کا مدار ہے اس چیز کو ناپاک سمجھتے ہیں، مزید برآں کسی طریقے سے اصلاح حال کی صورت ہی نہیں ہے اس لیے کہ گونجس چیز طاہر سے مل کر طاہر ہوسکتی ہے لیکن ہندو کسی شخص کو جوان کی قوم سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونے کی رغبت یا ان کے دین کی طرف میلان رکھتا ہے، اپنے اندر داخل کرنے کی مطلق اجازت نہیں دیتے۔" ۳۵؎

یہی وجہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ مذہبی اعتبار سے آزادانہ زندگی نہیں گزار سکتے۔ جب یہ سوال مسلمان دانشوروں کے ذہن میں پیدا ہوا تو تقسیم کے مختلف نظریات بھی سامنے آئے۔ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے مسلم لیگ کا قیام دسمبر ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا۔ ۳۶؎ ہندوستان کی تقسیم میں مذہب کے ساتھ اردو زبان نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ تاریخی اعتبار سے ہندو زیادہ تر وہ آریائی نسل والے لوگ ہیں جو باہر سے آکر ہندوستان پر قابض ہوگئے۔ ہندوستان ان کا ملک نہ تھا بلکہ ان بھیلوں، گونڈوں کا وطن تھا جن کو انہوں نے پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف مار بھگایا۔ ان دراوڑی قوموں کا وطن تھا جن کو انہوں نے جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ ۳۷؎ آریاؤں نے اپنی ذہانت وفطانت کے باعث مقامیوں پر غلبہ پایا اور پھر اس غلبہ کو انہوں نے قانونی شکل دے دی۔ ۳۸؎ جب مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو اس وقت ہندوستان میں ذات پات کے نظام کے ذریعے عام انسانوں کا استحصال جاری تھا۔ مسلمان فاتحوں نے مقامی لوگوں کو کسی حد تک آزادی دلائی اور اللہ کی حاکمیت کے حوالے سے ذات پات کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی کہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ ۳۹؎ کئی صدیوں تک مسلمانوں کی حکمرانی رہی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب کوئی قوم عروج پر پہنچتی ہے، تو غنودگی کا شکار ہو جاتی ہے اور وہیں سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

عالمگیر اول کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوگیا۔[۴۰] اس کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال تیزی کے ساتھ شروع ہوا۔[۴۱] اقتدار کے حصول کی جنگ نے بھائیوں کو دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء ایسٹ انڈیا کمپنی بھی صحیح معنوں میں عروج کی طرف گامزن رہی۔[۴۲] ۱۸۵۷ء کے بعد جو سب سے بڑی دستوری تبدیلی ہوئی وہ یہ تھی کہ اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ (۱۸۵۸ء) کو منتقل ہوگیا۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کا مکمل اختیار اور اس کے لیے ذمہ داری پہلی مرتبہ برطانوی پارلیمنٹ کو تفویض کی گئی۔ برطانوی ہندوستانی سلطنت سرکاری طور پر قائم ہوگئی۔[۴۳]

یہ مختصر صورتحال ہر قابل ذکر تاریخ میں پڑھی جاسکتی ہے اور اسے پڑھ کر بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان جو کبھی حاکم تھے اب محکوم ہو کر رہ گئے ہیں اور ہر محکوم قوم کی اچھائی بھی برائی سے تعبیر ہونے لگتی ہے۔ جب کہ ہندوستان کا منظر نامہ تو اس محرومی میں مزید اضافے کا سبب یوں بھی تھا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے اقتدار حاصل کیا تھا اور انگریزوں نے مسلمانوں سے۔ تو یہ بالکل فطری بات تھی کہ ہندو انگریزوں کے لیے اور انگریز ہندوؤں کے لیے قابل بھروسہ ہو جائیں۔ اب حکومت کی نئی حکمت عملی جن اصولوں کے تحت مرتب کی گئی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ذیل کے دو بیانات اہمیت کے حامل ہیں۔ گورنر جنرل لارڈ النبرا نے کہا:

"میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھ نہیں بند کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے، اس لیے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرفدار بنائیں۔"[۴۴]

ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر نے لکھا:

"مسلمانان ہندوستان، اب اور اس سے بہت عرصہ پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہے ہیں اپنے لیے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔"[۴۵]

ان تمام شواہد اور حقائق کو مدنظر رکھا جائے تو ۱۸۶۷ء میں بنارس میں بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال آنا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو موقوف کرادیا جائے اور بجائے

اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیونا گری میں لکھی جائے۔ اس موقع پر سر سید احمد خان کا یہ کہنا بالکل صحیح تھا کہ "جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کو بطور ایک قوم ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"[۴۶]

سر سید احمد خان کا یہ بیان ہے کہ:

"انہی دنوں میں، جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔" آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشن گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشن گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"[۴۷]

ہر چند کہ سر سید کا یہ بیان زبان کے حوالے سے ہے لیکن اسباب مذکورہ تاریخی حقائق تھے۔ اور ۱۸۷۱ء میں لیفٹیننٹ گورنر کیمبل (George Camble) کا واضح طور پر ہندی (دیونا گری) کی طرفداری کرنا اس بات کا اعلان تھا کہ انگریز ہندوؤں کے ساتھ ہیں۔ ۷ نومبر ۱۸۷۱ء میں بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر جارج کیمبل (G.Camble) نے مظفر پور کے سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر سید امداد علی نے ہندوستانی میں تقریر کی۔ جب کہ ڈاکٹر فیلن (Fallon) اور جارج کیمبل (G.Camble) نے انگریزی زبان میں تقریر کی۔[۴۸] اس موقع پر کیمبل نے پہلے انجمن بہار کی خدمات کو سراہا پھر اس کے بعد انگریزی زبان کے فوائد گنوانے کے ساتھ ساتھ مقامی بولیوں کی افادیت اور اہمیت کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اردو زبان کے خلاف زہر آلود تقریر کی۔ چند ہی روز بعد ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو مسٹر کیمبل نے اردو کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے خارج کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب حکم نامہ جاری کر دیا۔[۴۹]

اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہوئے جدید ہندی کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ اردو رسم الخط۵۰ کے ذریعے دی جانے والی تعلیم کسی نہ کسی شکل میں غیر مسلموں کے لیے بھی حق سبحانہٗ کی حقانیت پر غور کرنے کا سبب بن سکتا تھا اور پیغام اسلام کی لاشعوری طور پر ترویج ممکن ہو سکتی تھی۔ ان نکات کے حوالے سے اگر ہم غور کریں تو دوقومی نظریہ کی تشکیل بالکل فطری تھی۔ اس بحث کو آگے بڑھانے سے قبل دوقومی نظریہ کے حوالے سے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بسنے والے مسلمانوں کی آبادی کا گوشوارہ بھی دیکھ لیا جائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۳٫۴ فیصد ہے۵۱۔ بنگلہ دیش میں تقریباً ۸۹٫۵۲ فیصد ہے۵۲ اور پاکستان میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۹۶٫۲۸ فیصد ہے۵۳۔ یہ گوشوارہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آج اچھے خاصے دانشور دوقومی نظریہ پر بلا سوچے سمجھے اور بغیر سیاق وسباق کے تبصرہ کرتے ہیں کہ ۱۹۷۱ء کے بعد یعنی بنگلہ دیش کے قیام کے بعد دوقومی نظریہ دم توڑ گیا۔ اور اس پر مستزاد یوں بھی تبصرہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کو مدّنظر رکھا جائے تو دوقومی نظریہ کی افادیت معدوم ہوگئی۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نظریاتی مملکت میں ہندوستان کے ہر شہری کو پاکستان میں (National) نیشنل تصور کیا جاتا ہے یا اسے قومیت (Nationality) دے دی جاتی ہے۔ اس ذیل میں اسرائیل کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ اسرائیل میں تمام دنیا سے یہودی آ کر قومیت حاصل کر سکتے ہیں اور کی ہے۔ شاید یہ تمام باتیں کہنے کی حد تک تو ٹھیک ہیں لیکن پاکستان کے معروضی حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تمام اعتراضات منذوب کی بڑ سے زیادہ نظر نہیں آتے۔ دوقومی نظریہ کی تشکیل یا دوقومی نظریہ پر سب سے وقیع تبصرہ قائداعظم محمد علی جناح کے قیام پاکستان کے بعد پہلی پریس کانفرنس (Press Conference) ہے کہ جب انہوں نے بانی پاکستان کے حوالے سے خطبہ صدارت پیش کیا تو واضح طور پر قائداعظم نے فرمایا کہ:

> "قیام پاکستان کا اصل سبب ہندوؤں کا تعصب ہے اگر ہندو مذہبی رواداری سے کام لیتے اور مسلمانوں کو واقعی ہندوستانی تسلیم کرتے اور جیسا کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں نے آریاؤں کو تسلیم کیا تھا تو یقیناً ہندوستان کی تقسیم عمل میں نہ آتی۔"۵۴

یہ بات بالکل اسی طرح کی ہے کہ قدیم زمانے میں زندگی کے بہتر آثار کے سبب دریاؤں کے کنارے شہر آباد ہوتے تھے لیکن جدید دنیا میں زندگی گزارنے کے بہترین آثار ولوازمات زندگی گزارنے کے لوازمات کہے

جاسکتے ہیں۔جس دنیا میں ہم جی رہے ہیں یقیناً اس دنیا کی سرحدیں ممالک کہلاتی ہیں اوران ممالک میں آئینی نوعیت پائی جاتی ہے۔یہی سبب ہے کہ مسلم آئیڈیالوجی (Muslim Ideology) بھی مختلف ممالک کے زیر اثر نظر آتی ہے۔اسلامی فکر کے مطابق زمین اللہ کی ہے اور جہاں بھی مسلمان رہے وہ اس کا وطن یا ملک ہوسکتا ہے۔ اسلام قوموں کے درمیان نہ تو رنگ ونسل کی جداگانہ صورتوں کے تحت خط امتیاز قائم کرتا ہے نہ زبان، علاقہ یا ثقافت کے نام پر انسانوں کی تقسیم کرتا ہے۔۵۵ وہ انسانی زندگی کی فطری وابستگیوں اور جبلی تقاضوں کی نفی کیے بغیر وحدت انسانی کی دائمی اقدار کو اولیت دیتا ہے۔یعنی اسلام تمام مادی حدود وقیود کو توڑ کر عقیدہ توحید وآخرت کے تمام حلقہ بگوشوں کو انما المومنون اخوۃ کے لازوال رشتہ میں منسلک کرتا ہے۔۵۶ مذکورہ صورتحال تو اس وقت پیش آتی کہ جب دنیاوی آئین دم توڑ جاتے اور مسلمان اللہ کی زمین پر اس کے احکامات کی باآسانی بجاآوری کرنے میں کامیاب ہوتا یہی وجہ ہے کہ

سارے جہاں سے اچھا، ہندوستان ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

۵۷

یہ شعر کہنے والا شاعر (علامہ اقبال) الہٰ آباد میں تصور پاکستان پیش کرنے پر مجبور ہوا۔مسلم لیگ کے الہٰ آباد کے اجلاس سے قبل مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان کے لیے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر تحریک خلافت (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء) ہندوؤں کے ساتھ افہام وتفہیم اور ہندوستان کو بچانے کے لیے سرفروشی اور جانبازی کی نمایاں تاریخ رقم کی۔۵۸ اس کے باوجود ہندوؤں نے ہندوستان کو تقسیم کرنے کے لیے مسلمانوں کو کنارے لگانے کی کوششیں جاری رکھیں۔جس کی مثالیں اردو اور ہندی تنازعات، گاندھی اور مولوی عبدالحق کا ہندی اردو تنازع پر بحث نمایاں ہے۔۵۹ ان تمام حقائق کی روشنی میں ایک الگ ملک کا مطالبہ ناگزیر ہوگیا اور علامہ اقبال نے تصور پاکستان پیش کردیا۔

I would like to see the Punjab, North-west Frontier Province, Sind and Baluchistan amalgamated into a single state - self government within the British Empire,

or without the British Empire, the formation of a Consolidation North-West Indian Muslim State appears to me to be the final destiny of the Muslims, at least of North West India."(60)

یہی وہ نشان منزل تھا کہ جس کی وجہ سے پاکستان کا قیام شرمندۂ تعبیر ہوسکا اور دوقومی نظریہ کو اساسی حیثیت حاصل ہوئی۔

اس مقالے کے باب اوّل میں اُردو کے سیاسی منظرنامے میں صحافت کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم میں انیسویں اور بیسویں صدی میں برعظیم، پاک و ہند کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں اُردو شعراء کے سیاسی کردار پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں تاریخی کتب کا جامع احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن شعراء اور ادیبوں نے دوقومی نظریہ، نظریہ وطنیت، متحدہ قومیت اور ہندی قومیت کو واضح کیا اس کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم میں قیام پاکستان کی ضرورت واہمیت کو قرآنی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے ساتھ دیگر اقوام کے نظریہ قومیت کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

باب چہارم میں ان رکاوٹوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی وجہ سے پاکستان میں اُردو زبان کا نفاذ سرکاری سطح پر مؤثر طور پر نہیں ہوسکا اور قومی زبان اپنا اصل مقام حاصل نہیں کر پائی۔

باب پنجم میں قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کی ترقی و فروغ کے حوالے سے جو اہم اور بنیادی ادارے تشکیل پذیر ہوئے ان کی مجموعی کارکردگی کو بیان کیا گیا ہے۔

مقالے کا باب ششم تمام ابواب کے نتائج کا تجزیاتی ماحصل ہے اُردو زبان نظریاتی مملکت کی ترقی میں کیا کردار ادا کرسکتی ہے اور دوقومی نظریہ کی حقیقی تفہیم اور وضاحت کے بغیر قومی نصب العین اور احداف کا شعور ممکن نہیں ہے۔

مقالے کی تکمیل میں کائناتِ عالم کے حضور سجدہ ریز ہوں جس نے اپنی نبی ﷺ کے صدقے مجھے ہمت واستقامت دی اور اپنے والدین کی شکرگذار ہوں جنھوں نے مجھے خدا اور رسول ﷺ سے متعارف کرایا اور ان کی دعائیں شامل

حال رہیں۔
زیرِ نظر مقالے کی تیاری کے لئے مستند کتابیں، رسائل، جرائد، اہم شخصیات کے انٹرویو، پمفلٹ اور دیگر متعلقہ مواد سے استفادہ کیا گیا ہے۔ محققہ نے ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، جامعہ کراچی، اسٹیٹ بینک لائبریری، انجمنِ ترقی اُردو (تحقیقی لائبریری)، غالب لائبریری، بیدل لائبریری، لیاقت نیشنل لائبریری، تیموریہ لائبریری، سرسید یونیورسٹی لائبریری، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس لائبریری اور اپنے نگراں کے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کیا ہے۔
میں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں کہ ان لائبریریوں کے تعاون پر شکریہ ادا کروں۔
مقالے کے مکمل کرنے میں کئی مشکلات درپیش رہیں۔ چیدہ چیدہ شخصیات کا انتخاب اور ان سے ملاقات کرنا اور متعلقہ کتب کے حصول کے بعد ترتیب و تدوین بہر حال صبر آزما مرحلہ تھا۔ اس حوالے سے میں سپاس گزار ہوں جناب حسن عسکری فاطمی، صدرِ شعبہ، ابلاغ عامہ، وفاقی اُردو یونیورسٹی اور جناب ڈاکٹر ذوالقرنین احمد، استاد شعبہ اُردو، جامعہ کراچی نے وقتاً فوقتاً میری راہنمائی کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ علاوہ ازیں معروف محقق جناب ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب نے جن قیمتی مشوروں سے نوازا اس پر ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔
جناب محمد انعام باری، جناب نیر عباس زیدی اور محترمہ فرحت فاطمہ، جناب رفیع الدین ہاشمی کی بھی تہہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے موضوع کی مناسبت سے پزیرائی کی۔
اس مقالے کے کمپوزنگ کے لئے میں کلیہ فنون کے ریسرچ فیسیلیٹی سینٹر کی مشکور ہوں جنھوں نے بڑی خوش دلی سے اس کٹھن مرحلے کو آسان کر دیا۔
مقالے کی تکمیل میں، میں اپنی ہمشیرہ ڈاکٹر عابدہ پروین کا خاص طور پر ذکر کروں گی جنھوں نے کبھی پیار سے اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کے مجھے مقالہ مکمل کرنے کی جانب راغب کیا۔ یہی طرزِ عمل میرے بھائی محمد الیاس خان اور بہن سعیدہ پروین نے بھی اختیار کیا ان کے لئے سوائے دعاؤں کے کچھ نہیں کر سکتی۔
میں سب سے زیادہ اپنے نگراں تحقیق جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد شمس الدین کی مشکور ہوں کہ جنھوں نے اپنی تدریسی اور انتظامی مصروفیات کے باوجود میرے لئے وقت نکالنے کی کوشش کی اور بعض الجھنوں سے نکالنے کی سعی کی۔

انھوں نے بیش بہا مفید مشورے دینے سے کبھی گریزاں نہیں کیا جو میرے لئے قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔
اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ جس مقصد کے لئے یہ علمی اور تحقیقی کوشش کی گئی ہے اس سے ہمکنار کرے۔
میرے قلم کو مزید طاقت دے اور اسے مستقبل کے محققین کے لئے مزید تحقیق کرنے کی راہیں استوار کرے۔
(آمین)

بابِ اوّل

موضوع کا تعارف

باب اول

موضوع کا تعارف

برعظیم، پاک و ہند میں سب سے بڑا سیاسی اختلاف ان دونوں بڑی اور ایک دوسرے سے مختلف قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا۔ یہ اختلاف اس وقت ہوا جب اقتدار کی مساویانہ تقسیم کا سوال پیدا ہوا اور نوآبادیاتی مرکزی حکومت نے اقتدار کو برصغیر کے باشندوں کے درمیان مغربی جمہوری طرز پر ایک اپنے آئینی نظام کے تحت نافذ کیا۔ اس نظام سے دونوں بڑی قوتوں کو سیاسی اطمینان نہیں تھا اور اپنی اپنی جگہ پر وہ اقوام اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ منصفانہ تقسیم میں اپنے حقوق سے محروم رہ جائیں گے۔ کیونکہ اپنے نظریہ میں وہ اپنے متعلقہ فکری سیاسی نظام پر کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اپنے فکری نظاموں کے مطابق اپنے اپنے نظریات کو پروان چڑھایا۔ یہ بات برصغیر کی سیاسی تاریخ کے ارتقاء سے ثابت ہے۔ اپنے اپنے طور پر وہ اپنا سیاسی نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ غیر ملکی قابضین اقتدار کے خلاف جدوجہد آزادی کے لئے انہوں نے باہمی اتحاد پر اپنی جدوجہد کو استوار کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس پر انہیں ناکامی ہوئی اور بالآخر انکے راستے علیحدہ ہو گئے اور تقسیم ناگزیر ہوگئی۔ انکی سیاسی جماعتوں نے اور انکے تحت سیاسی نظریات نے اپنے اداروں کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں کے نظریہ آزادی کی ترویج کے لئے آل انڈیا نیشنل کانگریس اور مسلمانوں کے نظریہ کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنا سیاسی نظام فکر تیار کیا۔ اس کے تحت دوقومی نظریہ کو جن اداروں نے فروغ دیا۔ ان میں اردو کے اداروں کا اہم کردار اس کی نظریاتی، سیاسی قوت کو محسوس کرتے ہوئے ہندوؤں نے اس کی شدید مخالفت کی اور اردو کی جگہ ہندی زبان کو اپنی متبادل بنیاد قرار دیا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس کو عبوری حکومت بنانے کا موقع ملا تو ہندوؤں نے ہندی کو ہندوستان کی واحد سرکاری ہندو زبان کے طور پر نافذ کر دیا اور یہاں سے دونوں کے درمیان زبان کا فرق دونوں قوموں کے لیے ایک امتیاز بن گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنی زبان اور اسکے اداروں سے گہری وابستگی نصب العین کی شکل اختیار کر گئی اور انہوں نے اردو کے اداروں کو ترقی دینا شروع کی۔

ذریعہ ابلاغ اور اردو:

اس نظریہ کی ترویج کے لیے زبان اور اس سے متعلق اداروں کا فروغ اہمیت کا حامل رہا ہے اور اس کی تبلیغ کے لیے ذرائع ابلاغ کی اعلیٰ کارکردگی ضروری ہے۔ چنانچہ اردو ذرائع ابلاغ کا ارتقائی مطالعہ اپنے دلائل کے اس باب میں مدد فراہم کرتا ہے۔

اردو اخبارات کا کردار:

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصہ تک اردو صحافت کا لب و لہجہ مصلحت وقت کے مطابق تھا۔ اس وقت کے اخبارات نے مغربی علوم و فنون پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ جب حکمران طبقہ کے طرز عمل میں تبدیلی آنے لگی تو ان اخبارات نے بھی ملکی مسائل میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ان میں وہ اخبارات بھی شامل تھے جن کا اجراء ۱۸۵۷ء سے پہلے ہوا تھا۔ ان اخبارات کا مقصد حکومتی سرپرستی میں چلنے والے اداروں، نیم سیاسی اور ہمسایہ اسلامی ممالک کی خبروں کی اشاعت کرنا تھا۔ جب ہندو اور مسلمانوں میں نظریاتی اختلاف بڑھا تو یہ اخبارات بھی اپنے سیاسی نظریہ و فکر کے اعتبار سے دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے درمیان تقسیم ہو گئے۔ اس فکر کا آغاز سر سید احمد خان کی کوششوں سے ہوا۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت زار کو بہتر بنانے کے لیے سر سید احمد خان نے عملی تحریک کا آغاز کیا اور اس مقصد کے لیے انہوں نے اردو صحافت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اردو صحافت میں سر سید احمد خان کا نام نمایاں اہمیت اور انفرادیت رکھتا ہے۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں "سائنٹی فک سوسائٹی" قائم کی۔ اسی سال ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا اور سوسائٹی انکے ساتھ علیگڑھ منتقل ہو گئی۔ اس سوسائٹی کے مقاصد کی تکمیل اور مسلمانوں میں علوم و فنون جدیدہ کو ترقی دینے کے لیے انہوں نے "اخبار سائنٹی فک سوسائٹی" علیگڑھ سے جاری کیا۔ بعد میں اس کا نام "علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ہو گیا۔ ۲۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو اس کا اجراء ہوا۔[1] اس میں سر سید احمد خان کا آخری اداریہ اردو صحافت کی حمایت میں ہے۔[2] اس میں تعلیم اور سائنس، سیاست، معیشت، معاشرت، جمہوریت، اخلاقیات، مذہب، صنعت و حرفت، ملکی قوانین، بین الاقوامی حالات، اردو زبان اور تہذیبی مسائل جیسے موضوعات پر

ہندوستانیوں کے ذہن کو سوچنے پر راغب کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی کے تمام شعبوں میں حرکت و عمل کی روح سرایت کر گئی اور سیاست و معاشرت میں جدید تصورات عام ہوئے۔ ساتھ ہی اس نے اردو صحافت میں بھی ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ۳

بیسویں صدی میں اسکے اثرات الہلال اور ہمدرد میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ دونوں کی صحافت کا مزاج بلند ہمتی اور قومی ہمدردی کا آئینہ ہے۔ بعد میں حالات کے فرق کے ساتھ اظہار خیال میں جوش اور ہیجان کا اضافہ فطری امر تھا۔ ۴ سر سید احمد خان نے اخبار "سائنٹی فک سوسائٹی" یا "علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا جو اجراء کیا تو سیاسی اور تہذیبی نقطہ نظر محض مسلمانوں تک مخصوص نہیں تھا بلکہ ہندوستانیوں کے لیے تھا۔ لیکن جب اردو ہندی کا لسانی تنازعہ واقع ہوا ۵ تو اس میں کھل کر ہندوؤں کا مطمع نظر سامنے آ گیا۔ چنانچہ سر سید احمد خان نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وقت ان دونوں قوموں ہندو مسلمانوں کی درمیانی خلیج کو اور زیادہ وسیع کر دے گا۔ ۶ سر سید احمد خان کی تحریریں، تقریریں اور ان کا کام یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ایک قوم ہونے پر پکا عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے وقت کی مصلحت کے تحت جو تعلیمی، مذہبی اور معاشرتی تحریک شروع کی اس کا خطاب خاص طور پر مسلمانوں سے تھا۔ پھر انہوں نے یہ ضروری خیال کیا کہ قوم کے انداز فکر کو نئے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس میں خبریں نہیں، ایسے مضامین چھپتے تھے جن سے قوم کا انداز فکر بدلنا مقصود تھا۔ ۷ مقصد کے اعتبار سے کہیں کہیں "تہذیب الاخلاق" اور "گزٹ" کی سرحدیں ملتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ ۸

تہذیب الاخلاق میں مذہبی خیالات و نظریات پیش کئے جاتے تھے۔ وہ پہلے پہل عام مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھے لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں ان کا اثر پھیلتا گیا۔ ۹ لوگ اس کی جانب متوجہ ہوئے اور اپنے طور پر بھی کام شروع کیا۔ مدارس اسلامیہ قائم ہوئے۔ جدید علوم سے شغف پیدا ہوا، مسلمان اپنے اکابر و اسلاف کے کارناموں سے واقف ہوئے، ترقی کا جذبہ بیدار رہا۔ مذہب کے بارے میں پیدا کردہ شکوک و شبہات کا خاتمہ ہوا۔ مذہبی منافرتوں کا خاتمہ، خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ اپنی مدد آپ کا جذبہ بیدار رہا۔ مسلمانوں میں اسلامی اخوت اور اسلامی قومیت کا احساس پیدا ہوا۔ ۱۰ بحیثیت مجموعی مسلمانوں میں قومی شعور اور سیاسی

بیداری پیدا کرنے میں ان کا خاص حصہ ہے۔ان کے معاصر اخبارات نے ان کے زیر اثر قومی اور سیاسی رجحانات کو پیش کرنا شروع کیا۔ان میں ایک "آگرہ اخبار" تھا۔یہ ۱۸۶۸ء میں جاری ہوا۔اس کے مدیر بوستان علی کا اصل مقصد ہندوستان میں آزادی کا پھیلانا تھا۔۱۱ ۱۸۸۳ء میں "ہندوستانی" کا لکھنؤ سے اجراء ہوا۔حالات حاضرہ اور سیاسی مسائل پر سنجیدہ اور متین انداز میں تبصرہ کرتا تھا۔اس کے مدیر نے اسے سیاسی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔یہ صوبہ میں کانگریس کا ترجمان تھا۔"ہندوستانی" کی طرح کانگریس کے حامی اخبارات میں زیادہ مقبول اور اہم اخبار "اودھ پنچ" تھا۔۱۲ یہ جنوری ۱۸۷۷ء میں اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردعمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔۱۳ منشی سجاد حسین کی ادارت میں کم وبیش ساٹھ سال تک نکلتا رہا۔منشی سجاد حسین کانگریس کے دیرینہ رکن تھے۔ اس لئے یہ اخبار ہندو مسلم اتحاد کا حامی اور کانگریس کا موئد تھا، حب الوطنی کا مداح تھا۔ اسوقت "ہندوستانی" کانگریس کی حمایت میں جو کام کر رہا تھا "اودھ پنچ" اس پر سبقت لے گیا۔ جب کہ سرسید احمد خان کی تحریک سے اہل اسلام کانگریس سے دور ہو گئے تھے تو اس وقت "اودھ پنچ" کے علاوہ کوئی اسلامی اخبار کانگریس کا حامی نہیں تھا۔۱۴ "ہندوستانی"، "ایڈووکیٹ"، "اودھ پنچ" ہی کانگریس کے بڑے حامی اور علیگڑھ تحریک کے اتنے ہی مخالف تھے۔ "رفیق ہند" لاہور سے ۵ جنوری ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا۔اس کے مالک و مدیر محرم علی چشتی تھے۔۱۵ اس کا مقصد محض انگریزی اخبارات کی طرز پر آزادی سے اپنے حقوق کا اظہار کرنا تھا۔یہ خاص طور پر مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار تھا۔ یہ ہفت روزہ تھا۔۱۸۸۸ء تک سرسید احمد خان کی تحریک کا موئد رہا، لیکن سرسید احمد خان کے مذہبی نظریات سے اختلاف کے بعد ان کا مخالف ہو گیا۔ یہ اخبار ۱۸۰۴ء میں بند ہو گیا۔۱۶ حیدرآباد دکن سے ۱۸۸۷ء میں "مشیر دکن" کا اجراء ہوا۔اس کا نقطہ نظر بڑا معتدل تھا اور بلحاظ مذہب وملت، ملک اور قوم کا ترجمان تھا۔اس کے ادارتی مضامین میں ملک کی تعلیمی حالت، معاشرتی حالت اور اس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ حکومتی عہدیداروں اور ان کی بدعنوانیوں پر اظہار کیا جاتا تھا مثلاً اس کے بعض اداریوں کے عنوانات ایسے تھے۔ "آزادی"، "مسلمان اور نیشنل کانگریس"، "اعلیٰ عہدیداروں کا الاونس"، "پولیٹیکل گھنگھور گھٹا" وغیرہ۔۱۸

انیسویں صدی کے نصف آخر میں "پیسہ اخبار" زیادہ جدید رجحانات کا علمبردار تھا۔ اسے اس وقت اردو صحافت میں نمایاں اہمیت حاصل رہی۔ اس کا اجراء ۱۸۸۷ء میں فیروز والا (گجرانوالہ) سے ہوا۔ اس کے مدیر مولوی محبوب عالم ابتداء میں کانگریس کے زبردست حامی تھے لیکن جب کانگریس میں ہندوؤں کا غلبہ دیکھا اور ان کے ہاتھوں مسلمانوں کے حقوق کی پامالی کا اندازہ ہوا تو کانگریس کے مقاصد سے قطع تعلق کر کے مسلمانوں کی ترجمانی اور حمایت کو اپنا شعار بنالیا۔ ۱۸ ویسے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ یہ اسلامی اخبار تھا۔ مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار تھا۔ ان میں تعلیم کی اشاعت کے لیے کوشاں رہا۔ اسلامی تحریکات کا حامی تھا اور سیاست میں اعتدال پسند تھا۔ ۱۹ اسی کے انداز اور طریقہ کا حامل ایک اور اخبار "وکیل" امرتسر سے شیخ غلام محمد کی ادارت میں نکلتا تھا۔ مسلمانوں کے حقوق اور اسلامی سیاست کی ترجمانی میں اس کو انفرادیت حاصل رہی۔ اس اخبار سے مولانا عبدالکلام آزاد، مولانا عبداللہ العمادی جیسی شخصیات وابستہ رہیں۔ ۲۰

"اتحاد" مدراس سے انجمن اسلامیہ کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی قومی اور سیاسی تحریکوں سے وابستہ تھا۔ اس نام کا ایک اخبار عبدالحلیم شرر بھی نکالتے تھے۔ اس کا خاص مقصد ہندو مسلمانوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کرنا تھا۔ عبدالحلیم شرر نے "مہذب" بھی لکھنؤ سے اگست ۱۸۹۰ء میں جاری کیا۔ ۲۱ انہوں نے پہلے شمارے میں اپنے اغراض ومقاصد کے ضمن میں جو کچھ تحریر کیا تھا وہ انکی پالیسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تین اصول وضع کیے تھے۔ وہ "پالیٹکس"، "سوسائٹی" اور "لٹریچر" تھے۔ ۲۲

سیاسی اعتبار سے شرر سرسید احمد خان اور علیگڑھ تحریک کے حامی نہیں تھے لیکن ملکی سیاست کے حوالے سے ان کی پالیسی سرسید احمد خان سے مماثلت رکھتی تھی وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمان کانگریس سے دور رہیں۔ کانگریس کے قیام کو انہوں نے ہندو مسلم تنازعہ کی ابتدا کا سبب قرار دیا۔ ۲۳ کانگریس اور اس کے قیام کے مقاصد پر انہوں نے بارہا تنقید کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ آریا سماج سبھا بھی ان کی نکتہ چینی کا نشانہ بنی۔ ان کے خیال میں متحدہ قومیت کا تصور ناممکن تھا۔ ۲۳ اگست ۱۸۹۰ء کے شمارہ میں انہوں نے مسلمانوں کو علیحدہ قوم قرار دیا۔ انھوں نے یہ خیال بھی پیش کیا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں اتحاد اور اتفاق سے نہیں رہ سکتیں۔ انہوں نے اس کا یہی حل تجویز کیا کہ ہندوستان کے اضلاع تو ہندو اور مسلمان باہم تقسیم کر لیں اور اپنی اپنی آبادیاں

علیحدہ کرلیں۔ اس لئے کہ ہندو مسلمانوں کے مذہبی تہواروں پر فساد برپا کرتے ہیں اور مسلمان بھی اس صورتحال سے عاجز آچکے ہیں۔۲۴ فی الحقیقت یہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں سیاسی مسئلہ کا پہلا حل تجویز کیا گیا۔ "مہذب" کو دراصل "علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا نقش ثانی قرار دیا جاسکتا ہے۔۲۵

بیسویں صدی کی ابتدا تک اخبارات کی صحافت میں "انسٹیٹیوٹ گزٹ"، "تہذیب الاخلاق"، "اودھ اخبار"، "اودھ پنچ" اور "پیسہ اخبار" جاری رہے اور اپنی معاصر صحافت کو خاصا متاثر کرتے رہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جو اخبارات جاری ہوئے ان میں "ہمدم" اور "اتحاد" مسلمانوں کی علیحدہ سیاست کے ترجمان تھے اور باقی اخبار لکھنؤ، آزاد، کانپور متحدہ قومیت کے علمبردار اور سیاست میں اسی رجحان کو پیش کرتے تھے۔

ابتدائی دور کا زیادہ اہم رسالہ "اردوئے معلیٰ" تھا جسے حسرت موہانی نکالتے تھے۔ اسکے اجراء کے وقت حسرت، تلک، آربندو گھوش اور بپن چندر پال کی سیاست کے حامی تھے اور انکی شخصیت اور نظریات سے متاثر ہوکر ان کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں میں شریک رہے۔۲۶ اسکے مضامین اور شذرات میں حسرت نے ہمیشہ غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنے نفرت انگیز خیالات پیش کئے۔ کامل آزادی کے علمبردار تھے اور ہر قیمت پر آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ ابتداً کانگریس کی تائید کرتے رہے لیکن بہت جلد اس سے بددل ہوگئے۔۲۷ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ احمد آباد یکم جنوری ۱۹۲۲ء کے خطبہ صدارت میں "کامل آزادی" اور "ہندوستانیوں کی متوازی حکومت" کا مطالبہ کیا۔۲۸ اس کے بعد مسلمانوں کی سیاست کے اہم کارکن بن کر قلم اور عمل کے ذریعہ جدوجہد کرتے رہے۔۲۹ تحریک پاکستان کے دنوں میں پاکستان کے حامی رہے۔ لیکن پاکستان "ڈومینین" کے بجائے پاکستان جمہوریت کو چاہتے تھے۔ "اردوئے معلیٰ" میں ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل بھی پیش کیا۔۳۰

بیسویں صدی کی صحافت کا مزاج سیاست تھا۔ متعدد سیاسی تحریکوں اور رونما ہونے والے واقعات کے ضمن میں اخبارات سیاسی ماحول کے تقاضوں سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر اخبار کا اپنا سیاسی نقطہ نظر ہوتا تھا۔ سیاست کی طرح سے صحافت بھی اب دو مختلف راہوں پر گامزن تھی۔ ایک متحدہ قومیت کے نظریہ کے تحت اور دوسری علیحدہ مسلم قومیت کے تصور کے ساتھ اس دور کی مسلم صحافت میں وقت کی سیاسی ہلچل اور تحریکات کی شدت بخوبی ظاہر ہوتی رہی۔ اخبارات نے اپنے دور کے سیاسی ماحول کو ایک مثالی حد تک متاثر کیا۔ ان کا یہ انداز

تقسیم ہند تک مستقل اور روز افزوں رہا۔ ایسے اخبارات میں زمیندار، الہلال اور ہمدرد دور اوّل سے ہی تعلق رکھتے تھے۔

"زمیندار" کا اجراء ۱۹۰۳ء میں ہوا۔ "زمیندار" کو پہلے پہل ظفر علی خان کے والد سراج الدین احمد خان لاہور سے نکالتے تھے۔ اس کا مقصد اس وقت یہ تھا کہ زمینداروں، کاشتکاروں، کسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کیا جائے۔ سراج الدین احمد خان کے انتقال کے بعد ظفر علی خان ۳۱ نے ۱۹۰۹ء میں اس کی ادارت سنبھالی۔ ۳۲ بہت جلد "زمیندار" مسلمانوں کے جذبات واحساسات کا ترجمان بن گیا۔ پورے برصغیر میں یہی اردو اخبار مسلمانوں میں مقبول تھا۔ ۳۳ یہ پہلی بار بند ہوا تو پھر ۱۹۲۱ء میں اس کا دوبارہ احیاء ہوا۔ یہ اخبار ۱۹۳۷ء تک قوم پرست اور کانگریسی نقطہ نظر کا حامل رہا۔ اس کا خیال تھا کہ کانگریس ملک کی متحدہ جماعت ہے۔ اس کے زیر سایہ ملکی آزادی کے لئے جدو جہد ہوسکتی ہے۔ مسلمانوں کی قومی جماعتیں بھی اپنی جگہ درست ہیں۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرسکیں گی۔ حصول آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ اس مرحلہ پر اس نے مسلمانوں کی اس مہم کی مخالفت کی جو انہوں نے تصفیہ حقوق کے لئے شروع کر رکھی تھی۔ سائمن کمیشن کے مقاطعہ میں زمیندار نے کانگریس کا ساتھ دیا۔ نہرو رپورٹ کی تائید وحمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پنجاب کے مسلمانوں کی تحریک ۵۶ فیصدی کا مخالف رہا۔ جب گاندھی نے "نہرو رپورٹ" منوانے کے لیے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو "زمیندار" اس میں شریک رہا۔ ہر اعتبار سے "زمیندار" کی حکمت عملی اس وقت تک "قوم پرستانہ" اور کانگریسی رہی۔ چنانچہ اسے پہلے جیسی مقبولیت حاصل نہ رہی تھی۔ لیکن بعض مواقع ایسے بھی آگئے جب اس نے اس حکمت عملی سے تجاوز کیا۔ مثلاً جب "شدھی" اور "سنگھٹن" کا زور ہوا تو زمیندار نے "تنظیم" اور "تبلیغ" کی تحریکوں کو آگے بڑھایا۔ ۱۹۳۷ء سے زمیندار مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگا۔ ہندو مسلم فسادات کے دوران مسلمانوں کے حق میں پے درپے مضامین ایسے شائع کیے کہ چند مرتبہ اخبار ضبط بھی کرلیا گیا۔ ۳۴ تحریک پاکستان کے دوران اس نے اس تحریک کو مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ زمیندار نے اپنے دور اجراء میں عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ یہ سیاسی بیداری کسی واضح نصب العین کے لیے نہیں تھی۔ اس سے آنے والی تحریکوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ۳۵

۱۹۱۲ء میں ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے "الہلال" نکالا۔ اس میں مذہب، سیاست، معاشیات، نفسیات، جغرافیہ، تاریخ، عمرانیات، سوانح، ادب اور حالات حاضرہ پر مضامین لکھے جاتے تھے۔[۳۶] جس نے نہ صرف مسلمانوں کی ادبی اور عملی زندگی میں ایک نئی روح پھونکی بلکہ ان میں نئی مذہبی اور سیاسی بیداری بھی پیدا کر دی۔[۳۷] الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کو جو دعوت دی گئی۔ اس کا پہلا مقصد ان میں سچی مذہبی روح کو بیدار کرنا اور انکی مذہبی اور معاشرتی زندگی کی ازسرنو تعمیر کرنا تھا۔ دوسرا مقصد ان میں سیاسی آزادی کا جوش و احساس پیدا کرنا تھا اور انہیں کانگریس کی "قومی تحریک" میں شریک ہو کر حکومت خود اختیاری کے لئے جدوجہد پر آمادہ کرنا تھا۔ الہلال متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔[۳۸] ابوالکلام آزاد اس سے قبل بنگال کے تخریب پسندوں کے ساتھ مل کر انقلاب لانے کی کوشش کے بارے میں بھی سوچتے تھے۔ مگر اس خیال کو ترک کر کے کانگریس کے جمہوری طریقہ کے قائل ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسلم لیگ کی "فرقہ وارانہ سیاست" پر زبردست تنقید کی۔ جو مسلسل جاری رہی۔[۳۹]

"زمانہ" کانپور سے منشی دیا نرائن نگم نکالتے تھے۔ یہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۲ء تک جاری رہا۔ منشی دیا نرائن نگم کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سری نگم کی ادارت میں یہ جون ۱۹۴۹ء تک جاری رہا پھر بند ہو گیا۔ اس میں ادبی مضامین کے علاوہ ہندو مسلم اختلافات ہندوستان میں موجود مختلف مذاہب، سیاسیات ہند، تعلیم سے متعلق خبریں اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ یہ متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ لالہ لاجپت رائے اس کے مستقل مضمون نگار تھے۔ "زمانہ" کا سیاسی مسلک کانگریس کے قریب تھا۔ جس کا اظہار اقبال کے خطبہ الہ آباد کے بعد کے تبصرے میں نظر آتا ہے۔[۴۰]

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی لاہور سے ماہنامہ "مخزن" ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک و مدیر شیخ عبدالقادر تھے۔ "مخزن" کبھی کبھی سیاسی مسائل پر مضامین شائع کرتا تھا۔ اس کا رجحان ادب اور قومیت کی طرف رہا۔ اس کے مقاصد میں اردو علم و ادب کو ترقی دینا، زبان کی اصلاح کرنا اور اس میں نئے الفاظ و خیالات داخل کر کے اسے وسعت دینا، قومی ذہن کو نئے سانچے میں ڈھالنا اور مشرقی تمدن کو زندہ کرنا تھا۔[۴۱]

پہلی جنگ عظیم کے بعد اردو صحافت نے بہت ترقی کی۔ تحریک خلافت کے دوران دہلی سے مولانا مظہر الدین نے "الامان" اور "وحدت" جاری کئے۔ ان دونوں اخبارات نے مسلم لیگ کے زاویہ نگاہ کی ترجمانی میں بہت کام کیا۔ "ہمدرد" کے ایک نائب مدیر محمد جعفری نے "ہمدرد" بند ہونے کے بعد "ملت" کے نام سے اخبار نکالا جو مسلمانوں کی علیحدگی کی سیاست کا علمبردار تھا۔ بمبئی سے خلافت کمیٹی نے اپنی تحریک کو مشتہر کرنے کے لئے اخبار "خلافت" مولانا شوکت علی کی سرکردگی میں جاری کیا۔ جو مسلم خلافت، عالم اسلام کے واقعات اور ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسائل کے لئے وقف رہا۔ اس نے مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی۔ اسلامی سیاست کے رجحانات کی بھرپور عکاسی کرتا تھا۔ اس اخبار نے مجموعی طور پر خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کو تقویت دینے اور حصول آزادی کے لئے نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ اسی دوران لکھنؤ سے "ہمدم"، "حق"، "حقیقت" اور "سرفراز" نکلے۔ "ہمدم" سید جالب دہلوی ۴۲ نکالتے تھے۔ یہ اخبار مسلمانوں کے مسائل میں خصوصی دلچسپی لیتا تھا۔ بعد میں یہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاست کا علمبردار بن گیا۔ "حق" اور "حقیقت" بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ ۱۹۲۵ء میں سرفراز آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی طرف سے نکلتا تھا۔ یہ اخبار کانگریس کی سیاست کا ترجمان تھا۔ ۴۳ بمبئی ہی سے "ہلال" بھی جاری ہوا۔ اسکے مدیر علی بہادر خان تھے۔ اس نے بھی مسلم لیگ کی حمایت کی پالیسی اختیار کی۔ یہیں سے "اجمل" بھی جاری ہوا جو کانگریسی نقطہ نگاہ کی ترجمانی کرتا تھا۔ ۴۴ تحریک خلافت کے دوران صوبہ سرحد سے "حالات سرحد" نامی رسالہ جاری ہوا جو بعد میں صرف "سرحد" کے نام سے نکلنے لگا اور صوبہ میں مسلم لیگ کا ترجمان ثابت ہوا۔ اسے اللہ بخش یوسفی نکالتے تھے۔ ۴۵

"سیاست" لاہور سے مولانا سید حبیب کی ادارت میں ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا اور ۱۹۴۷ء تک نکلتا رہا۔ مولانا نے علیحدگی پسند سیاست میں نمایاں حصہ لیا۔ اپنے وقت کی مختلف تحریکوں میں شریک تھا اور دوسرے سیاسی مسائل میں بھی قومی اور ملی نقطہ نظر کی تبلیغ کرتا رہا۔ انہوں نے کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک کی مخالفت کی۔ اپنے دور کی ہر اسلامی تحریک میں وہ شامل رہا۔ یہ اخبار ہمیشہ مسلم رائے عامہ کا ہمنوا رہا۔ ۴۶

"انقلاب" کا اجراء زمیندار کے موقر صحافیوں عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر نے ۱۹۲۷ء میں کیا۔ ابتدا میں ان کا سیاسی نقطہ نظر کانگریسی تھا۔ کانگریس کو متحدہ قومی جماعت سمجھتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر وطن کی آزادی کو ناممکن خیال کرتے تھے۔ اتحاد کی صورت انکی نظر میں یہ تھی کہ آئندہ کے لئے مسلمانوں کے حقوق کا تعین ہونا چاہیے تا کہ مسلمان اقلیت مطمئن ہو کر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے سکے۔ وہ جداگانہ نیابت کے حامی تھے اور کانگریس سے اس کو منظور کروانا چاہتے تھے۔ "انقلاب" کی جدوجہد انہی امور پر مرکوز رہی۔ ۲۸ء جب تصفیہ حقوق کے بارے میں کانگریس کی روش واضح ہوئی اور نہرو رپورٹ کو زبردستی منظور کرانے کی کوشش کی گئی تو "انقلاب" کانگریس سے بدظن ہو گیا۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو بیدار کرنے میں اس نے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ سائمن کمیشن سے مقاطعہ میں اس کا رویہ بین بین رہا اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ "جداگانہ انتخاب" کا حق انکے مقاصد میں شامل تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کو انکی آبادی کے تناسب سے ۵۶ فیصد تحریک "انقلاب" ہی کی پیدا کی ہوئی تھی۔ اسی نے اس تحریک کو مقبول بھی بنایا۔ اس کا ایک بڑا کارنامہ "مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن" کا نعرہ تھا۔ اس نے یہ مطالبہ علامہ اقبال کے تاریخی خطبہ سے پہلے کیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مرتضیٰ احمد میکش نے "ہندی مسلمانوں کے لئے الگ وطن" کے عنوان سے مقالات کا ایک سلسلہ "انقلاب" میں شائع کرنا شروع کیا۔ اس مطالبے کے بعد سے انقلاب کے سرورق پر ایک عبارت تحریر ہوئی کہ "پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اسلامی ملک ہیں" ان میں اسلام کا علم بلند کرو۔ علامہ اقبال کے تاریخی خطبے کے بعد اس کی جتنی مخالفت ہندو اخبارات نے کی "انقلاب" نے ان کا جواب دیا۔ اس کی ہر دوسری تیسری اشاعت میں کوئی نہ کوئی مضمون اس موضوع پر شائع ہوتا کہ مسلمانوں کی علیحدہ سلطنت ضرور قائم ہو کر رہے گی۔ "انقلاب" کی یہ روش قیام پاکستان تک برقرار رہی۔ ۴۸ء "انقلاب" کا دور بڑے بڑے قومی مسائل کا حامل تھا۔ اس وقت اخبارات کا موقف تقریباً ایک ہی رہا۔ یہ سب غیر ملکی حکومت کے مخالف تھے سب آزادی چاہتے تھے مسلمانوں کے اخبارات دنیائے اسلام کا درد بھی رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے دور میں "زمیندار"، "الہلال" برعظیم کی ساری اسلامی صحافت پر غالب رہے اور اس وقت قوم پرستی، ملت پرستی اور علیحدگی کی سیاست ایک دوسرے سے خلط ملط رہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد "خلافت" اور "انقلاب" نے اسلامی صحافت کی نمائندگی کی۔ان کے زیر اثر علیحدگی کی سیاست نمایاں ہوئی۔مسلمانوں میں علیحدگی کے رجحانات کوفروغ دینے میں ہندوصحافت کا بھی بڑاہاتھ تھا۔ایسی صحافت پر وہ لوگ چھائے ہوئے تھے۔جوفرقہ پرست تھےلیکن اپنے آپ کوقوم پرست ظاہر کرتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت کی اوراس میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ مسلمان ہراس بات کو پسند کرنے پر مجبور ہو گئے تھے جس کی مخالفت ہندواخبارات کرتے تھے۔"بندے ماترم" کے علاوہ تمام ہندواخبارات کٹرفرقہ پرست تھے۔اور ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے۔کانگریس کی آڑ میں مالوی جی اور شردھانند کی تعلیمات کوفروغ دینے اور "شدھی" اور "سنگھٹن" کی تبلیغ کرتے تھے۔لاہور سے "ملاپ" اور "پرتاب" کا اجراء ہوا۔انہوں نے دوقومی نظریے کو عملاً پیش کیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے،کانگریس سے اورقوم پرستانہ تحریکوں سے ایسا بدگمان کیا کہ پھران کے درمیان کبھی اتحاد نہیں ہوسکا۔۴۹؎ ۱۹۲۱ء میں لالہ شام لال کپور نے "کیسری" نکالا۔اس سے قبل وہ "گوروگھنٹال" نکالتے تھے۔"کیسری" ترک موالات کا حامی تھااور ہندوؤں کے مخصوص مفادات کی ترجمانی کرتا رہا۔۵۰؎ "تیج" کو ۱۹۲۳ء میں دہلی سے شردہانند نے جاری کیا۔یہ خالص ہندوفرقہ پرست اخبار تھا۔اورشدھی اور سنگھٹن کا حامی تھا۔بعد میں کانگریس کی تائید شروع کی لیکن زاویہ نگاہ ہندو ہی رہا۔۵۱؎ ہندومہاسبھانے صوبہ سرحد سے "فرنٹیئر ایڈوکیٹ" اردو میں جاری کیا۔

۱۹۴۲ء میں "پربھات" جاری ہوا۔اس کے مدیر لالہ نانک چند ناز تھے۔یہ مقبول اخبار تھا۔ہندومفاد کی نگہبانی اور کانگریس کی حمایت اس کا مقصد تھا۔۵۲؎ اخبار "نیشنل کانگریس" لاہور سے جاری ہوا تھااس کے مدیر ڈاکٹر ستیہ پال،صدرصوبہ کانگریس کمیٹی تھے۔یہ کانگریس کی تحریک کوکامیاب بنانے کے لیے نکالا گیا تھا۔۵۳؎ "ویر بھارت" لاہور سے ۱۹۲۸ء میں سناتن دھرمیوں کے نقطہ نگاہ کو پیش کرنے کے لیے جاری کیا گیا۔اس کے مالک گنیش دت پنڈت مالویہ کے عقیدت مند تھےاس لیے یہ پنڈت مالویہ کے نظریات پیش کرتا رہابعد میں کانگریس اورمہاسبھا کی حمایت کرتا رہا۔ہندوسبھائی رہنما بھائی پرمانند نے "ہندو" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا تھایہ جون ۱۹۳۵ء میں روزانہ نکلتا تھایہ بھی ہندوفرقہ پرستی کے خیالات پیش کرتا تھا۔۵۴؎

مسلم صحافت میں اس دور کے آخری حصے کا اہم ترین اخبار "احسان" تھا جو لاہور سے ۱۹۳۴ء میں نکلا۔ اسے ملک نور الہی نے جاری کیا۔ علامہ اقبال، احمد خان میکش، مولوی چراغ، حسن حسرت، اشترا کی ادیب بادی جیسے ناموروں کا اسے تعاون حاصل تھا۔ اس اخبار نے مسلم لیگ کی نشاۃ الثانیہ پر ابتداء میں اس گروہ کا ساتھ دیا جو اتحاد پارٹی کا مخالف تھا۔ ابتدائی دور میں اس کا نقطہ نظر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی طرف رہا۔ کچھ عرصہ بعد احمد خان میکش نے "احسان" سے علیحدگی اختیار کر کے "شہباز" جاری کیا۔ ابتدائیہ مسلم لیگ کا حامی تھا۔ خاکسار تحریک سے اختلاف کے بعد اس اخبار کے مقاطعہ کی تحریک شروع کی۔ کچھ عرصہ تک یہ وقار انبالوی کی ادارت میں نکلنے لگا۔ ان کے بعد ابوسعید بزمی اس کے مدیر بنے۔ ان کا جھکاؤ کانگریس کی طرف تھا۔ اس لئے اخبار کی پالیسی کچھ نیشنلسٹ اور زیادہ تر یونینسٹ ہوگئی۔ اور اس نے انتخابات میں مسلم لیگ اور اس کی تحریک کی مخالفت کی۔ ۵۵

نصر اللہ خان عزیز مشہور اور نامور صحافی تھے۔ انہوں نے ابتداً مدینہ بجنور کی ادارت کی۔ کانگریسی اور قوم پرستانہ نقطہ نظر رکھتے تھے۔ لاہور ہی سے نصر اللہ خان عزیز "پاسبان" بھی نکالتے تھے۔ یہ مسلمانوں میں کانگریس اور نیشنلسٹ نظریات کو مقبول بنانے کے لیے نکالا گیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عالم "تریاق" نکالتے تھے جو اینٹی کیمونل مسلم لیگ کا ترجمان اور کانگریسی نظریات کو پیش کرتا تھا۔ جمعیت العلماء ہند دہلی سے "الجمعیت" نکالتی تھی۔ اس کے مدیر سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ ان کے بعد مولانا محمد عثمان فارقلیط اور پھر ہلال احمد زبیری اس کی ادارت کرتے رہے۔ ابتدا میں اس کی پالیسی قوم پرستوں کی تھی مگر بعد میں یہ سیاسی اعتبار سے قوم پرستی کے نظریات اور کانگریس کی تحریکات کی حمایت کرتا تھا۔ ۵۶ ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالغفار نے حیدر آباد دکن سے "پیام" جاری کیا۔ اس اخبار نے بھی "پاسبان" کی پالیسی کو اپنایا اور کانگریسی اور نیشنلسٹ نظریات سے زاویہ نگاہ کو فروغ دیا۔

"عصر جدید" کلکتہ سے مولانا شائق احمد عثمانی نکالتے تھے اس نے بنگالی مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور ان میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ تحریک پاکستان کے فروغ کے لیے بھی اس کا کام بڑا وقیع ہے۔ بنگالی مسلمانوں میں قومی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں مولانا محمد اکرم خان کی شخصیت مثالی ہے۔ انہوں نے ایک اخبار "زمانہ" جاری کیا جو مسلمانوں کی علیحدہ سیاست اور مسلم لیگ کا موئید تھا۔ مولانا محمد اکرم نے زیادہ تر بنگالی صحافت میں تحریک پاکستان کے لیے خدمات سرانجام دیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایک نامور

ادیب اور صحافی تھے۔ انہوں نے کلکتہ سے "ہند" جاری کیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بنیادی طور پر کمیونزم کے حامی تھے۔ سامراج دشمنی میں کانگریس کی حمایت کرتے رہے۔ مسلم لیگ کے مخالف تھے۔۵۷ مشہور کانگریسی رہنما سید محمود کی ادارت میں "نئی زندگی" نکلتا تھا۔ اس کا نقطہ نظر متحدہ قومیت اور کانگریس کا نصب العین رہا۔ تحریک پاکستان کا مخالف تھا۔ ۱۹۴۶ء میں اس کی ایک مخصوص اشاعت 'پاکستان نمبر' میں مختلف ہم خیال افراد نے پاکستان کی مخالفت میں مضامین تحریر کیے۔ خاص لکھنے والوں میں مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر سید عبدالطیف تھے۔ حیات اللہ انصاری نے پنڈت نہرو کی سرپرستی میں "قومی آواز" لکھنؤ سے جاری کیا۔ اس کا مطمع نظر کانگریس کی تحریکات اور اس کی تشہیر اور قوم پرستانہ خیالات کی تبلیغ تھی۔۵۸

بمبئی سے کمیونسٹ پارٹی نے سجاد ظہیر کی ادارت میں دوران جنگ "قومی جنگ" جاری کیا۔ جو بعد میں "نیا زمانہ" کے نام سے نکلتا رہا۔ اس نے تقسیم ملک اور پاکستان کے مطالبہ کی حمایت کی۔ سامراج دشمنی اس کا ایک اہم مقصد تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوان کافی مقبول ہوا تھا۔ اسی عرصہ میں "جنگ" اور "انجام" جاری ہوئے۔ ان کا نقطہ نظر پاکستان کی حمایت میں تھا۔ "جنگ" کو میر خلیل الرحمٰن اور "انجام" کو عمر فاروق نکالتے تھے۔۵۹

"نوائے وقت" کو حمید نظامی نے ۱۹۴۴ء میں لاہور سے جاری کیا تھا۔ یہ تحریک پاکستان کے دوران بہت سرگرم اور فعال رہا۔ حمید نظامی مسلم لیگ کے پرخلوص کارکن تھے۔ اس اخبار کو مسلم لیگ کا تعاون حاصل رہا۔ اس وقت کے مشہور سیاسی رہنما بھی اس میں لکھتے رہتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں تحریک پاکستان کافی مقبول تھی۔ اس لیے اس اخبار کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور بہت جلد اپنے دیگر مسلم معاصرین سے زیادہ ممتاز ہوگیا۔۶۰ تحریک پاکستان کے دوران اس کی کامیابی کے لیے جو متعدد اخبارات جاری ہوئے تھے ان میں "ایمان" تھا جو لاہور سے جاری ہوا تھا۔ اس کی ادارت عبدالحمید قریشی کرتے تھے۔ یہ صرف تحریک پاکستان کے لیے وقف تھا اس کی اشاعت میں سرورق پر اخبار کے نام کے نیچے "انگریزی زبان میں تحریک پاکستان کی آواز" تحریر ہوتا۔۶۱ اس نے اپنی عام اشاعتوں کے علاوہ "پاکستان نمبر" کے نام سے تین خصوصی اشاعتیں پیش کی تھیں۔ پہلا نمبر ۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو، دوسرا نمبر ۳۰ دسمبر ۱۹۴۵ء، تیسرا نمبر ۱۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو شائع ہوا، پہلے دو نمبروں کے مندرجات پاکستان کے سیاسی اور تاریخی پس منظر پر مبنی تھے۔ تاریخی پس منظر میں پاکستان کے مطالبہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ مخالفین

پاکستان پر تنقید کی گئی ہے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے اور ایسے مدلل مضامین بھی ہیں جو پاکستان کے قیام کا سیاسی تہذیبی جواز بھی پیش کرتے ہیں۔٦٢ اس کا تیسرا نمبر محض "مظالم کانگریس" کو بیان کرتا ہے۔اس میں مظالم کانگریس کو پیش کر کے اس کا حل صرف پاکستان میں تجویز کیا گیا ہے۔

١٩٣٨ء میں دہلی سے ہفت روزہ "منشور" کا اجراء کیا گیا۔منشور کے مدیر مسلم لیگ کے ایک ممتاز قائد سید حسن ریاض تھے۔٦٣ منشور نے آل انڈیا مسلم لیگ کی بھرپور ترجمانی کی۔٦٤ اور تحریک پاکستان میں مؤثر کردار ادا کیا۔اسی کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں "ڈان" اخبار نکالا گیا تھا۔یہ اخبار قائداعظم محمد علی جناح کی سرپرستی میں نکلتے تھے۔مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی حمایت میں اس وقت برعظیم کے مختلف حصوں سے متعدد اخبارات جاری ہوئے۔ایسے اخباروں میں زیادہ تر اردو اخبارات جاری ہوئے تھے۔٦٥ لکھنؤ سے چودھری خلیق الزماں نے مسلم لیگ اور اس کی تحریکات کو فروغ دینے کے لئے "تنویر" جاری کیا۔٦٦ صوبہ سرحد میں پہلے پہل اللہ بخش یوسفی نے "سرحد" جاری کیا تھا جو تحریک خلافت میں کافی سرگرم تھا۔بعد میں اس نے مستقلاً مسلم لیگ کی حمایت اور ترجمانی ہی کی۔مسلم لیگی رہنما سردار اورنگ زیب نے پشاور سے ١٩٤٤ء میں "ملت" جاری کیا۔یہ بھی تحریک پاکستان میں فعال رہا۔بلوچستان سے نکلنے والے دو اخبار زیادہ اہم تھے۔"استقلال" عبدالصمد اچکزئی نکالتے تھے۔یہ اخبار قوم پرستی کے رجحانات کا حامل اور مسلم لیگ کا مخالف تھا۔اس نے شدت کے ساتھ تحریک پاکستان کی مخالفت کی۔"الاسلام" قاضی محمد عیسیٰ نے جاری کیا تھا جو بلوچستان مسلم لیگ کے صدر تھے اس اخبار نے وہاں مسلم لیگ کی ترجمانی کی۔غازی فضل احمد نے "جمہور" اور نسیم حجازی نے "تنظیم" جاری کیے۔ان اخباروں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ مسلم لیگ کی حمایت کی۔٦٧

ان تمام اخبارات اور رسائل وجرائد نے برعظیم میں تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کی کامیابی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔تقریباً ہر بڑی سیاسی جماعت نے اپنی ترجمانی کے لئے اخبارات جاری کئے تھے۔کئی اخبارات کانگریس اور مسلم لیگ کی سرپرستی میں نکلتے تھے۔متعدد اخبارات نے اپنے طور پر ان میں سے کسی کی حمایت کی اور لاتعداد اخبارات ایسے تھے جنہوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق تحریک آزادی کو تقویت پہنچائی، رائے عامہ کو ہموار کیا اور حصول آزادی کو ممکن بنایا۔جہاں تک تحریک پاکستان کا تعلق تھا ہندو صحافت کے فرقہ وارانہ جذبات اور معاندانہ

رویہ کے سبب مسلم لیگ کے نقطہ نظر کے حامی اخباروں نے پاکستان کے حق میں اپنی بھرپور تحریک شروع کی۔ ٦٨
اس وقت بجا طور پر مسلم لیگ کے حامی اخباروں کا لب ولہجہ اور حلقہ اثر زیادہ فعال اور موثر رہا اور مسلمانوں کے ایسے اخبارات جو قوم پرست تھے اور کانگریس کے نقطہ نظر کو پیش کرتے تھے، مسلمانوں کے محدود طبقہ میں کہیں کہیں کامیاب رہے۔ اس کا واضح سبب یہ تھا کہ کانگریس فی الحقیقت ہندو جماعت تھی اور اس کے حامی ہندو اخبارات مسلمانوں کے لئے جارحانہ رویہ رکھتے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے کثیر طبقہ نے نفسیاتی طور پر علیحدگی کے رجحانات رکھنے والے اخبارات میں تسکین محسوس کی۔ ٦٩ ان شواہد کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اخبارات دو قومی نظریہ اور تقسیم ہندو پاک کے ضمن میں بجا طور پر ایک فکری اور نظریاتی ادارے میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جنہوں نے اس سیاسی فکر و فلسفہ کو آگے بڑھایا۔ اور بطور ادارہ اپنا اثبات پیش کیا۔

باب دوم

سیاسی حالات کا مطالعہ جس میں
دو قومی نظریہ نے نشو و نما پائی

باب دوم

سیاسی حالات کا مطالعہ جس میں دو قومی نظریہ نے نشو ونما پائی

اٹھارویں صدی کے ابتداء ہی میں مغلوں کی حکمرانی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس صوتحال سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی بنیادی حکمت عملی "لڑاؤ اور حکومت کرو" (Divide and rule) پر تیزی کے ساتھ عمل درآمد شروع کیا جس کے نتائج تمام شعبہ ہائے زندگی میں رونما ہونا شروع ہوئے۔ جنوبی ہندوستان کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے کار پردازوں کی نظریں بادشاہت پر مرکوز ہوگئیں۔ انیسویں صدی میں انگریزوں کا مرہٹوں کے خلاف شاہی فوج کا حلیف ہونا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ امن وامان کی دگرگوں صورتحال کے پیش نظر لوگوں نے مرہٹوں کے خلاف برطانیہ کی بڑھتی ہوئی قوت کے ساتھ تعاون کیا اور کچھ اس وجہ سے کہ برطانوی فوجیوں کے بہتر اسلحے اور اس کی تنظیم کو جنگ کے دیسی طریقوں پر فوقیت حاصل تھی۔ لہٰذا ۱۸۵۷ء سے پیشتر ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی آگرہ میں صوبہ داری قائم ہوگئی اور دلّی میں کمشنری۔ اس طرح برعظیم میں سب سے بڑی طاقت کی حیثیت سے برطانیہ کہ ظہور نے سیاست کا نقشہ بدل دیا۔ پانی پت کی لڑائی کے چار سال بعد برطانیہ نے مغل سلطنت سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کو زبردستی چھین لیا۔ اس عطیہ "شاہی" کے اڑتیس سال بعد ۱۸۰۳ء میں مغل بادشاہ خوشی خوشی برطانیہ کا وظیفہ خوار ہوگیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے الحاق کی پالیسی کو اتنی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا کہ وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور ہندوستان میں احساس محرومی کا اہم سبب بن گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں جب تجارت سے سیاست کی جانب قدم بڑھایا تو اپنے استحکام کے لیے اردو زبان کی تعلیم اپنے ملازمین کے لیے ضروری خیال کیا اور اس مقصد کے لیے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اس کالج کے معلم اول ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو زبان کو نہایت کارآمد قرار دیا تھا[1] وہ اپنی "کتاب برٹش انڈیا مونی ٹر" میں لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ ہندوستانی، ہندوستان کی سب سے زیادہ عام زبان ہے اور جو ہمیں شب و روز اپنے دیسی افسروں، مدرسوں، ملازموں اور دیگر متعلقین سے گفتگو کرنے میں استعمال کرنی پڑتی ہے اس لیے نحوی اصول کے ساتھ اسے جس قدر جلد سیکھا جائے بہتر ہے۔"[۲]

انگریزوں نے اردو زبان کو ہندوستانی کا نام دیا۔ مگر انگریزوں نے اس اعتراف کے باوجود فورٹ ولیم کالج سے جدید ہندی زبان کو بھی فروغ دیا۔ اس میں عربی و فارسی کے مروجہ الفاظ سے گریز کر کے دانستہ برج بھاشا اور سنسکرت الفاظ کو جگہ دی گئی اور فارسی رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط اختیار کیا گیا۔ اس کی بنیاد سب سے پہلے برہمن للولال نے کی اور "پریم ساگر" کے نام سے "بھگوت گیتا" کے ایک حصے کا ترجمہ کیا۔ اور اسے فارسی رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط میں مرتب کیا۔ للولال جی کے اس کام کو ہندوؤں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایسا صرف اس لیے کیا گیا کہ اس لٹریچر کے ذریعے اردو سے الگ، ہندی کے نام سے ایک نئی زبان کے رواج اور اس رواج کے ذریعے ہندو قومیت کے فروغ کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے بھی برہمن للولال جی کے کام کو سراہا اور ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔[۳] ڈاکٹر تاراچند اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"جدید ہندی اس وقت نامعلوم تھی، کیونکہ اس کا کوئی لٹریچر موجود نہ تھا۔ ادبی مقاصد کے لیے اس کا استعمال فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ کالج کے پروفیسروں نے للولال جی اور دوسرے اساتذہ کی ہمت افزائی کی کہ وہ تصنیف و تالیف کا کام اسی زبان میں کریں جس میں اردو کے مصنفین کرتے ہیں۔ لیکن عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کریں اس طرح ایک نئے اسلوب نے جنم لیا اور ہندوؤں نے اسے اپنی خاص ضرورتوں کے عین مطابق استعمال کیا۔ عیسائی تبلیغی جماعتوں نے، اس میں انجیل کا ترجمہ کر کے اور بھی اہمیت بڑھا دی۔ لیکن اس نئے اسلوب کو جسے جدید ہندی کہنا چاہیے، مقبول ہونے میں دیر لگی۔ حقیقتاً یہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا کہ ہندی کی طرف لوگوں نے توجہ کرنی شروع کی۔ اس کو مستحکم

کرنے کے لیے خاص کوششیں کی گئیں۔ بیمز (Beams) کیلاگ (Kellog) اور بعض دوسروں نے اسی زمانے میں اس کی قواعد یں لکھیں، حتیٰ کہ صوبائی حکومتوں نے بھی لوگوں کو اردو کے استعمال سے روک دیا۔"[۴]

ڈاکٹر تاراچند کی رائے صحیح ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ذریعے ہندی زبان کا اطلاق خاص معنوں میں کیا گیا۔ جدید ہندی کے ذریعے ہندو قومیت کو پروان چڑھایا گیا۔ جو برعظیم، پاک و ہند میں موجود دو بڑی قوموں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کا سبب بن گئی۔ انگریزوں کا یہ اقدام سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک سیاسی حربہ تھا۔ اور برعظیم، پاک و ہند میں متحدہ قومیت کا پرچار کیا گیا۔ جو دراصل مسلمانوں کے خلاف ایک گہری سازش تھی۔ جیسے جیسے ہندوؤں میں نئی قومیت کے جوش میں ہندی زبان کا جوش بڑھتا گیا۔ ویسے ویسے ہندو اور مسلمانوں میں سیاسی اختلاف بھی بڑھتا گیا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

"انگریزی تسلط کے بعد، بعض اسباب کی بنا پر ہندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی، جس کی بنیاد قدیم تہذیب اور قدیم مذہب اور زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کا رشتہ زبان کی ضرورت داعی ہوئی کیونکہ قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے۔ اب انہوں نے ان علاقوں میں جہاں ہندی بولیاں رائج تھیں ایک معنوی ہندی کو داخل کرنا شروع کیا، اور اردو کو وہاں سے نکالنا شروع کیا۔ اس چیز نے ہندو مسلم اتحاد میں ہمیشہ کے لیے رخنہ ڈال دیا اور دونوں کا نقطہ نظر ایسا بدلا کہ ہندو مسلمان پھر کبھی کسی مسئلے پر متفق نہ ہو سکے۔"[۵]

انگریزوں نے جدید ہندی زبان کے فروغ کا آغاز ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شروع کیا۔ وہ بتدریج انگریزوں کی تعلیمی و لسانی پالیسیوں کے ساتھ بڑھتا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی اور ۱۸۳۹ء میں عدالت دیوانی اور نظامت میں بھی اسے سرکاری حیثیت حاصل

ہوگئی۔ بظاہر یہ اقدام اردو کے حق میں تھا لیکن اس تبدیلی سے دوررس نتائج مرتب ہوئے جو انگریزوں کے حق میں تھے۔ فارسی کو ختم کر کے انگریزوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس مضبوط وقدیم ثقافتی رشتے کو کاٹ دیا۔ جس میں ہندوستان کے سارے مسلمان، خواہ وہ کسی صوبے اور علاقے کے رہنے والے ہوں، بندھے ہوئے تھے، اور جو مسلمانوں کے حق میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور علمی وادبی ہر لحاظ سے، زیادہ مفید وکار آمد تھا۔ [۶]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب برصغیر، پاک و ہند پر برطانیہ کی باقاعدہ عملداری قائم ہوگئی۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لینے کے بعد اپنی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" پر تیزی کے ساتھ عمل کیا۔ جس کے نتیجے میں جدید ہندی اور اردو کا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ۱۸۶۷ء میں جب کہ نہ نیشنل کانگریس کا وجود تھا، نہ کسی دوسری سیاسی تحریک کا، ہندوؤں نے اردو کی مخالفت کا آغاز کیا اور اسے دفتروں، عدالتوں اور دوسرے اداروں سے خارج کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ [۷] سرسید احمد خان نے اردو کی بھرپور حمایت کی۔ جب کہ ہندو برابر مسلمانوں کی ثقافت، تہذیب وتمدن کی علامت اردو زبان کو نو وارد ہندی زبان میں ضم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ہندوؤں کی اس شعوری کوشش کے نتیجے میں دو قومی نظریہ نے فروغ پایا۔ اس طرح دو قومی نظریہ کے بانی ہندو تھے۔ [۸] جنہوں نے اردو زبان کی مخالفت کے جوش میں علیحدہ قومیت کے نظریہ کو جنم دیا۔

اردو ہندی تنازعہ جس کی ابتدا انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی، نے بیسویں صدی میں عروج پایا۔ بیسویں صدی کے سیاسی حالات میں جن اہم مسلمان شخصیات نے حصہ لیا اور عوام میں سیاسی شعور و بیداری اور فہم وآگہی پیدا کی۔ ان کا تعلق علیگڑھ تحریک سے تھا۔ ان شخصیات نے مسلم نظریات کے فروغ اور عوام میں سیاسی تدبر کے لیے اردو شاعری ونثر کا سہارا لیا۔ اس لیے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی میں اردو شاعری اور تاریخی پس منظر میں لکھی جانے والی کتب ان سیاسی عوامل سے متاثر ہوئیں جو انگریزوں اور ہندوؤں کے باہمی ذہنی ہم آہنگی سے پیدا ہوئے۔ یہ وہ اہم ادارے تھے کہ جنہوں نے عوام میں دو قومی نظریہ، ہندی قومیت، مسلم قومیت اور نظریہ وطنیت کی فکر کو جنم دیا اور پاکستان کو اساسی بنیادیں فراہم کیں۔

تحریک آزادی میں شعراء اردو کا سیاسی کردار:

انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیش نظر ایسی شخصیات سامنے آئیں جنہوں نے انہیں اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس دلایا۔ ان تحریکات میں سب سے نمایاں علیگڑھ تحریک ہے۔ جس کے روح رواں سرسید احمد خان تھے۔ سرسید احمد خان کے خیالات میں انقلابی تغیر کا اہم ماخذ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہے۔[۹] ابتداً سرسید ہندوستانیوں کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ لیکن قومی سطح کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کی قیادت کا خیال ہندوؤں کی ہندی سرپرستی کا ردعمل تھا۔[۱۰] ہندوستان میں ایک نئے عنصر انگریزوں کے اضافے نے قدیم اور جدید کے درمیان فضاء کو مکدر کر دیا تھا اور ہندوستان کی تہذیبی زندگی، قومی ہیئت اور ملکی حالات کو پیچیدہ مسائل سے دوچار کر دیا تھا۔ چنانچہ سرسید نے علیگڑھ سائنٹیفک سوسائٹی کے ذریعے رائے عامہ کو ہموار کرنے اور قدامت کو جدیدیت سے مغلوب کرنے کی سعی کی اور حصول مقصد کے لیے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء کیا۔ اس نے مسلمانوں میں سیاسی، تہذیبی اور ادبی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔[۱۱] سرسید نے سوسائٹی کے تحت انگریزی سے اردو میں تراجم کروائے۔[۱۲] اس سے اردو زبان کے ذخیرے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جب کہ ہندو پریس نے اس کی شدید مذمت کی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے "حیات جاوید" میں اس کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ:

> اردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے اور باوجود کرنے اس بات کے کہ ہندی زبان سردست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اس کی ترقی میں کوشش کر کے اس کو ترجمہ کے لائق بنایا جائے۔[۱۳]

سرسید احمد خان کی فکر میں ہمہ گیریت تھی۔ وہ قومی سطح پر سوچتے تھے اور ہندوؤں کے مفادات کو نقصانات پہنچانے سے بھی گریزاں رہتے لیکن ورنیکلر یونیورسٹی[۱۴] کے قیام پر ہندوؤں کے متعصبانہ رویے کی وجہ سے ان کی فکری جہت میں تبدیلی آ گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں ۱۸۶۷ء میں سرسید نے مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم قرار دے

دیا۔۱۵؎ سرسید احمد خان نے اپنے تدبر سے یہ جان لیا تھا کہ زبان جو علوم کی ترویج وترسیل کا وسیلہ تھی اب سیاست کا آلہ کار بنائی جارہی تھی اور ہندی کو اردو کا مد مقابل بنانے کی تحریک شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ لسانی مسئلے نے تنازعے کی صورت اختیار کی تو تعصب میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔۱۶؎ چنانچہ سرسید نے علیگڑھ تحریک کے ذریعے اردو زبان وادب کو فروغ دیا۔

علیگڑھ تحریک نے نہ صرف مستحکم روایات پیدا کیں بلکہ ایک طرز حیات اور انداز فکر کو بھی جنم دیا اور معاشرت، سیاست اور ادب کو متاثر کیا۔۱۷؎ علیگڑھ تحریک کی کامیابی کا سہرا سرسید احمد خان کے رفقاء کار کے سر بھی ہے جن میں محسن الملک، وقارالملک، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد دہلوی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے سرسید کے مشن کو آگے بڑھایا۔ بیسویں صدی میں جب مسلم لیگ کی تحریک پیدا ہوئی تو سرسید کے دوقومی نظریہ کو اسکے مقاصد میں اساسی حیثیت حاصل ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی علیگڑھ تحریک کا نقطہ آغاز اور تخلیق پاکستان کا واقعہ اس تحریک کی کامیابی کا نقطہ عروج قرار پاتا ہے۔۱۸؎

اردو زبان اپنے ارتقاء ہی سے یکجہتی کی علامت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو شاعری مختلف مراحل سے گزری تو اپنی بنیادی خصوصیات کے تحت اس نے قومی عناصر کو جذب کیا۔ جن پر قومی یکجہتی کی علمی اور عملی تجربی عمارت مستحکم طور پر تعمیر کی جاسکے۔۱۹؎

سرسید کی تحریک اور ان کے رفقاء سے قومی اور ملّی مسائل پر اردو زبان میں نثر اور نظم کا رواج ہوا۔ سرسید اور ان کے معاصرین کی اہم ترین تصانیف کا مقصد قوم کی اصلاح اور فلاح و بہبود ٹھہرا۔۲۰؎ اس کے ساتھ ہی اردو شعر وادب کو بھی ایک نئی جہت ملی۔ جیسے حقیقی معنوں میں ادبی دنیا میں انقلاب کہا جاسکتا ہے اسی زمانے میں ۱۸۷۴ء میں لاہور میں انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔۲۱؎ جس نے جدید شاعری کو فروغ دیا۔۲۲؎ شاعری کے موضوعات میں حب الوطنی، محبت و مروت، محنت وکاوش، امن وانصاف اور اخلاق و معاشرت شامل ہوئے۔ ان میں سب سے اہم حب الوطنی کا تصور تھا جو سیاسی اور قومی پس منظر کا حامل تھا۔ اس دور میں تخلیق کی جانے والی نظموں میں قدیم تصور وطن کو محدود انفرادی اور سطحی قرار دیا گیا۔ قومیت اور وطنیت کا احساس اور آزادی کی روح جدید اردو شاعری کا بڑا وصف تھا۔ اس دور کے تقاضوں کو نظم کی جدید تحریک نے بالواسطہ پورا کیا اور اردو شاعری

اجتماعی تحریکات کی با قاعدہ ترجمان بنی۔ ۲۳

مولانا الطاف حسین حالی ۲۴ نے بھی اس کا اثر قبول کیا۔ حالی نے انجمن پنجاب کے تحت مشاعروں میں چار مثنویاں برکھارت، نشاط امید، رحم وانصاف اور حب وطن پڑھیں۔ ۲۵ انہوں نے اردو شاعری میں جس نئی طرز کی بنیاد ڈالی، وہ بہت پائیدار ثابت ہوئی اور جدید شاعری کی بنیاد اسی پر تعمیر ہوئی۔ ۲۶ ابتداً حالی کی شاعری میں مغربی اثر ملتا ہے جس کا اعتراف انہوں نے اپنے مجموعہ "نظم حالی" (۱۸۹۰ء) میں کیا ہے اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے۔" ۲۷

حالی کی نظموں میں قومیت اور وطنیت کا جدید تصور ملتا ہے۔

اے سپہر بریں کے سیارو — اے فضائے زمین کا گال زارو
اے پہاڑ کی دلفریب فضا — اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے نسیم بہا کے جھوکو — دہر ناپائیدار کے جھوکو
تم کو ہر اک حال ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور بھی عزیز

حالی نے جنگ آزادی کے حوادث کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، جس کا اثر ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑو
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستان گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے یہ ہیں یاں گوہر یکتانہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشان بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانہ ہرگز [۲۸]

حالی کی وہ نظمیں جو زمانہ لاہور میں پڑھیں گئیں۔ اس سے ان کے ابتدائی سماجی اور سیاسی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ہندوستان کی بے بسی، قومیت کا تصور، مغرب کی عقلیت، جمہوریت، انفرادی آزادی اور غلامی کا خاتمہ، یہ سب ان کے ذہن کو متاثر کرنے لگا تھا۔ درحقیقت یہ زمانہ ذہنی انقلاب کا وہ زمانہ تھا۔ جس میں وہ قدیم و جدید کی کشمکش سے نکلے اور نئے حالات و خیالات سے واقف ہوئے۔[۲۹]

حالی کے لاہور سے دہلی منتقل ہونے کے بعد سرسید کے ساتھ رفاقت رہی۔ سرسید کے زیر اثر انہیں انگریزی نظام حکومت اور جدید مسائل سے آگاہی حاصل ہوئی۔ چنانچہ حالی کا ایک مضمون "سرسید احمد خان اور ان کا کام" انسٹی ٹیوٹ گزٹ علیگڑھ میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے سرسید کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ذاتی رائے بھی تحریر کی۔ ۳۰؎ حالی سرسید کی فکر سے پوری طرح متفق تھے مگر انہوں نے سرسید کی طرح برطانوی حکومت کی مکمل حمایت نہیں کی۔ وہ انگریز (برطانوی) حکومت کی طرف سے کئے گئے ان ترقی پسندانہ اقدام کو سراہتے تھے۔ جن کو وہ ہندوستانی معاشرے کی اصلاح اور ترقی میں مفید اور معاون سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ برطانوی حکومت کی سامراجی سازش سے پوری طرح باخبر بھی تھے اور تنقید بھی کرتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی بہتری، برطانوی حکومت کے قیام اور استحکام میں تلاش نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اس کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد اور دیسی حکومت کو قرار دیتے تھے۔ ۳۱؎

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی
جین مت ہووے یا ہو بیشنوی

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک	ہیں	اتفاق	سے	آزاد
شہر	ہیں	اتفاق	سے	آباد

حالی بھی سر سید کی طرح ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم نہیں مانتے لیکن وہ مختلف فرقوں اور گروہوں کے آپس میں اختلافات کو بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک غیر ملکی انگریزوں کے زیر حکومت سماج میں تمام ہندوستانیوں کا سماجی مفاد ایک تھا۔ وہ ہندوستانیوں کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لئے ہندوستان میں موجود تمام فرقوں اور گروہوں میں تعاون اور اتحاد کی فضاء کو دیکھنا چاہتے تھے۔ حالی ہندوستان کی محکومی کی بنیادیں آپس کے اختلافات اور رنجشوں کو قرار دیتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اتحاد کی تبلیغ کی۔[۳۲] انہوں نے اپنی شاعری کو قومی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو　　اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی　　اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

لیکن حالی ہندوستان جیسے ملک کے سارے باشندوں کو جن کی زبان، نسل اور مذہب مختلف تھے، جدید معنوں میں ایک قوم تصور نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک قوم کی تشکیل کے لیے ایک زبان، ایک نسل اور ایک مذہب کا ہونا ضروری ہے۔[۳۳]

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے
اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب
کہ نیشن وہ جماعت ہے، کم از کم
زبان جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب

حالی ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے ان نازک لمحات میں بھی جب ملازمتوں کی دوڑ، نمائندہ اداروں میں مسلمانوں کی نشستوں کا تحفظ، سرسید اور مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کی عام مخالفت، تلک کی تحریک انسداد گاؤ کشی اور ہندی اردو کے جھگڑے کے بعد فرقہ پرستی نے جب زور اختیار کیا۔ اس وقت بھی حالی کی کوشش یہی تھی کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو۔ حالی مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی نفاق کو مضر سمجھتے تھے۔ جس کا اظہار اپنے ایک خط ۱۹۰۴ء بنام عبدالحلیم شرر میں کیا۔[۳۴]

"لیکن درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہوسکتا کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی اور یکجہتی کے روابط مستحکم نہیں ہوسکتے۔ بے شک بد قسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہوگئے ہیں جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں لیکن ہمارے پاس اس امر کے باور کرنے کے وجوہات موجود ہیں کہ جس قدر ملک میں تعلیم کی ترقی ہوتی جائے گی۔ جس قدر لوگ قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اور جس قدر نااتفاقی کے مضر نتائج لوگوں پر آشکارا ہوتے جائیں گے، اسی قدر ان پر یہ راز ظاہر ہوتا جائیگا کہ بغیر اتحاد و یک جہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں وقعت وتوقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔ یہی تعلیم جس نے بالفعل دونوں قوموں میں زہر گھول رکھا ہے۔ آگے چل کر یہی زہر ایک دن تریاق کا کام کرنے والا ہے۔"[۳۵]

حالی ملک کا عام مفاد ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور یکجہتی پر منحصر سمجھتے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے۔ مگر درحقیقت وہ ان دونوں قوموں کے عدم اتحاد سے مایوس ہو چکے تھے۔

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

حالی نے سرسید کے ترغیب دلانے پر "مسدس مدوجزر اسلام" ۱۸۷۹ء میں لکھی۔ ۳۶ اس میں مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزلی کی حالت کو انہوں نے نظم کیا۔ ۳۷ یہیں سے انہوں نے ارادی طور پر اسلامی سیاسیات میں قدم رکھا۔ ۳۸ مسدس میں انہوں نے بڑے مربوط انداز میں ظہور اسلام، اسلام کی وہ روشنی اور بیداری جو عرب میں پھیلی، اسلام کا عروج، اسلامی تہذیب و ثقافت کی عظمت و شوکت اور اس کے باقیات الصالحات، ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور مغلوبیت، دوسری اقوام کی کامیابیاں اور ان کے اسباب اور پھر مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے لیے تجاویز نظم کی ہیں۔ ۳۹

غرض فن ہیں جو مایۂ دین و دولت طبیعی الٰہی، ریاض و حکمت
طب اور کیمیا، ہندسہ اور ہیئت سیاست، تجارت، عمارت، فلاحت

لگاؤ گے کھوج ان کا جا کر جہاں تم
نشاں ان کے قدموں کے پاؤ گے واں تم

ہوا گو کہ پامال بستان عرب کا | مگر اک جہاں ہے غزل خواں عرب کا
ہر اک کر گیا سب کو باراں عرب کا | سپید و سیہ پر ہے احسان عرب کا

وہ قومیں جو ہیں آج سرتاج سب کی
نکونڈی رہیں گی ہمیشہ عرب کی ۴۰؎

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے | مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے | خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا ۴۱؎

حالی کی مسدس نے مسلمانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اس میں مسلمانوں میں حقیقت پسندی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور عملیت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ علیگڑھ کی ترقی کا زینہ بن گئی۔ ایک خیال کے مطابق جس طرح بنکم چندر چٹرجی کی آنند مٹھ ہندو طرز فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔ ۴۲؎ جس میں بنگالی مسلمانوں کے دور انحطاط کے دوران ہندو قومیت کے تصور نے جس طرح عروج حاصل کیا۔ اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ہندوؤں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی طرح مسدس اسلامی طرز فکر کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ ان کے قومی اور ملی شعور کی علامت ہے۔ ۴۳؎ حالی کی دوسری اہم ترین نظم "شکوہ ہند" ۱۸۸۸ء میں لکھی گئی۔ اس نظم میں انہوں نے مسلمانان ہند کے زوال کا اصل سبب اکال الامم ہندوستان کی سرزمین کو قرار دیا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے ہندوستان کو دیار غیر اور مسلمانوں کو بدیسی مہمان کہہ کر مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا اظہار کیا۔ ۴۴؎ قیام پاکستان کا

ایک دھندلا سا خاکہ ان کے اس شعر میں نظر آتا ہے۔

الوداع اے کشور ہندوستان جنت نشاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

تھی ہماری قوم و ملت رسم و عادت سب جدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا

بول چال اپنی الگ تھی اور زبان تیری الگ
تجھ سے ہم تھے اجنبی اور ہم سے نہ تو نہ آشنا

حالی نے اپنی نظموں میں قومی اصلاح کے کسی نہ کسی پہلو کو مدنظر رکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو دومحاذ پر اپنا دفاع کرنا تھا ایک تعلیمی اور دوسرے معاشی سطح پر۔ حالی کی بیشتر نظموں کا دائرہ یہی تھا۔ اس کے علاوہ معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں حالی نے عورتوں کی تعلیم کو قوم کی ترقی کا راز قرار دیا ہے۔ انہوں نے عورتوں کے مسائل اور حقوق پر بھی بڑی مؤثر نظمیں لکھیں جیسے مناجات بیوہ، چپ کی داد وغیرہ۔ مسلمانوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے "ننگ خدمت"، "دولت اور وقت کا مناظرہ" وغیرہ ان کی مثالی نظمیں ہیں۔[45] حالی نے اردو شاعری میں حقیقتاً مسلمانان ہند کے ملّی تشخص کو ابھارا۔ انہوں نے زوال کے اسباب پر غور وفکر کرنے کے بعد تاریخی و منطقی تجزیہ کے ساتھ ملی طرز فکر کی روشنی میں اپنی شاعری کو حصہ بنایا۔

علیگڑھ تحریک میں دوسری ممتاز شخصیت مولانا شبلی نعمانی کی تھی۔شبلی ۱۸۵۷ء کے حوادث کے بعد علمی اور ادبی منظر نامے میں نمایاں حیثیت اور مقام رکھتے ہیں۔۴۶ ان میں شعری اور ادبی خوبیاں عیاں تھیں۔۴۷ علیگڑھ سے وابستگی کے بعد انہوں نے سرسید کے فکری زاویے کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔۴۸ شبلی علیگڑھ سے منسلک ہونے سے پہلے ہی سرسید سے واقف اور متاثر تھے۔انہوں نے سرسید کی مدح میں ایک قصیدہ عربی میں لکھا تھا، جو بعد میں علیگڑھ گزٹ میں چھپا۔علیگڑھ آنے سے پہلے ان کی شاعری تقلیدی اور عشقیہ تھی۔۴۹ لیکن اس سے منسلک ہونے کے بعد ان کی شاعری میں تبدیلی آئی،اب ان کا موضوع 'مسلمانوں کا ماضی اور حال' ہوگیا یعنی مسلمان کیا تھے اور کیا ہوگئے؟ یہی احساس ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا۔اسی عہد میں انہوں نے مثنوی "صبح امید" لکھی، جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا تذکرہ ملتا ہے تو ساتھ ہی سرسید کی کوششوں کو بھی سراہا گیا ہے۔

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام؟ جب قوم تھی مبتلائے ایام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی وہ تاج تھی فرق آسمان کی
گل کردیئے تھے چراغ جس نے قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزہ خون منشا کہ چل کر ٹھرا تھا فرانس کے جگہ پر
روما کے دھوئیں اڑا دیتے تھے اٹلی کو کنوئیں جھنکا دیئے تھے؟ ۵۰

عروج کے بعد زوال کا نقشہ کھینچا ہے۔

جس چشمہ سے اک جہاں تھا سیراب وہ سوکھ کے ہورہا تھا بے آب
پستی نے دبالیا فلک کو خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمراہی کا ڈر ہے عیسیٰ کو تلاش چارہ گر ہے

جواہر ابھی برس گیا ہے — اک بوند کو اب ترس گیا ہے
اسلام کی جان پر بنی ہے — دم توڑ رہا ہے جان کنی ہے
غفلت نے ڈبودیا تھا ہم کو — تقلید نے کھودیا تھا ہم کو ۵۱

اس کے بعد سرسید کی تحریک کا ذکر کیا ہے۔

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہِ دلگیر — پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اتر گئی جگر میں ۵۲

پھر سرسید کی کوششوں کو سراہا ہے۔

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں — ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر! — دشنام سنی دعائیں دیکر!
کیا تلخ ملے جواب اس کو! — کیا کیا نہ دیئے خطاب اس کو!
منظور جو قوم کا تھا اعزاز — ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز
آگے وہ بڑھا۔ ہٹا کے سب کو — طے کرکے رہا راہ طلب کو
آئے تھے جو سنگ راہ بن کر — سب اڑ گئے برگ کاہ بن کر! ۵۳

۱۸۹۴ء میں سرسید نے علیگڑھ کی سالانہ نمائش کے موقع پر "تماشائے عبرت" دکھایا تھا۔ یہ ایک تھیٹر تھا۔ اس موقع پر مولانا شبلی نعمانی نے اردو میں "ایک مسدس" پڑھا، جو مسدس حالی کی طرز پر تھی۔ ۵۴

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے　　　یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو ہمارے بچے　　　دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے

کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانہ سے مٹادیں کیوں کر

مرد شیراز و صفاہاں کے وہ زیبا منظر　　　بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار ورود
مصر و غرناطہ و بغداد کا اک اک پتھر　　　اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

ان کے ذرّوں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انہیں سب یاد ہیں ازبر اب تک [55]

مولانا شبلی نعمانی نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی ۱۸۹۳ء میں قصیدہ اردو پڑھا، یہ بڑے پرجوش اور پردرد انداز میں لکھی گئیں تھیں۔ان میں تاریخی واقعات سے مسلمانوں کو عبرت دلائی گئی اور ترقی کی روح پھونکی گئی تھی۔

بجا ہے آج گر اس بزم میں یہ زیب وساماں ہیں
یہ ان کی بزم ہے جو یادگار نسل عدنان ہیں
خلیل اللہ سے مہمان نوازی جن کو پہنچی ہے
ہزاروں کوس سے آ کے واہ اس گھر میں مہماں ہیں

فقط ایک جذبہ قومی انھیں واں کھینچ لایا ہے

جہاں زور حکومت ہے نہ حاجب ہیں نہ دربان ۵۶

۱۹۹۴ء میں انہوں نے ایک قصیدہ لکھا۔ جس کے ذریعے انہوں نے اسلاف کے علمی وتمدنی کارنامے بیان کرتے ہوئے نوجوانانِ ہند کے اندر جوش حمیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نظم کو انہوں نے ۱۸۸۸ء میں لاہور میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس میں پڑھا تھا۔

کچھ فقط تیغ وسناں ہی ہیں نہ تھے ہم مشہور — ہم نے ہر فن میں دکھایا یہ بیضا کیسا
روشنی علم کی پھیلائی تھی پہلے ہم نے — ورنہ چھایا تھا زمانے میں اندھیرا کیسا
اب بھی اسلاف کے موجود ہیں جوہر ہم میں — ورنہ چھایا تھا زمانے میں اندھیرا کیسا

پھر نوجوانوں کو ترقی کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

ہاں کمربستہ ہو اے قوم ترقی کے لیے — آج کے کام میں اندیشہ فردا کیسا
نوجوانو! یہ زمانہ کو دکھا دیتا ہے — اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا
قوم کے تازہ نہالان چمن ہو تم لوگ — دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخل تمنا کیسا ۵۷

مولانا شبلی نعمانی کی ابتدائی دور میں لکھی جانے والی نظمیں اصلاحی تھیں۔ جن میں سرسید کی فکر کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر ایک مثنوی 'صبح امید' ، 'قومی مسدس' قصیدہ اردو، تہنیت نامہ بہ طرز قصیدہ لکھا۔ یہ کلام ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۶ء کے درمیان کا ہے۔ اس کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا احساس پیدا کیا۔ ان کے اس عہد کے کلام کا مقصد جدید تعلیم، جدید خیالات کا فروغ اور سرسید کی فکر کو مقبول

بنانا تھا۔۵۸؎

بیسویں صدی میں شبلی قومی وسیاسی شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ یہ وہ عہد تھا جب کہ مسلم اُمہ سخت مصائب وآلام میں مبتلا تھی۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات میں تیزی کے ساتھ تبدیلی آئی۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ (۱۹۱۱ء)، مسجد کانپور کا ہنگامہ (۱۹۱۲ء)، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ، مسلم لیگ اور اس کے بعض حقوق کے لیے گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف، طرابلس کی لڑائی، بلقان کی جنگ، پہلی جنگ عظیم وغیرہ۔ شبلی ان حالات سے خود کو علیحدہ نہیں رکھ سکے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ان مسائل کی نشاندہی کی۔ ہر ہفتے جو واقعہ پیش آتا وہ اس پر اشعار لکھتے، جو اس قدر مشہور ہو جایا کرتے تھے کہ بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے۔ ان کی یہ نظمیں لاہور میں زمیندار، دلّی میں ہمدرد، لکھنؤ میں مسلم گزٹ اور کلکتہ میں الہلال میں کشاف کے نام سے چھپتی تھیں۔ ۵۹؎ اس دور کی سیاسی بیداری میں شبلی کا کردار بہت اہم رہا۔

مولانا طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں کہ

> "سیاسی کاموں میں حصہ لینے والوں میں اب تک زیادہ تر نام جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے آئے ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست میں داخل ہوئے۔ قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہو گیا بلکہ انہوں نے ہی فرقہ پرستی کے دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا، جن میں سب سے اوّل مولانا شبلی نعمانی تھے۔" ۶۰؎

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے بنگال کو انتظامی بنیادوں پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس طرح مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی تھی، جو مسلمانوں کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔ جب کہ کانگریس نے اس تقسیم کی شدید مذمت کی اور اسے ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کی سازش قرار دیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار

کے موقع پر بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا گیا۔ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔[۶۱] علامہ شبلی نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر ایک مضمون "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" تحریر کیا۔[۶۲] جس میں انہوں نے مسلم لیگ کو اس کا قصوروار ٹھہرایا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے اشعار مختلف اخبارات میں چھپتے تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی نظموں میں ان کی قابل ذکر نظم "شہر آشوب اسلام" تھی، جو رفاہ عام، لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔ یہ نظم جنگ بلقان کے زمانہ میں لکھی گئی تھی۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک [۶۳]

جنگ بلقان کے واقعات سے متاثر ہو کر شبلی نے متعدد نظمیں اردو میں لکھیں۔ ان میں ترکوں سے خطاب ۸ دسمبر ۱۹۱۲ء میں لکھی۔ جس میں ترکوں کو جنگ بلقان میں اڈریانوپل پر فتح حاصل کرنے پر مبارک باد دی گئی ہے۔

اے ترک! اے مجسمہ کبریائے حق — اے وہ کہ جس پہ عالم ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہ ملت الامم ہے تو — تو آج زور بازوے شاد مجاز ہے
رنگین ہے تیری تیغ سے ہر صفحہ وجود — مغرب ترا ہی عرصہ گہ ترک تاز ہے [۶۴]

ایک اور نظم "ہستی مسلم کی رہائی" اسی دوران لکھی گئی۔ جس میں جنگ بلقان کے موقع پر وزرائے برطانیہ کی اسلام دوستی کو محض ایک فریب قرار دیا گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا　　مگر اس کا اثر جو کچھ ہے بس ہندوستان تک
مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیری ملت　　عراق و فارس ونجد و حجاز و قیروان تک ہے
منافق ہوئے جو کہتا ہے کہ میں ٹرکی سے یکسو ہوں　　یہ وہ الفاظ ہیں کہ جن کی جہانگیری زباں تک ہے ۶۵

جنگ بلقان ہی کے زمانے میں ایک اور نظم "بمبئی کی وفادار انجمن" لکھی۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں مسلمان برطانیہ کے طرز عمل کے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ تو بمبئی میں ایک گمنام وفادار اسلامی انجمن کے نام سے اخبارات میں مسلمانوں کے عام خیالات کی مخالفت میں تجویزیں شائع ہوتی تھیں۔ شبلی نے اس نظم میں اس کی پردہ دری کی ہے۔

ایک دن تھا کہ وفاداری مسلم کی متاع　　آ جگہ عام تھی اور نرخ میں ارزانی بھی
دفعتہً ہوگئی ہنگامہ بلقان میں گم　　قوم کو سخت مصیبت تھی پریشانی بھی
ہاتھ آنے کا تو کیا ذکر پتہ تک بھی نہ تھا　　ڈھونڈنے والوں نے گو خاک بہت چھانی بھی ۶۶

مولانا شبلی ترکی کے حالات سے بے حد پریشان تھے۔ وہ دولت عثمانیہ کی شکست کو پوری امت مسلمہ کی ناکامی اور اسلام کے زوال کا نقطہ آغاز سمجھتے تھے، اسی لئے وہ ترکوں کی امداد کو فرض عین قرار دیتے تھے۔ ۶۷ جنگ طرابلس و بلقان کے بعد ہندوستان میں جن تحریکات کا آغاز ہوا۔ مولانا نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے چندہ جمع کر کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سربراہی میں ایک طبی وفد ترکی بھیجا، جس نے ترکی میں چند ماہ قیام کر کے ترکوں کی ناقابل فراموش خدمت کی۔ اس سے شبلی بہت متاثر ہوئے اور وفد کی واپسی پر ایک نظم "خیر مقدم ڈاکٹر انصاری" بمبئی میں پڑھی۔ اس نظم سے ان کے دلی جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری ۔۔۔ کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی ۔۔۔ یہی تھا درد اسلامی، یہی تھی رسم غم خواری

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں ۔۔۔ نے سب انقلاب گردش گردوں بھی
تمھارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستان والے ۔۔۔ تم تم نے وہ مظالم ہائے روزافزوں دیکھے ہیں ۶۸

اس عہد کا دوسرا اہم واقعہ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کو مچھلی بازار کانپور کا ہے۔ کانپور کے مچھلی بازار میں ایک سڑک کی تعمیر و توسیع ہونی تھی۔ اس کے سرراہ ایک مسجد تھی۔ مسجد کا ایک حصہ جو وضو خانہ تھا، توسیع میں حائل ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف اسے منہدم کر دیا گیا۔ اس سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کر کے ضلع مجسٹریٹ کی مذمت کی۔ اس کے پر جوش مسلمانوں نے اس منہدم حصے کی ازسرنو تعمیر شروع کی۔ انتظامیہ نے ردعمل میں ڈپٹی کمشنر پولیس مسٹر بٹلر کے حکم پر فوج نے نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلادیں۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد زخمی اور شہید ہوئی۔ یہ واقعہ مسلمانان ہند کی سیاسی جدوجہد اور آزاد پرستی کی اہم کڑی تھی۔ مولانا شبلی نے اس کا بڑا اثر قبول کیا اور اس میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے اس واقعہ کے خلاف تقریریں لکھیں اور پر درد نظمیں پڑھیں۔ جو اس زمانے میں بڑی مقبول ہوئیں۔ جن میں "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں"، "علمائے زندانی"، "آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم"، "کانپور میونسپلٹی کا خطاب مسجد مچھلی بازار کانپور سے"، "شرائط صلح"، "خون کے چند قطرے" وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

کل مجھ کو چند لاشہ بے جان نظر پڑے ۔۔۔ دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورو سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر ۔۔۔ بچپن کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں ۶۹

مساجد کی حفاظت کے لیے پولیس کی حاجت ہے　　خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے
عجب کیا ہے کہ اب شاہراہ سے یہ صدا آتے　　مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانہ کی ضرورت ہے
شہیدان وفا کے قطرہ خون کام آئیں گے　　عروس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں　　کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے ۷۰

شبلی دینی اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے تھے، جس کا اظہار انہوں نے اپنی نظم "مذہب اور سیاست" میں کیا۔

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو　　دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبہ دینی تھا کہ جس نے وہیں　　کہ دیا ذرہ افسردہ کو ہم رنگ شرار
یا کوئی جذبہ ملک و وطن تھا جس نے　　کردیے دم میں قوائے عمل بیدار ۱۷

شبلی ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ سرسید کی سیاسی حکمت عملی سے متفق نہیں تھے، ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے وار ان کے سیاسی افکار بڑی حد تک کانگریس کے نظریات سے ہم آہنگ تھے۔۷۲ شبلی نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے۔ انہوں نے ہر اس تحریک کی حمایت کی جس کا مقصد حصول آزادی یا ہندوستان کے عوام کے بنیادی اور جمہوری حقوق کی بحالی تھی۔۷۳ شبلی خوشامد کی پالیسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ملکی سیاست میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ آزادی کی جنگ کے لیے حکمرانوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا جائے۔۷۴ اس لیے وہ مسلم لیگ کے مقاصد سے متفق نہیں تھے۔ بلکہ ان کی وفادارانہ پالیسی کو ان کی کمزوری خیال کرتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے کردار پر متعدد تنقیدی نظمیں لکھیں اور ان کی علیحدگی پسند سیاست کو بے کار چیز کہہ کر قلم رد کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ مل کر ایک متحدہ پلیٹ فارم بنانے کا مشورہ دیا۔۷۵

شبلی نظریہ قومیت میں سرسید کے ہم خیال تھے۔ انہوں نے اسلام کو مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد قرار دیا۔ ان کے نزدیک بہ طور مذہب اسلام میں وہ مادہ گرمی، اور قوت فاعلہ موجود تھی جس میں تحریک اور جوش دے کر مسلمانوں میں عملی قوت پیدا کی جاسکتی تھی۔ ۷۶ ان کے یہاں غلامانہ رویے کی مذمت اور آزادی کے حصول کے جذبے کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔

حالی اور شبلی نے اپنی بیشتر نظمیں پہلی بار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۶ء) میں پڑھیں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا مقصد برصغیر کے مختلف خطوں میں رہنے والوں میں قومی یگانگت کا فروغ تھا۔ اس پلیٹ فارم سے ایسے شعراء بھی سامنے آئے، جو کم معروف تھے مگر اپنا اثر چھوڑ گئے۔ ان میں ایک نام ڈپٹی نذیر احمد کا ہے، جو بنیادی طور پر نثر نگار تھے لیکن قومی ہمدردی کی فضاء سے متاثر ہو کر انہوں نے کئی کامیاب اور مؤثر قومی نظمیں تخلیق کیں۔ ۷۷ ان کی نظمیں قومی اور اصلاحی جذبہ سے معمور ہوتی تھیں۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ سرسید اور قومی تحریکات پر مبنی ہے۔ ۷۸ ان کی نظموں کا مجموعہ "نظم بے نظیر" کے نام سے شائع ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد ہندوستان میں موجود مختلف مذاہب کے لوگوں کو ایک قوم نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قوموں کا مجموعہ ہے جہاں مختلف عقیدوں، مختلف رسم ورواج اور عادات واطوار کی قومیں بستی ہیں۔ جن کے اغراض ومقاصد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ۷۹ انہوں نے قوم کے بارے میں اپنے تصور کو ثابت کرنے کے لیے ہندوستان کی تہذیبی تکثریت کو تہذیبی ومذہبی اختلافات کے طور پر پیش کیا۔ ۸۰ ڈپٹی نذیر احمد کی شاعری میں عملیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی جدید علوم سے بے رغبتی اور ملی وقعتی نذیر احمد کا خاص موضوع تھا۔

یہ علم گر نہیں ہے تو فضل و کمال، ہیچ — منشی، ادیب، شاعر، شیریں مقال ہیچ
وعظ ومناظرات و جواب و سوال ہیچ — تحقیق میر و زاہد ملاّ جلال ہیچ
ہم نے تو قیل و قال میں کی عمر رائیگاں
یورپ نے ہائے لوٹ تھا گنج رائیگاں

ایک اور نظم میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔

کچھ نہ پوچھو آج ہم لیکچر میں کیا کہنے کو ہیں　　قوم کو خود قوم کے منہ پر برا کہنے کو ہیں
عزت نہیں ہنر نہیں، پلّے ٹکا نہیں　　دنیا میں اب تو جینے کو مطلق مزا نہیں

علیگڑھ تحریک کو اور بھی متعدد شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعہ نئی جہت دی۔ اس دور میں نوجوان شعراء کی ہونہار نسل قومی شاعری کے میدان میں نمودار ہو رہی تھی۔ جس نے اپنے بزرگ شعراء کی پیروی کی اور برعظیم کی مختلف اسلامی اور قومی تحریکات میں علیگڑھ تحریک کے مقاصد اور نصب العین کے تحت اپنی شاعری سے مفید اور مؤثر کام لیا۔ ایسے شعراء میں وحید الدین سلیم، خوشی محمد ناظر، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان قابل ذکر ہیں۔ یہ شعراء سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء سے براہ راست مستفید ہوئے تھے۔ ان کی تحریک کو فروغ دینے اور کامیاب بنانے میں مستعد رہے۔ انہوں نے اپنے دور میں اٹھنے والی تمام اسلامی اور سیاسی تحریکات میں شمولیت اختیار کی اور علمی و تحریری کوششوں کے ساتھ ساتھ آزادی کی جدوجہد میں اپنی شاعری کو بھی ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہ اپنے عہد کے معاشرتی اور سیاسی حالات سے متعلق اور نئے مغربی سیاسی، علمی اور معاشرتی رجحانات سے متاثر تھے۔ ۸۱ علیگڑھ تحریک سے وہ ہم عصر شعراء بھی متاثر ہوئے، جو اس تحریک سے پوری طرح وابستہ تو نہ تھے، لیکن اس کے مقاصد اور قومی نصب العین کے حامی تھے۔ ان شعراء میں محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی اور عبدالحلیم شرر کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ ۸۲ اسماعیل میرٹھی نے اپنی نظموں میں عملیت کا پیغام دیا اور آزادی کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ ان کی دو نظمیں جریدہ عبرت اور آثار سلف قابل ذکر ہیں۔ جبکہ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے تحت جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے حب الوطنی کے جذبہ کو فروغ دیا۔

علیگڑھ تحریک نے شاعری کو جدید رجحانات کے مطابق ڈھالا۔ یہاں سے نظم کی تحریک کو فروغ ملا اور غزل کے نئے مزاج کی تشکیل کی گئی اور ان سے سیاسی اور سماجی تحریکوں کے مقاصد کی ترجمانی کا کام لیا گیا۔ ۸۳

اس عہد میں ہندوستان داخلی اور خارجی طور پر جن حالات سے دوچار تھا۔ اردو شاعری میں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ وطن اور حب الوطنی کا جذبہ، قوم اور قومیت، سیاسی محکومی کا احساس اور آزادی کا تصور، ایسے مضامین تھے جو علیگڑھ تحریک کے زیر اثر شاعری میں بیان کیے جانے لگے تھے۔ اس دور میں ہندوستانیوں کا سیاسی شعور کافی حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ محکومی کا احساس بھی انہیں مضطرب کر رہا تھا۔ عالمی حالات و واقعات اس احساس اور شعور میں شدت پیدا کر رہے تھے۔ خصوصاً جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست نے ایشیائی برتری کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔[۸۴] اس واقعہ کی وجہ سے ہندوستان میں وطن کی محبت نے ایک خاص سیاسی انداز فکر اختیار کر لیا تھا۔

بیسویں صدی کے وہ شعراء جنہوں نے دو قومی نظریہ کو فروغ دیا اور قومیت کے نظریہ کو واضح کیا ان میں علامہ اقبال، ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی شامل ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کے دینی اور ملّی شعور کو نئی جہت عطا کی۔ مولانا ظفر علی خان شاعر بھی تھے اور صحافی بھی۔ مولانا ابتدا میں کانگریس سے قریب تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے لیکن ۱۹۳۶ء میں کانگریس کے اجلاس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس سے مولانا کانگریس سے دور ہو گئے۔ کراچی میں منعقد اس اجلاس کی کاروائی کو نماز عصر پر مولانا کی درخواست پر ملتوی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ وہ کانگریس سے بدظن ہو گئے اور علیحدہ قومیت کے قائل ہو گئے تھے۔ جب تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد انگریزوں کے خلاف قائم ہوا تو انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی گاندھی سے عقیدت کا اظہار کیا۔[۸۵]

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کردیا   باطل کو حق سے دست و گریباں کردیا
سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پر   خنجر کو پھر حوالہ شیطان کردیا
ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک کر   گویا انہیں دو قالب و یک جان کردیا

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کردیا

آئی ہیں آسمان سے چل کر وہ قوتیں   جو مسلم اور ہندو کو شیر و شکر کریں

لیکن جب تحریک خلافت پورے عروج پر تھی اور عوام ان تحریکات تحریک خلافت اور ترک موالات سے اس قدر پر جوش ہو گئے تھے کہ موپلوں کی بغاوت اور چوراچوری کے واقعات رونما ہوئے۔ گاندھی اور کانگریس کے دوسرے رہنماؤں نے ان واقعات کو بہانہ بنا کر ان تحریکات کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ تمام حادثات کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی گئی اور ہندو زعماء نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے حکومت کی ہمنوائی شروع کر دی۔ ۸۶ اس طرح ہندو مسلم اتحاد کا خواب پارہ پارہ ہو گیا۔

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں ایک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے
لب پہ ہے صدا آزادی کی اور دل میں شور غلامی کا
اکھڑی تھی ہوا انگریزوں کی ان دونوں نے ملکر باندھی ہے

تحریک خلافت اور عدم تعاون کے خاتمے کے بعد جب ڈاکٹر مونجے نے ۱۹۲۲ء میں سنگھٹن اور شدھی کی تحریک شردھانند چلائی۔ جن کا مقصد ہندوؤں کو منظم کر کے ایک طاقتور قوم بنانا اور نو مسلموں کو دوبارہ ہندو بنانا تھا۔ یہ سراسر مسلمانوں کے خلاف تھے۔ اس سے مولانا بھی متاثر ہوئے اور ان تحریکات کی بغاوت کی زبردست مخالفت کی اور اس کا اظہار اپنی شاعری میں کیا۔ ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں جب کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں، تو ہر وہ اقدام کیا گیا جس کا مقصد مسلمانوں کی دل آزاری تھا۔ حکومتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے اور مرضی کوئی چیز نہیں بلکہ ان کو اس ملک میں ہندوؤں کے تابع ہو کر رہنا ہوگا۔ ۸۷ واردھا منصوبہ کو متعارف کروایا گیا جس میں گاندھی کے نظریات کی عکاسی کی گئی تھی۔ ۸۸ کانگریس کے ان اقدامات سے ظفر علی خان اس کے مخالف ہو گئے اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد ہر اس تحریک کی مخالفت کی جو

ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کے مفادات کے خلاف یا صرف اپنے ہی فائدے کے لیے شروع کی جاتی تھیں۔[89] ظفر علی خان کی شاعری حریت پسندی اور وطن دوستی کے جذبات سے معمور تھی۔اس میں عملی کردار بھی تھا اور دعوت فکر اور درس عمل بھی۔[90]

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو — اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی
آزادی کامل کا ہاتھ میں لیکر — میدان میں جاتے ہوئے ایمان کا بگل بجاؤ

ان کی شاعری میں آزادی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔وہ آزادی کامل کے خواہاں تھے۔ان کی ساری جدوجہد اسی مقصد کے لیے وقف رہی۔

وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستان ہوگا — مبارک باد اس کو دے رہا سارا جہاں ہوگا
علم لہرا رہا ہوگا ہمارے رائے سینا پر — اور اونچا سب نشانوں سے ہمارا ہی نشاں ہوگا

قسم ہے جذبۂ حب وطن کی بے پناہی کی — ہمارا ملک غیروں کا غلام اب رہ
مسلمان ہوں میرا مقصود ہے آزادئ کامل — قسم ہے سرور کونین کی جان گرامی کی
کہ اک جھٹکے میں توڑ دوں گا میں زنجیریں غلامی کی

ظفر علی خان پنجاب کی خلافت کمیٹی کے فعال رکن تھے۔یہ کمیٹی بعد میں مجلس احرار کہلائی۔مسئلہ گنج پر جب ان کا مجلس احرار سے اختلاف ہوا تو انہوں نے مجلس اتحاد ملت بنالی۔جب ۱۹۳۶ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی تو ظفر علی خان نے مجلس اتحاد ملت کو مسلم لیگ میں ضم کردیا۔۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں شریک ہوئے اور کامیاب رہے۔مسلم لیگ کو متحرک عوامی جماعت بنانے اور حصول پاکستان کی

جدوجہد کو کامیاب بنانے میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ اس دور میں انہوں نے جو شاعری کی اس میں عملی جدوجہد کی ترغیب دی گئی۔ کانگریس، اس کے رہنما، ہندوؤں کی اسلام دشمن تحریکیں، ان کی تنقیدوں کا نشانہ تھیں۔[91]

حسرت موہانی نے سیاسی شاعری کا آغاز اپنے زمانہ طالب علمی کے زمانے میں کیا۔ ۱۹۰۳ء میں وہ علیگڑھ تعلیم کے لیے گئے اور تقریباً ایک سال بعد انہوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا۔ حسرت کانگریسی خیالات سے متفق تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک کانگریس کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ کوششوں سے بہتر نتائج نکلنے کی توقع تھی۔[92] مولانا آزادئ کامل کے خواہاں تھے۔[93] وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو پھر فرقہ وارانہ اختلافات کو افہام و تفہیم سے حل کیا جا سکتا ہے۔[94] جب کبھی برطانوی حکومت نے ہندوستان کے لیے دستوری اصلاح یا مراعات تجویز کیں، حسرت نے ان کی مخالفت کی۔ مانٹیگو کی دستوری اصلاحات پر انہوں نے کہا:

کس درجہ فریب سے ہے مملو — تجویز ریفارم مانٹیگو
کاغذ کے سمجھئے پھول ان کو — جن میں نہیں نام کو خوشبو
اے ہندی سادہ دل خبردار — ہرگز نہ چلے تجھ پر یہ جادو

بیسویں صدی کے اوائل میں جب مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا۔ اس وقت مسلم اکابرین کی یہ کوشش تھی کہ جب تک یونیورسٹی آزاد نہ ہو یونیورسٹی کے چارٹر کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ حسرت بھی اس خیال کے حامی تھے۔[95] جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا:

ارباب فریب کی ہے یہ بھی ایک چال — بیکار ہے بہترین و بہتر کا خیال
گنجائش بہترین غلامی میں کہاں — لاریب ہے اجتماع ضدین محال

تحریک خلافت کے دنوں میں حسرت اسلامی محاذ کے قائل ہو گئے تھے۔ انہوں نے گاندھی سے اختلاف کرکے مسلم لیگ کے اجلاس میں آزادی کامل کی تجویز پیش کی اور پھر نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ کیونکہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے مایوس ہو چکے تھے۔۹۶ وہ تحریک آزادی میں سرگرم رہے اور اسکے آخری مرحلہ میں مطالبہ پاکستان کی حمایت شروع کردی تھی۔۹۷ لیکن وہ پاکستان ڈومینین کے بجائے جمہوریت چاہتے تھے۔ اسی نکتہ پر قائداعظم اور ان کے مابین اختلاف رائے تھا۔۹۸ حسرت کے نزدیک ہندوستان میں چھ جمہوریتیں قائم ہونی چاہئیں (۱) مشرقی پاکستان (۲) مغربی پاکستان (۳) مرکزی ہندوستان (۴) جنوب مشرقی ہندوستان (۵) جنوب مغربی ہندوستان (۶) حیدرآباد دکن اور ان سب کو وفاق ریاست ہائے ہند کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہیے۔۹۹

تحریک آزادی کے دوران اردو شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں علیحدہ قومیت کے تشخص کو ابھارا اور کانگریس کے مقاصد کی مخالفت کی گئی۔ بیسویں صدی کے اہم شاعر علامہ محمد اقبال تھے۔ جنہوں نے پان اسلام ازم کی تحریک کو تقویت پہنچائی اور ہندوستان میں اسلامی قومیت کو فروغ دیا۔

اقبال نے سرسید، حالی کی طرح حب وطن کی روایت کو اپنی وطنی و قومی شاعری میں شدومد کے ساتھ جاری رکھا۔ اقبال کی نظم چونکہ فلسفیانہ تھی، اس لیے وہ ہندی قومیت کے اجزائے ترکیبی یعنی مشترک جغرافیائی حدود، مشترکہ تاریخ اور مشترکہ تہذیبی آثار کا ذکر اس دور کی شاعری میں تفصیل سے کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر وطن کی آزادی کا مسئلہ بھی تھا اور ہندو مسلم اتحاد بھی۔ ان موضوعات پر ان کی نظمیں ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ہمالہ، نانک اور رام قابل ذکر ہیں۔ لیکن جو دل سوزی ان کی نظم "نیا شوالہ" میں جھلکتی ہے وہ ان کے عظیم وطنی و قومی شاعر ہونے کی دلیل ہے۔۱۰۰

سچ کہہ دو اے برہمن! اگر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کو وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے ۱۰۱

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دست عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے ۱۰۲

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

۱۰۳

اس عہد میں اقبال ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے لیکن یورپ میں قیام کے دوران ان کے نظریات میں تبدیلی آئی اور انہوں نے قوم پرستی کے محدود تصور کے اثر سے نکل کر اتحاد اسلام یا مسلم قوم پرستی کا پرچار کیا۔۱۰۴ انہوں نے ملت اسلامیہ کی ہئیت اجتماعی اور استحکام پر زور دیا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے قومیت کی اساس وطن یا علاقہ نہیں بلکہ مذہب اسلام ہے۔۱۰۵

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے ۱۰۶

اقبال نے وطنیت کی جگہ اسلام کو ایک اجتماعی تعمیری، سیاسی قوت کی حیثیت سے پیش کر کے اسلامی وطنیت کے تصور کو آگے بڑھایا جو بالآخر برصغیر، پاک و ہند میں مسلمانوں کی ایک جداگانہ آزاد ریاست پر منتج ہوا۔ ۱۰۷
اقبال نے اسلام کی نشاۃ الثانیہ کی بات کی۔ ان کی فکر کا ارتقاء ان کی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے ۱۰۸

اقبال نے ترانہ ہندی کے جواب میں ترانہ ملی تخلیق کیا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا ۱۰۹

اقبال کی فکر میں انقلاب جمال الدین افغانی کی تحریک سے پیدا ہوا۔ جمال الدین افغانی کے نزدیک حب الوطنی ایک فطری جذبہ ہے وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اسلامی ریاستیں خودمختارانہ اور آزادانہ طور پر اپنے مشترکہ مقصد، حصول آزادی کے لیے کوشش کریں اور اتحادیوں کی طرح ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ان کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن تھا کہ جب ساری اسلامی ریاستیں، اسلامی سیاسی نظام کو اپنا کر ذہنی اور عملی طور پر لادینی اور غیر ملکی قوتوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنالیں۔ اقبال نے بھی اسی فکر کو آگے بڑھایا اور اسلامی ممالک کو ایک مضبوط رشتہ، اتحاد میں منسلک کرنے کو کوشش کی۔ ۱۱۰ اقبال نے واضح الفاظ میں کہا کہ "اگر قومیت کے معنی اہل وطن سے محبت کرنے اور ناموس وطن کے لیے جان قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمان کے لیے جزو ایمان ہے۔ قومیت اسلام سے اس وقت متصادم ہوتی ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے۔ اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام محض شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، اور دیگر مسلم ممالک میں قومیت کبھی ایک مسئلے کی صورت اختیار نہ کرے گی۔ قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کو صرف ان ممالک میں درپیش ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں

اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہستی کو بالکل مٹا دیں۔ مسلم اکثریت والے ملکوں میں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کی یہ کوشش حق بجانب ہوگی کہ تہذیبی وحدت کی حیثیت سے انہیں خود اختیاری حاصل ہو۔ یہ دونوں صورتیں اسلام کے عین مطابق ہیں۔[۱۱۱] اس طرح اقبال مسلمانوں کو گروہ میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ ملت اسلامیہ پر زور دیتے ہیں۔

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے　　نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا

نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے　　کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبی

اقبال نے مسلمانان ہند کو ایشیا کی تمام اقوام کے ساتھ ایک رشتہ میں منسلک کرنے کے لیے فارسی زبان میں لکھنا شروع کیا جو متعدد مسلم ممالک کی علمی زبان تھی، تاہم انہوں نے اردو زبان کو ترک نہیں کیا۔[۱۱۲]

بیسویں صدی عیسوی مسلمانان عالم کے لیے اضطراب کا زمانہ تھا۔ جبکہ ہندوستان میں مسلمان دو محاذ پر اپنا دفاع کر رہے تھے ایک انگریزوں سے جن کے وہ غلام تھے اور دوسرے ہندوؤں سے، جو مسلمانوں کی ہر چیز کو انکے عہد کی یادگار سمجھ کر ختم کرنا چاہتے تھے۔ جس میں اردو زبان بھی شامل تھی۔ جس سے ان کا تہذیبی وجذباتی رشتہ تھا۔ ان حالات سے علامہ محمد اقبال بھی متاثر ہوئے۔ انہوں نے سیاسی اور تہذیبی مسائل کو ایک مفکر شاعر کی نظروں سے دیکھا۔ اقبال کی ہندوستان کی سیاست پر گہری نظر تھی۔ سیاسی اعتبار سے ان کے نزدیک مسلمانوں کی فلاح اس میں مضمر تھی کہ وہ جداگانہ انتخاب کے اصول کو مضبوطی سے تھامے رہیں اور متحدہ قومیت کے فریب میں نہ آئیں۔[۱۱۳] اس طرح اقبال نے مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کو واضح کیا اور دو قومی نظریہ کی مبہم شبیہ کو اپنی بصیرت سے واضح کیا۔

علامہ اقبال جداگانہ انتخاب کو مسلمانوں کے تمام مطالبات کی اساس سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک حکومت نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق کو مان کر انہیں اپنے مستقبل کا اختیار دیا تھا کہ چاہیں تو اکثریت میں ضم ہو جائیں یا پھر اپنی جداگانہ ملی ہستی کو برقرار رکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔[114] اقبال نے ۱۹۲۷ء میں جب طریقہ انتخاب پر مسلم لیگ میں اختلاف ہوا تو پنجاب کے اس گروپ کا ساتھ دیا، جو جداگانہ انتخاب کے حق میں تھا اور قائداعظم گروپ سے اختلاف کیا۔ نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء) کے مخالف رہے۔ آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس جو ۱۹۲۹ء میں منعقد ہوا، اس میں شرکت کی اور مسلم مطالبات کی ترتیب میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الٰہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ "اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدن کے زندہ رہ سکتا ہے کہ ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی تھا کہ انہیں بھی نشوونما کا موقع ملے کیونکہ وحدت قومی کے نظام حکومت میں جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست کے ذہنوں میں ہے اور جس کا مقصد تمام ملک میں اپنا تسلط و غلبہ قائم کرنا ہے۔ یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کیے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خوداختیاری حاصل کرے، شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔"[115]

اس طرح اقبال سے پہلے جن مسلم رہنما، ادیب مثلاً سر سید احمد خان، مولانا عبدالحلیم شرر وغیرہ نے یہ تصور پیش کیا کہ مسلمان اور ہندوؤں کے مفادات مختلف ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں یہ خلیج گہری ہوتی چلی جائے گی، ایک علیحدہ مسلم مملکت کا حصول ضروری ہے۔ اس کو عملی جامہ اجتماعی اور مقتدر سیاسی سطح پر، انہوں نے برصغیر میں ایک نئی مسلم ریاست کی تشکیل کی تجویز پیش کی۔ اقبال کی یہ تجویز ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور کی تاریخی دستاویز کی حیثیت سے مسلمانوں کا نصب العین قرار پائی۔ اس طرح قیام پاکستان کے اولین محرک اردو شاعری میں علامہ اقبال تھے اور مسلمانوں میں علیحدہ اسلامی قومیت کے تصور کو پیدا کرنے والے بھی تھے۔

تحریک آزادی میں کتب کا کردار:

بیسویں صدی کے سیاسی حالات نے برصغیر میں متحدہ قومیت اور آزادی کی جدوجہد کو پر جوش انداز میں پیش کیا۔ ان سیاسی حالات وواقعات کو جہاں اردو صحافت، شعراء کی معاونت حاصل ہوئی وہیں کتب نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ ابتدا میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد پر زور دیا گیا لیکن ۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزراء کے اقدامات کے بعد علیحدہ اسلامی ریاست پر زور دیا گیا۔ جس کی جھلک مختلف اوقات میں ممتاز شخصیات کی تحریر میں ملتی ہیں۔ اور ۱۹۴۰ء میں واضح الفاظ میں قرارداد لاہور میں نظر آتی ہے۔ جس کو ہندو پریس نے قرارداد پاکستان کا نام دیا اور مسلمانوں نے خوش دلی کے ساتھ قبول کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سلطنت عثمانیہ کو زوال ہوا تو دوسری جانب اسلامیت کے احساس نے تقویت پائی۔ جس کی عملی شکل تحریک خلافت تھی۔ اس کا منطقی نتیجہ اسلامی قومیت کا تصور تھا۔ ہندوستان کی سیاست میں متحدہ قومیت کا نظریہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام ۱۸۸۵ء سے سامنے آیا۔ مگر اس کے بعد دینی مضمرات پوری طرح واضح نہ تھے۔ تحریک خلافت اور اس کے بعد کے حالات نے مسلمانوں میں متحدہ قومیت کے مقابلے میں اسلامی قومیت کے تصور کا نیا احساس بیدار کیا اور یہ اس زمانے کا علمی مسئلہ بن گیا۔ کانگریس کی تحریک خلافت میں شرکت نے "اتحاد" کا جو نمونہ پیش کیا تھا۔ اس سے علماء دین میں دو گروہ بن گئے تھے۔ جس میں ایک متحدہ قومیت کے نظریہ کا حامی تھا اور اس کی دلیل میں تحریک خلافت کو پیش کیا جاتا تھا۔ مولانا عبدالکلام آزاد جو خلافت کے تصور کے حامی تھے، متحدہ قومیت کے نظریہ کے بھی علمبردار تھے اور اس تصور کی دینی تشریح کا کام مولانا حسین احمد مدنی ۱۱۶ نے انجام دیا۔ اقبال کو ان کے نقطہ نظر سے اختلاف تھا۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں قطعہ بھی کہا تھا۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دین ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بو العجبی است !
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است

چہ بے خبرز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونر سیدی تمام بو لہبی است ! ۱۱۷

مولانا حسین احمد مدنی کی تائید مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد میاں اور مولانا انور شاہ کشمیری ۱۱۸ نے کی۔ یہ جمعیت العلمائے ہند کا سرکاری موقف بن گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اس مسئلے پر ایک کتاب "متحدہ قومیت اور اسلام" تحریر کی۔ جب کہ ان کے حامیوں نے ان خیالات کو اپنے مضامین اور خطبات میں پیش کیا۔ متحدہ قومیت کے نظریے کی تردید اور ابطال کا کام علامہ محمد اقبال اور اس وقت کے مقتدر علماء نے انجام دیا۔ علامہ اقبال نے اپنا اہم خطبہ "مسلمان اور متحدہ قومیت" مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔ علامہ اقبال نے مسلمان رہنماؤں کے سیاسی موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "تاسف کا مقام ہے کہ ہمارے بعض لیڈر، جن میں بعض علمائے دین بھی شامل ہیں، مسئلہ انتخاب کو محض نمائندگی کا طریقہ کار تصور کرتے ہیں اور بس۔ جہاں تک میں نے مسلمانان ہند کی گزشتہ تاریخ اور ایشیائی اقوام کے موجودہ امیال وعواطف اور مغربی اقوام کی ریشہ دوانیوں پر غور کیا ہے، مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ ابھی ایک عرصہ تک مسلمانان ہند کا مستقبل جداگانہ انتخاب سے وابستہ ہے۔ میرے خیال میں جداگانہ انتخاب، قومیت کے مغربی تصور سے بھی متناقص نہیں اور اس کے باوجود ہندی اقوام میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہوسکتی ہے۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اپنی تصانیف "مسئلہ قومیت" اور "مسلمان اور موجودہ کشمکش" حصہ اوّل و دوم میں متحدہ قومیت کے نظریہ کا مدلل رد کیا۔ یہ کتابیں ان کے شذرات، اداریوں، مضامین اور مباحث پر مشتمل ہیں، جو ان کے رسالے "ترجمان القرآن" میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء کے عرصے میں شائع ہوئے۔ "مسئلہ قومیت" کتابی صورت میں کئی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس میں "قومیت اور اسلام" دو طویل مقالے ہیں۔ پہلے مقالے میں اسلامی قومیت کا تعین کیا گیا ہے اور دوسرے مقالے میں متحدہ قومیت کے نظریہ کی قرآنی اور عقلی دلائل کے ذریعہ تردید کی گئی ہے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" مختلف سیاسی مباحث پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض مستقل عنوانات کے تحت انہوں نے "متحدہ قومیت" 'وطنی قومیت اور نیشنلزم'

جیسے نظریات کا ابطال کیا اور اسلامی تصورِ قومیت کے نقوش کو واضح کیا۔ یہ کتاب ۱۹۳۷ء تک کئی مرتبہ شائع ہوئی۔
ان کتابوں کے دلائل اور مباحث سے یہ نقطۂ واضح ہوا کہ اسلام ہی مسلمانوں کی قومیت ہے اور اس قومیت کے تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب اسلامی نظام عملاً نافذ ہو اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو اور وہ اس کے حصول کے ذریعے اسلامی حکومت قائم کریں۔ اس وقت جو متعدد تصانیف ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر لکھی گئیں۔ سید اعجاز حسین نے "ہندوستان کی سیاست" اسلامی نقطہ نگاہ سے تحریر کی۔ یہ حیدر آباد دکن سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ عبدالوحید خان کی "مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ" بھی ان مباحث پر مبنی ہے۔ محمد امین زبیری نے مسلمانانِ ہند کی سیاست پر "سیاست ملیہ" اور "مسلمانانِ ہند کی سیاست وطنی" مطبوعہ آگرہ تحریر کیں۔ "انڈین نیشنل کانگریس اور اہل اسلام" کے مصنف ملا عبدالقیوم نے قومیت کے سلسلے میں کانگریس کے نقطہء نظر کی تردید کی اور اسلامی قومیت کا تصور واضح کیا۔ اس کا اجراء کان پور سے ہوا۔ محمد بخش سلیم نے "وحدت ملت" مسلم لیگ کے نظریہ قومیت کی تشریح میں لکھی جو مکتبۂ لیگ بمبئی سے شائع ہوئی۔

نظریہ قومیت کے علاوہ اس دور میں متعدد ایسی تصانیف منظر عام پر آئیں جن میں ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اور قومی مسائل پیش کئے گئے تھے۔ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی ان کتابوں کا موضوع تھا۔ کاش البرنی نے "مسلم انڈیا" تحریر کی۔ یہ کتاب انگریزی زبان سے اردو کے قالب میں ڈھالی گئی اور لاہور سے اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ اس میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ پیش کی گئی ہے اور سیاست میں ہندوؤں سے ان کی مسابقت کی روداد بیان کی گئی ہے۔ حکومت برطانیہ کی مسلمانوں کی جانب حکمت عملی، ہندوؤں اور کانگریس کی مختلف تحریکوں، قوم پرست مسلمانوں کی کج فہمیوں پر تنقید اور پھر مسلمانوں کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لیکر انہیں اتحاد اور یگانگت کی تلقین کی ہے تاکہ وہ مسلم لیگ کے نصب العین کے تحت اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔ اسی موضوع پر خان فضل کریم خان درانی نے "ہمارا قومی نصب العین کیا ہونا چاہیے؟" تحریر کی تھی۔ یہ کتاب بمبئی سے شائع ہوئی اس کتاب میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ان کا قومی نصب العین پاکستان کے حصول میں تجویز کیا تھا۔ انہیں تلقین بھی کی تھی کہ اس کے حصول کے لیے جدوجہد کریں تاکہ تمام سیاسی، دینی اور معاشرتی مسائل حل ہو سکیں۔ ۱۹۴۰ء کے آغاز میں اخبار "مدینہ" بجنور نے جو کانگریسی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرتا تھا۔ ۱۹۳۸ء۔۱۹۳۹ء تک شائع

شدہ ۵۳۵ سیاسی دانشور اور سیاسی رہنماؤں نے موجودہ صورتحال، مسلمانوں کے سیاسی اور علمی مسائل کے حل کی تجویزیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اس لحاظ سے قابل توجہ ہے اول اس میں مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور دیگر مختلف نقطہ نظر رکھنے والے مسلمانوں کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ دوسرے اس لیے کہ باوجود شدید باہمی مخالفت کے کانگریسی حکومتوں کے طرز عمل کی وجہ سے یہ سب کانگریس کی مہا سبھائی ذہنیت کے شاکی تھے۔

میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں لاہور نے برعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی پر ایک فکر انگیز کتاب "مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل" تحریر کی۔ یہ خطبہ اور مقالے کی صورت میں دو مرتبہ شائع ہوئی۔ تیسری مرتبہ لاہور سے ۱۹۴۴ء میں طبع ہوئی۔ اس میں پہلے اسلام اور اسلامی تہذیب کا تذکرہ ہے پھر مسلمانوں کا زوال، ہندوستان میں مسلمانوں کی مختصر تاریخ، ہندو مسلمانوں کا سیاسی اور معاشرتی مسئلہ، مسلمانوں کی قومی بیداری جیسے موضوعات ہیں۔ مسلمانوں کے لیے نصب العین کا تعین اور پاکستان کے لیے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی انداز کی ایک کتاب "اسلام اور موجودہ سیاسی کشمکش" ہے جسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تحریر کیا ہے۔ اس میں بھی مسلمانوں کی مختلف حیثیتیں، سیاسی صورتحال، سیاسی مسائل کے مختلف حل اور ان کا تنقیدی جائزہ پیش کر کے مسلمانوں کے لیے اسلامی قومیت کی بنیاد پر ایک نصب العین متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں مستقبل کے لیے مختلف تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔

تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں کے جوش وخروش نے برعظیم کی سیاسی سرگرمی میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور اس کے میدان کو بہت زیادہ وسیع کر دیا تھا۔ کانگریس کو بھی اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا تھا۔ لیکن بہت سے انتہا پسند ہندوؤں نے تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کے دوران کانگریس سے حکمت عملی کے اختلاف کی وجہ سے بغاوت کر دی ۱۹۲۲ء۔۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کے خلاف ان کی تحریکوں کا اجراء حقیقتاً اس امر کا نتیجہ تھا کہ برعظیم کی سیاست میں مسلمانوں کا بڑھتا ہوا اثر اور تحریک خلافت کی تنظیم اور اس کے انضباط سے پیدا ہونے والی مسلم قوت ہندوؤں کو بہت ناگوار تھی۔ کانگریس کے خلاف یہ تمام "ہندو قوم" کی بغاوت تھی۔ ان انتہا پسندوں ۱۹۱۱ نے مختلف ذرائع اختیار کیے۔ شدت پسند اخبارات میں سلسلہ مضامین تحریر ہوئے، کتابیں لکھی گئیں اور ان کے خیالات کی اشاعت بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی۔ اس میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ کھل کر اسلام

اور مسلمانوں کی مخالفت شروع کردی۔ ان کی تحریروں کا موضوع بحث اب یہ تھا کہ مسلمان برعظیم کے متعدد صوبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ہندوستان سے کامل یگانگت حاصل کرلینے پر آمادہ نہیں انہیں اپنے اجنبی طریقے ختم کردینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو ہندو کہنا چاہیے۔ اپنے نام ہندووانہ رکھنے چاہئیں۔ ہندو تہواروں کو منانا چاہیے اور ہندوؤں کے قدیم افسانوں، سورماؤں کا احترام کرنا چاہیے۔ غرض یہ کہ مسلمان ہندومت کا ایک فرقہ بن جائیں اور اپنے آپ کو محمدی ہندو کہیں ۱۲۰۔ ان خیالات کے تحت بکثرت ایسا ادب تخلیق کیا گیا جو ہندوؤں میں فرقہ پرستی کے جذبات کو بھڑکا سکتا تھا۔ انگریزی زبان میں یہ خیالات بڑے وسیع پیمانے پر پھیلائے گئے۔ اردو میں جو کچھ تحریر کیا گیا اس کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ اس تحریک کو زیادہ تقویت 'ہریجن'، 'ملاپ'، 'تیج'، 'پرتاب' وغیرہ نے پہنچائی جو کٹر فرقہ پرست اخبارات تھے۔ اس سلسلے میں جو کتابیں تحریر ہوئیں۔ ان کا رخ مسلم سیاست اور سیاسی اداروں کی جانب رہا۔ خصوصاً "تحریک پاکستان" کے دنوں میں زیادہ واضح ہوا۔ انتہا پسند ہندوؤں کی جانب سے جو فرقہ پرستانہ اور معاندانہ خیالات ظاہر ہورہے تھے اور بطور خاص ان کی مسلم دشمن تحریکات نے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے ارادوں کے متعلق شدید اندیشے پیدا کردیئے۔ ہندوؤں کے ارادوں کی تکمیل، مسلمانوں کے لیے ثقافتی موت اور مذہبی ارتداد کے مترادف تھی۔ چنانچہ انہوں نے مزاحمت کا عزم کیا کہ ایک اوسط درجے کا مسلمان بھی مدافعت کے انداز میں غور کرنے پر مجبور ہوتا اور روز بروز ہندوؤں اور کانگریس سے زیادہ دور ہوتا جارہا تھا۔

اس ردعمل کی ابتدا اس وقت ہوگئی تھی جب ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہندوؤں کی جانب سے اردو کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کرانے کی کوششیں شروع ہوئیں اور پھر ایسی تقاریب کا انعقاد ہونے لگا۔ جن کا مقصد خاص طور پر مسلمانوں کی دل آزاری تھا۔ ان سب کا بانی اس وقت ہندو قوم پرست بال گنگادھر تلک تھا۔ اس نے وہ ٹھوس بنیادیں قائم کردیں جن پر آنے والے زمانے میں وقتاً فوقتاً شدتوں کی ہندو تحریکات تعمیر کی گئیں۔ بنکم چندر چٹرجی نے افسانوں اور گیتوں کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف مخاصمت کے جذبات کو ابھارا۔ مسلمانوں کو اس زمانے میں جو خطرات لاحق تھے ان کا جواز ایک ہندو تحریک سے مل گیا تھا۔ یہ ذبیحہ گاؤ کے خلاف ہندوؤں کی شورش تھی۔ ہندوؤں نے گائے کے تحفظ کے لیے ایک جماعت کی تنظیم کی جس نے بہت جلد تمام برعظیم میں اپنی

شاخوں کا جال پھیلا دیا اور جلد ہی اس شورش نے بدنما وسعتیں اختیار کر لیں۔[۱۲۱] ہندوؤں کی ان تحریکوں کے خلاف مسلمانوں نے اس وقت ردعمل کے طور پر بہت کچھ لکھا۔ سرسید احمد خان نے مضامین تحریر کیے۔ عبدالحلیم شرر نے 'مہذب' اور 'اتحاد' میں شذرات اور اداریے لکھے اور دیگر مصنفین نے کتابیں تصنیف کیں۔ اس موقع پر ایک کتاب 'بے موقع فریاد کے مہذب جواب' مولوی نصیر الدین حسن خان بریلوی نے تحریر کی۔ یہ ہندوؤں کی قومی تحریکات جو مسلمانوں کے خلاف تھیں اور ان کی ذبیحہ گاؤ کے خلاف تحریک کے جواب میں تھی۔ اس کے اصل مخاطب ہندو تھے۔ انہیں مخاطب کر کے مسلمانوں سے ہندوؤں کی زیادتیوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس زمانے میں کاٹھیاوار اور بنارس وغیرہ میں جو فسادات ہوئے تھے ان میں ہندوؤں کی شورشوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب بریلی سے ۱۳۱۲ ہجری میں شائع ہوئی۔

جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور اس نے حکومت کے نمائندہ اداروں کے قیام کا مطالبہ تسلیم کرانے کے لیے مسلمانوں کو دعوت دی تو پسماندہ مسلم اقلیت کے سوال پر مسلمانوں کی جانب سے مختلف نوعیتوں سے اظہار خیال کیا گیا۔ سرسید احمد خان نے اپنی تقریروں میں یہ سوال اٹھایا۔ شیخ شمس الدین نے ۱۸۸۸ء میں ایک کتاب تحریر کی، جو گورداس پور میں شائع ہوئی۔ اس کا نام "آئندہ نیشنل کانگریس" تھا۔ اس میں کانگریس کے فرقہ ورانہ مقاصد کی نشاندہی بھی تھی اور مسلمانوں کے قومی مسائل بھی پیش کئے گئے تھے۔

جب بیسویں صدی میں ہندو فرقہ پرستی نے عروج حاصل کیا اور مسلمانوں کے مذہب، تہذیب اور سیاست پر حملے کئے گئے تو مسلمانوں نے ان کے جواب میں ایک وقیع ادب تخلیق کیا۔ ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن تحریکیں شروع کیں تو مولوی ظفر علی خان اور مولانا محمد علی نے مضامین اور نظموں میں ان تحریکوں پر ہندوؤں اور کانگریس کی پرزور مخالفت کی۔ اسلام اور ہندومت کے موازنے پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔ سیاسی علیحدگی پسندی کے دور میں مقبول احمد نے "اسلام اور آریہ سماج کی ترازو" تحریر کی۔ اس میں ہندوؤں کے عزائم، زیادتیوں اور اسلام دشمن منصوبوں کی مذمت کی۔ یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ جذبات کی مذمت میں محمد داؤد حسین نے "بندے ماترم" تصنیف کی۔ اس میں متحدہ قومیت کے نظریہ کی تکذیب اور ہندوؤں کا مخالف اسلام رویہ زیر بحث آیا ہے۔ یہ کتاب حیدر آباد دکن سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

ہندو قوم پرستوں کے عزائم کا ایک نمایاں اظہار ان کے ان منصوبوں سے ہوتا ہے جو تعلیمی فروغ کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ واردھا اسکیم گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے مطابق عام باشندگان ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس تک لازمی جبری تعلیم دی جائیگی۔ اس منصوبے کے تحت برعظیم کی ساری آبادی کو ایک قوم فرض کیا گیا تھا۔ اس کا مطمع نظر یہ تھا کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ملا کر ایک سماج یا ایک ہیئت اجتماعی بنایا جائے۔ ودیا مندر اسکیم کا مقصد دیہات میں عمومی تعلیم کا فروغ تھا تاکہ گاؤں کے بچوں میں "قومی نقطۂ نظر" پیدا کیا جائے۔ فی الحقیقت یہ منصوبہ ودیا مندروں کے ذریعے دیہات کی منتشر مسلمان آبادی کی کثیر التعداد ہندو آبادی میں جذب کرنے کی ایک منظم کوشش تھی۔ ان منصوبوں پر مسلمانوں کی جانب سے مدلل جواب دیے گئے۔ واردھا اسکیم پر مولانا مودودی نے اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" میں تفصیلی بحث کی، مسئلے کا ہر پہلو سے تنقیدی جائزہ لیا اور مدلل مخالفت کی۔ دوسری کتاب "واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان" رازی نے تحریر کی تھی۔ ادارہ طلوع اسلام، دہلی سے متعدد مرتبہ شائع ہوئی۔ اس میں ہندو ذہنیت کا جائزہ لیا گیا، متحدہ قومیت کے نظریہ کی تردید کی گئی اور مذہب، زبان اور طرز معاشرت کے پہلوؤں سے اسے مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول قرار دیا گیا۔

سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کا ہندوؤں سے مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر جو اختلاف رہا ہے اس پر متعدد کتابیں تحریر ہوئیں۔ مسلم قومیت پر تحریر ہونے والی کتابیں بھی اسی ذیل میں تھیں۔ جن کتابوں میں ہندوؤں کی سیاسی حکمت عملی، سیاسی مصلحتوں اور عزائم پر تنقید کی گئی، ان کی تعداد بھی کم نہیں۔ اس سلسلے کی ایک اہم کتاب مولانا مودودی کی "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" ہے۔ اس میں تمام پہلوؤں سے تفصیل کے ساتھ کانگریس کی تحریک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے متحدہ قومیت کے نظریہ، قومی ریاست کی تشکیل کے منصوبے، اس کے "سوراج" کے مفہوم اور "کامل آزادی" کے تصورات پر کڑی نکتہ چینی اور تنقید کی گئی ہے۔ اس کے اصل عزائم مسلمانوں کے خلاف ہندو سبھا اور انگریزوں سے اس گٹھ جوڑ اور اس کی مسلمان دشمن حکمت عملیوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اسی انداز کی ایک کتاب "سوراجی اسلام" کے نام سے رازی نے تحریر کی تھی جو ادارہ طلوع اسلام، دہلی سے طبع ہوئی تھی۔ اس میں کانگریسی قائدین کے عزائم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لئے کانگریسیوں

کے متحدہ محاذ کی نشاندہی اور اس پر تنقید کی گئی ہے۔ ابوالکلام آزاد اور دیگر قوم پرست مسلمانوں کی مذمت کی گئی ہے۔ خصوصاً ابوالکلام آزاد کے دور اول کے خیالات اور اس دور میں ان کے خیالات کا موازنہ کیا گیا ہے۔

جب ۱۹۳۵ء کے دستور کی رو سے انتخابات ہوئے اور ان میں کانگریس کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ صوبوں میں نمائندہ صوبائی وزارتوں کا قیام عمل میں آیا تو کانگریس کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ اس نے صورتحال سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اپنی حکمت عملی میں خاصی تبدیلی پیدا کر لی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اس وقت دو سیاسی جماعتیں نمائندہ حیثیت رکھتی تھیں۔ متحدہ قومیت کے نظریہ کے تحت حصول آزادی کانگریس کا مطمع نظر تھا۔ جب کہ مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی حقوق کے حصول کے ساتھ آزادی مسلم لیگ کا مقصد تھا یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے نصب العین کے لیئے مستعد اور فعال رہیں۔

انگریزی زبان میں ان دونوں جماعتوں کی کئی تاریخیں تحریر ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے "مسلم لیگ کیوں؟" میں مسلم لیگ کی جدوجہد اور پاکستان کے حق میں دلائل دیئے تھے اور اس وقت کی تحریک آزادی کا جائزہ لیا تھا۔ یہ کتاب بمبئی سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ مسلم لیگ ہی کی تائید و حمایت میں ایک کتاب "پیغام رسول المعروف بہ موازنۂ لیگ و کانگریس" لاہور سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی اس میں ان جماعتوں کے اغراض و مقاصد، تحریکات اور جدوجہد کا مقابلہ کیا گیا تھا اور پھر مسلم لیگ کی تائید کی گئی تھی۔ رئیس احمد جعفری کی تصنیف "حیات محمد علی جناح" بھی دراصل مسلم لیگ کی تاریخ تھی۔ اس کی اشاعت بمبئی سے ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ اس سلسلے کی مزید کتابوں میں مرزا قطب الدین کی "کانگریس اور مسلم لیگ" عبداللہ مصری کی "مسلمان اور کانگریس"، جے بی کرپلانی کی "انڈین نیشنل کانگریس اور ہندوستانی مسلمانوں کے بڑے بڑے سوالات" وغیرہ تھیں۔ اردو میں مسلم لیگ کی تاریخ مظہر انصاری نے لکھی جو دہلی سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ پورن چند جوشی نے اختلاف رائے کی بنیاد پر "کانگریس اور کمیونسٹ" تصنیف کی اس میں کانگریس کی تحریک بھی پیش کی۔ اسکی خوبیاں اور خامیاں بیان کیں اور کمیونسٹ تحریک سے اس کا تعلق اور عدم تعلق دونوں نمایاں کیئے۔ اصولی طور پر مصنف کو اشتراکی ہونے کی وجہ سے کانگریس سے جو اختلاف تھا۔ اسے بھی تحریر کیا یہ بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں قرارداد لاہور منظور ہوئی۔ اس قرارداد میں مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ ریاست کے قیام اور تقسیم ملک کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مطالبے کو مسلمانوں نے "پاکستان" کا نام دیا۔ اس قرارداد نے برعظیم کے مسلمانوں میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ مسلمانوں نے جب بحیثیت ایک متعین مقصد کے اس نظریے کو اختیار کرلیا تو ان کی جدوجہد آزادی ایک نہایت اہم مرحلے میں داخل ہوگئی۔ ہندوؤں نے جتنی قوت سے اس کی مذمت کی۔ مسلمانوں کو اس کی ضرورت کا یقین ہوتا گیا۔ کانگریس کی مخالفانہ مہم کے باوجود حصول پاکستان کی تحریک مسلمانوں کی زندگی کا مقصد بنتی چلی گئی۔ ان کا یہ مطالبہ کسی مادی منفعت، حصول دولت، وزارت اور عہدے کے لالچ کے لئے نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے سواد اعظم کو بحیثیت مجموعی اسلام کا احیاء، سربلندی اور شریعت کا نفاذ رہا۔ ان کے یہ عزائم اور جذبات مختلف کتابوں کے ذریعے عام ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں متعدد کتابیں تحریر ہوئیں جنھوں نے تحریک پاکستان کو زیادہ مقبولیت بخشی اور غلط فہمیوں اور الزامات کو دور کرنے کا سبب ہوئیں۔

تحریک پاکستان کے دوران اس کے مقصد کو عام کرنے اور اس کے نصب العین کو مقبولیت دینے میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی کا تصنیفی کام بڑا وقیع اور قابل قدر ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں کئی کتابیں تحریر کیں۔ "تشریحات پاکستان" تحریک پاکستان سے متعلق گراں قدر اور معلومات افزا کتاب ہے۔ اس میں مسئلہ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر اس تحریک سے متعلقہ زعماء کے خیالات پیش کئے گئے۔ "پاکستان سے پہلے اور پاکستان کے بعد "عنوانات کے تحت مصنف نے پاکستان کی تاریخ اور اس کے پس منظر کا جائزہ لیا تھا۔ علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد کے اقتباسات درج کئے گئے اور مختلف پہلوؤں سے پاکستان کا امکانی جائزہ لیا گیا۔ اس کے لئے چند خاکے، تجاویز اور خیالات جمع کیے گئے تھے۔ مختلف شبہات اور الزامات کی تردید مدلل اور مفصل طریقے پر کی گئی تھی یہ کتاب حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ "پاکستان اور ہندوستان" بھی مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی تصنیف ہے۔ یہ بھی حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں برعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جو انھوں نے انگریزوں کے خلاف کی تھی۔ مسلمانوں کی علیحدہ قومیت اور مسلم حقوق کا جائزہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس میں مصنف نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہر اعتبار سے حتیٰ کہ سیاسی جدوجہد کی ابتداء کو

تحریک پاکستان کی ابتداء ثابت کیا ہے۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی ایک اور کتاب "معاشیات پاکستان" برطانوی ہند میں مسلمانوں کا حال، مطالعہ پاکستان کا پس منظر اور مستقبل کے پاکستان کی متوقع معاشی صورتحال پر بحث و تمحیص سے متعلق ہے۔ اس میں مطالبہ پاکستان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا کہ انگریزوں نے اپنے انتظامی مصالح کے لئے برعظیم کو ایک وحدانی حکومت کے ماتحت رکھا، جو کبھی ایک ملک نہ تھا اور نہ کبھی ایک حکومت کے ماتحت رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی و مغربی حصے جو خالص زراعتی حصے ہیں مرکز کی غلامی میں رہ کر مفلس ہوتے گئے ۔ ان علاقوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی آباد ہے جن کا مذہب، تہذیب، روایات، نظریہ حیات دوسرے حصے کی کثیر آبادی سے مختلف ہے اسلئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے مشرقی اور شمال مغربی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، الگ اور بااختیار ہوں۔ جنھیں کسی مرکز کی غلامی پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء میں دو مرتبہ شائع ہوئی۔

'جداگانہ انتخاب سے پاکستان تک' مظہر علی اظہر نے تحریر کی تھی۔ لاہور سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ برعظیم کے مسلمانوں کو اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کو بیان کرتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو علیحدہ قوم تصور کیا ہے، اس لئے انھوں نے اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد ایک مرحلے پر جداگانہ انتخاب کے لیے اور پھر پاکستان کے حصول کے لئے کی ہے۔ مولانا ظفر احمد خان انصاری مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے پاکستان کی اہمیت اور ضرورت پر "پاکستان اور مسلمان" تحریر و ترجمہ کی۔ اس میں مذہبی و تہذیبی پہلوؤں سے ایک آزاد اسلامی ریاست کے مطالبے کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ عبدالمجید پاک نے "پاکستان، قومی تحریک" تصنیف کی تھی۔ اس میں تحریک پاکستان کو مسلمانوں کی ملی اور مذہبی تحریک اور اس بناء پر مسلمانوں کے لئے اس میں شرکت اور جدوجہد فرض قرار دیا۔ یہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ انیس الدین رضوی نے "تحریک پاکستان" تحریر کی تھی۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مصنف نے برعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی مختصر تاریخ پیش کی۔ سیاسی حقوق اور اسلامی قومیت کے شعور و ارتقاء کو انھوں نے تحریک پاکستان قرار دیا۔ پاکستان کے مفہوم، نظریہ اور اس کے مطالبے کی وضاحت عبدالعزیز نے اپنی کتاب "پاکستان" میں کی۔ جو بمبئی سے طبع ہوئی تھی۔ فطرت حیدری نے "پاکستان

کیوں؟" تحریر کی تھی۔ جو بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے قیام پاکستان کے اسباب، ضرورت اور اہمیت بیان کی تھی۔ محمد عبدالرحمٰن ناطق نے "منزل پاکستان" تحریر کی۔ یہ قرارداد پاکستان کے بعد پاکستان کے لئے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد، کانگریس اور ہندوؤں کے مخالفانہ رویوں سے بحث کرتی ہے۔ یہ بمبئی سے جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ "اسلامی حکومت کی عملی تشکیل" سعید حلیم پاشا نے تحریر کی۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ "نعرۂ حق" جو لاہور سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی، اسی موضوع پر ایک تصنیف تھی۔ اسے ابوسعید انور نے تحریر کیا تھا۔ پاکستان کے مختلف تصورات پر مبنی ایک کتاب شاہین فاروقی نے "تصورات پاکستان" مرتب کی تھی۔ جس میں مختلف تصورات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ حاجی لق لق نے "جناح اور پاکستان میں قائداعظم کی جدوجہد" اور "تحریک پاکستان" پر بھی اپنے خیالات ظاہر کئے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت لاہور سے ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی۔ 'حلیف پاکستان' بھی اسی موضوع پر امین کاشمیری کی تصنیف تھی، جو لاہور سے شائع ہوئی۔

پاکستان پر کتابوں کے سلسلے میں ایک اور اہم مفید کتاب "صرف پاکستان" کے نام سے کسی گم نام مصنف "ایک طیلسان" (جامعہ عثمانیہ) نے تحریر کی تھی۔ یہ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد دکن سے طبع ہوئی۔ مصنف نے اس میں تحریک پاکستان کے متعلق، اس ابتدائی دور ہی میں ضروری معلومات سلیقے کے ساتھ یکجا کر دی تھیں۔ یہ کتاب پاکستان کے مفہوم، مطلب اور تشریح کے جملہ مسائل اور تمام امور پر حاوی ہے۔ اس میں صرف خیالات ہی پیش نہیں کئے گئے۔ بلکہ ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی پاکستان پر دیگر لکھی ہوئی کتابوں کے مقابلے میں یہ زیادہ سلیقے سے مرتب کی گئی تھی۔ اس میں پانچ ابواب ہیں۔ باب اول میں مسلمانوں کے قومی وطن کی تحریک کو پیش کیا گیا ہے۔ قومی وطن، مسلمانوں کے مسائل کے حل اور تقسیم ہند کے لئے پیش کردہ تجاویز کا تنقیدی جائزہ دوسرے باب کا موضوع ہے۔ تیسرے بات میں قرارداد پاکستان اور اس کے مضمرات پر بحث کی گئی ہے۔ باب چہارم میں اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ اور باب پنجم دستوری صورتحال کی وضاحت کرتا ہے۔ اس میں مشورہ دیا گیا ہے کہ آئندہ دستور کو پاکستان کے اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ پاکستان پر ایک جامع کتاب "پاکستان" عبادت یارخان کے ساتھ پاکستان کا پس منظر اسکی تحریک اور ضرورت ہے۔ اس میں پاکستان کے مطالبے کا مقصد اور مدعا

سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر اس سلسلے میں مختلف تجاویز اور تصورات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ جو پاکستان اور مطالبہ پاکستان کے لئے پیش کئے گئے تھے۔ تحریک کے زمانے میں جو مختلف شکوک وشبہات اور سوالات ذہنوں میں پیدا ہورہے تھے اور جو اندیشے مخالفین کی جانب سے ظاہر کیے جارہے تھے، ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ "پاکستان کیونکر حاصل ہوگا؟" عنوان کے تحت مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں میں عزم وعمل کا جذبہ پیدا کرنے اور انہیں حصول پاکستان کی جدوجہد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر شجاع احمد ناموس نے پاکستان پر ایک مفصل اور جامع کتاب "آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان" تحریر کی ہے۔ یہ لاہور سے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں دو مرتبہ شائع ہوئی۔ مصنف نے اس میں بڑی تفصیل، وضاحت اور دلائل کے ساتھ مختلف قومی، سیاسی اور مذہبی مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں قوم اور قومیت کا مفہوم اور اس کے عناصر بیان کئے گئے ہیں۔ ہندو تہذیب اور اسلامی تہذیب کے اختلافات بیان کئے گئے اور ایک ہندوستانی قومیت کی تردید کی گئی ہے۔ قومیت کے عناصر کی بنا پر ہندوستان کی تقسیم کی گئی ہے۔ ہندوؤں کی قومی تحریک کانگریس کے تحت اور مسلمانوں کی ملی تحریک، علیگڑھ تحریک اور مسلم لیگ کے تحت بیان کی گئی ہے۔

ان دونوں تحریکوں کے اختلافات قرارداد پاکستان کے وقت تک دکھائے گئے ہیں۔ پھر کانگریس راج کی تاریخ، ہندوؤں کے مقاصد، سیاسی فریب کاریاں، اکھنڈ بھارت کے عزائم پیش کئے ہیں۔ آخر میں ملت کی ترقی کے اسباب اور پاکستان کی تشکیل کا نظریہ اور پھر آزاد ملک اور آزاد ملت ہونے کی حیثیت میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ "دستور پاکستان" محمد اسمعیل مسلم نے مرتب کیا تھا۔ یہ رباط، اسلامی کلکتہ کے زیر اہتمام ۱۳۶۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ دستور دراصل مسلمانوں کے لئے وہ منشور تھا جس پر حصول پاکستان کے بعد انہیں عمل پیرا ہونا تھا۔ پاکستان کے بارے میں محمد اسماعیل مسلم کا یہ ایک تصوراتی خاکہ تھا۔ اس میں مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور روحانی ترقی پر زور دیا گیا تھا۔ تحریک پاکستان کے تعلق سے اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی متعدد کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ بعض اہم اور وقیع کتابوں کے تراجم اردو میں بھی ہوئے تھے۔ آر۔ ٹی۔ ایم کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ "ہندوستان میں قومیت کا تصادم" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مضامین کا مجموعہ تھا۔ اس میں بحیثیت مجموعی نظریہ قومیت سے بحث کی گئی تھی اور متحدہ قومیت کے نظریہ کی تردید کر کے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت پر دلائل دیئے

گئے تھے۔ دوسری کتاب موضوع کے اعتبار سے اہم تھی۔ اس کا ترجمہ "پاکستان اور اسلامی ہند" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کا مقدمہ قائداعظم محمد علی جناح نے تحریر کیا تھا۔ مصنف نے اس میں نہایت غیر جانبدارانہ طور پر متعدد ایسے عوامل کی توضیح کی ہے جن سے برعظیم کے آئینی مسائل کا واحد حل ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں نکلتا ہے اور اس کی بہترین شکل یہی ہے کہ قرارداد پاکستان کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں 'قرارداد پاکستان' کی تائید کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مجوزہ پاکستانی ریاستوں کے مسائل، اقلیت، ان کے حدود اربعہ کی جدید ترتیب اور اقتصادی حالات سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو راجندر پرشاد، سرتیج بہادر سپرو، رادھا کرشن اور آر این سرکار کی جانب سے کئے گئے تھے۔ ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی کی اس سلسلے میں ایک کتاب کا اردو میں ترجمہ تسکین علیگ نے "پاکستان پر ایک نظر" کے نام سے کیا۔ جو بمبئی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ مصنف نے اس میں حقائق اور اعداد و شمار پیش کر کے پاکستان کے امکانی وجود کو حقیقت ثابت کرنے کی پیشکش کی ہے۔ اس میں تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کبھی ایک وحدت نہیں رہا۔ ہندوستان میں دو بڑی قومیں آباد ہیں۔ اس لیے اس کی تقسیم غیر فطری نہیں۔

جو کتابیں برصغیر کے مسلمانوں کے مختلف قومی اور سیاسی مسائل پر لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر کتابوں میں مسلمانوں کے ملی اور قومی مسائل کے حل کے لئے تقسیم ملک اور حصول پاکستان کو ناگزیر قرار دیا گیا تھا۔ یہ کتابیں دیگر مسائل کے حل پر تجاویز کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن ان میں پاکستان کے حصول کی ضرورت اور اہمیت کو کسی نہ کسی پہلو سے تسلیم کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں دوسرے زعماء نے بھی تقسیم ملک اور قیام پاکستان کو نصب العین قرار دیا۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئی تھیں۔ ان میں تقسیم ہند کے نظریہ کو زیادہ وضاحت، تفصیل، پس منظر اور دلائل کے علاوہ مختلف تجاویز کے ساتھ پیش کیا۔

پاکستان کی مخالفت میں بھی کتابیں تحریر کی گئیں۔ جن کا مقصد کانگریس کے مقاصد کو تقویت پہنچانا تھا۔ ان کتب میں تذبذب، تشکیک، فطرت اور مطالبے کی نامعقولیت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے "پاکستان" لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ لاہور سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ روشن داس نے اردو میں

"اکھنڈ بھارت" تحریر کی۔ اس کا مقدمہ مشہور انتہا پرست رہنما ڈاکٹر شیام پرشیا مکر جی نے لکھا تھا۔ یہ دونوں کتابیں ہندو ذہنیت اور ان کے عزائم کا بھرپور اظہار کرتی ہیں۔ بعض مسلمانوں نے بھی شبہات اور خدشات کا اظہار کیا تھا جیسے طفیل احمد منگلوری نے "روح روشن مستقبل" کے ایک تفصیلی باب میں پاکستان کی تحریک اور اسکے مطالبے کا جائزہ لیا تھا۔ انھوں نے قیام پاکستان کو ناممکن اور مسلمانوں کے لئے اس کے حصول کی تحریک میں شمولیت کو ضرررساں قرار دیا۔ چودھری افضل حق نے اپنی ایک انگریزی تصنیف میں اس امر پر زور دیا تھا کہ حصول پاکستان کی جدوجہد سے قبل ملک کی دولت کی مساوی تقسیم ہونی چاہیے۔ چھوت چھات کا خاتمہ ہو۔ ہر مذہب کا احترام اور شریعت کے مطابق رہنے کی مکمل آزادی ہو، آزادی کے حصول کے بعد اگر یہ چیزیں حاصل نہ ہوسکیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "پاکستان اور اچھوت" کے نام سے اکرام قمر نے کیا، جو لاہور سے شائع ہوئی۔[۱۲۲] غرض اردو نثر میں بیسویں صدی عیسوی میں دوقومی نظریے، ہندو قومیت، مسلم قومیت اور متحدہ قومیت سے بحث کی گئی۔ اس سے قیام پاکستان کی تحریک کو تقویت حاصل ہوئی اور یہ عوامی امنگوں کی ترجمان قرار پائی۔

باب سوم

ملت اسلامیہ کی بنیاد قرآن وسنت پر قائم ہے

باب سوم

ملت اسلامیہ کی بنیاد قرآن وسنت پر قائم ہے

علیحدہ مملکت، ایک آزاد ریاست ہر قوم کی خواہش ہوتی ہے۔ تاکہ متعدد قومی ضرورتوں کی تکمیل کو ممکن بنایا جا سکے جن کی تکمیل قومی حکومت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اجنبی حکومت کے ماتحت کوئی قوم "شہری حقوق" کی نعمتوں سے کتنی ہی مالا مال ہو اور اسے خیال وعمل اور گفتار و کردار کی کتنی ہی آزادی نصیب ہو، پھر بھی وہ اپنے قومی نصب العین کے تمام اجزاء کو اس وقت تک مکمل نہیں کر سکتی جب تک خود اس کے ہاتھ میں حکومت خود اختیاری کی عنان ہو اور وہ خود اپنی فکر وفہم اور اعتقاد وایمان کے مطابق اپنے عمل کو بجالانے میں کامل آزاد نہ ہو۔[1]

برصغیر، پاک و ہند میں مسلم آبادی کو سولھویں صدی عیسوی میں اپنی بقاء کے لیے اکثریتی گروہ سے جو نظریاتی سطح پر مزاحم ہونا پڑا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ایوان حکومت میں خالصتاً مسلمانوں کی نمائندگی نہ تھی۔ کیونکہ ایک ایسا ملک جہاں مختلف النوع مذاہب موجود تھے۔ وہاں اسلام کے بنیادی عقائد سے ان کا کس حد تک اختلاف تھا اور ان بنیادی عقائد پر عمل پیرا ہونا کتنا مشکل تھا۔

برصغیر میں جہاں بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں وہاں ان کا رجحان اپنی ملت کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی طرف تھا۔[2] ہندومت میں دوسرے مذاہب کو جذب کرنے کی جو زبردست صلاحیتیں تھیں۔ ان کے پیش نظر برصغیر کے مسلمانوں نے ہمیشہ مقامی آبادی میں ضم ہونے سے شدت سے انکار کیا اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے شعوری جدوجہد کی۔ انہوں نے اپنی ایک مستقل ہستی بنالی اور جداگانہ ثقافت اور معین اغراض ومقاصد کی تشکیل کی۔[3] محمد بن قاسم سے ابراہیم لودھی تک مقامی آبادی کو دربار میں اعلیٰ عہدے تفویض نہیں کیے گئے تھے۔ کیونکہ مسلم اقتدار کو ہندو سرداروں کے ایک طبقے نے قبول نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ یہ فراموش کر پائے تھے کہ مسلمانوں نے انھیں سیاسی اقتدار سے محروم کر دیا ہے۔ چنانچہ انھیں جب موقع ملتا وہ مسلم حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے تھے۔ ابتداً مسلم حکمرانوں نے ان بغاوتوں کا سختی کے ساتھ خاتمہ کیا۔ لیکن مغل حکمران جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں انھیں اہم حکومتی معاملات میں اغلب گروہ (مسلمانوں) کے برابر دربار میں مناصب

دیے گئے۔ جس نے برعظیم، پاک و ہند میں مسلم اقتدار کی دیواروں کو متزلزل کر دیا۔ اکبر کی پالیسیوں نے اسلام مخالف عناصر کو دین میں انحراف کرنے کا موقع دیا۔ اس کے ساتھ ہی بھگتی تحریک ۴ کو تقویت حاصل ہوئی۔ جس میں ہندوستان میں موجود دو بڑے مذاہب کے درمیان امتیاز ختم کرنے کی کوشش کی گئی اور اسلام اور ہندومت کو ایک درخت کی دو شاخوں سے تشبیہ دی گئی جن کی جڑ ایک ہے۔ اس صورتحال سے ہندوؤں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اکبر نے اپنی وسیع و بے کراں سلطنت کو قابو میں رکھنے کے لیے جو حکمت عملی اختیار کی۔ اس کے نتیجے میں مخالف عناصر نے اندرونی سازشوں کے ذریعے اسلام کو نقصان پہنچایا جو کامیابی میدان جنگ میں حاصل نہ کی جاسکی۔ اسے ان مخالف عناصر نے ایوان حکومت میں داخل ہو کر حاصل کیا اور اپنے مقاصد کو کماحقہ' پورا کیا۔ شہنشاہ اکبر ابتدائے عمر ہی سے ہندوؤں سے قریب تھا۔ ۵ راجپوتوں نے اپنی بیٹیاں مغل بادشاہ کے حرم میں دیں تو اس قربانی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اکبر کو ذہنی، فکری اور عملی طور پر اپنے تابع کر لیں۔ اس طرح ہندو راجپوت جو تین صدی تک مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے تھے، اب انھوں نے مسلم حکمران کا دوست و مددگار بن کر حکومت کی پالیسی کو اپنے معیار کے مطابق تبدیل کر دیا اور ثقافت و کلچر کے دائرے میں اسلام کی انفرادیت کو نہ صرف مجروح کیا بلکہ ایسے رسوم و رواج کی بنیاد رکھوادی جو اسلام کی ضد تھے۔ اس طرح وہ مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اسلام کی راہ میں مزاحم ہوا اور ہندوستان میں متحدہ کلچر اور تہذیب و تمدن قائم کرنے کی کوشش کی۔ جس کی روح خالص ہندوانہ تھی۔ اس کے نتیجہ میں ہندو اثرات غالب ہونے لگے۔ اسلامی نظریہء حیات اور تصور کی جگہ ایک نئے تصور حیات نے جنم لیا۔ ۶ اکبر نے کبیر اور نانک کی طرح صلح کل کی حکمت عملی اختیار کی اور ہندوستان کو ایک سیکولر اسٹیٹ بنانے کی کوشش میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ شعائر و فرائض اسلامی کو ممنوع قرار دیا اور اپنے ان خیالات کا اثر براہ راست عوام پر بھی ڈالا۔ ۷ ملاّ عبدالقادر بدایونی ۸ اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی پر لکھتا ہے کہ:

"اکبر نے ہندوستان کو ایک ایسی سرزمین بنا دیا تھا، جہاں پر جو جس کا جی چاہے، وہ کرتا پھرتا تھا" ۹

اکبر نے رعایا کے مابین مذہبی اختلافات کو فرو کرنے کے لیے اسلام، ہندوازم اور عیسائیت پر مشتمل ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ جس کو دین الٰہی یا توحید الٰہی کا نام دیا گیا۔[10] گویا اکبر نے رعایا کے درمیان مذہبی اختلاف کی جڑ کو ہی اکھاڑ پھینکا۔ مگر حقیقت میں اس نے ہندوستان میں اسلام کی برتری وتفوق کو ختم کر کے لادینی مملکت میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہندوؤں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ وہ علی الاعلان مسلمانوں پر چیرہ دستی کرنے لگے۔ مسجدیں مسمار کی گئیں۔ غیر اسلامی رسم ورواج کو فروغ حاصل ہوا۔ مندر کثرت سے تعمیر کیے گئے۔ مسلمانوں کی اتنی توہین وتذلیل کی گئی کہ مسلمان عورتوں کو ہندوؤں نے اپنے حرم میں داخل کیا۔ مسلمان بے بس تھے اور باوجود مسلم حکومت کے ان کی اقدار مجروح و پامال ہو رہی تھیں۔ حالات اس قدر نامساعد تھے کہ اکبری الحاد اور فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے حضرت خواجہ باقی باللہ[11] نے بادشاہی بدعت اور تجدد کو روکنے کے لیے ارباب فیض، دربار شاہی اور ارباب اقتدار سے خاص طور پر ربط وضبط پیدا کرنے پر زور دیا۔[12] آپ نے برصغیر کے اندر احیائے اسلام میں اہم کردار ادا کیا۔[13] خواجہ باقی باللہ کی ایک روایت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی کے مکتوب میں موجود ہے:

> اگر ما شیخی مے کردیم۔ دریں روزگار ہیچ شیخ مریدغی یافت لیکن مدا کار دیگر فرمودہ اند کہ مسلمانان را از شر ظلم نگاہداریم بواسطہء ایں بیادشاہاں بانیست اختلاط کردن ونفوس ایشار امسخر گردانیدن ومیتوسط ایں عمل مقصود مسلمین برآوردن۔ ص ۱۲۷

ترجمہ:

> اگر ہم اپنی مسند مشیخت سجاتے تو اس زمانہ میں کسی اور شیخ کا کوئی مرید دستیاب نہ ہوتا۔ لیکن اللہ نے ہمارے ذمہ تو ایک دوسرا ہی کام لگا رکھا ہے کہ ہم مسلمانوں کو ظلم وفساد سے محفوظ رکھیں۔ اس غرض کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ امراء اور بادشاہوں سے ربط وضبط پیدا کریں اور ران کے ذہنوں کو متاثر کریں۔ اس طرح مسلمانوں کے دلی مقصود کی تکمیل کریں۔

حضرت خواجہ باقی باللہ نے اس اصول پر سختی سے عمل کیا اور آپ کی روحانی پاکیزگی اور سربلندی سے اکبر کے اراکین سلطنت بخشی الملک شیخ فرید، قلیچ خان حاکم پنجاب، خان اعظم کوکہ، امیر الامراء مرزا عبدالرحیم خان خاناں سپہ سالار دکن، صدر الصدور صدر جہاں اور ابوالفضل کا بہنوئی خواجہ حسام الدین آپ کے معتقد ہو گئے تھے۔ ۱۴ آپ نے درباری بدعتوں کے خلاف متشرع اور دیندار امرا کا محاذ قائم کیا۔ ۱۵ علماء و مشائخ میں حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی قابل ذکر ہیں۔ اس طرح انہوں نے ملک میں اسلامی روحانیت کی ایک زبردست لہر دوڑا دی۔ ۱۶ آپ نے مسلم تہذیب و تمدن کو بچانے کے لیے جس جدوجہد کا آغاز کیا اور منتشر و پراگندہ قوتوں کو یکجا کر دیا۔ احیائے دین کی اس کوشش کو آپ کے مرید خاص شیخ احمد سرہندی نے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ۱۷ مجدد الف ثانی نے تاریخ اسلام کے دوسرے ہزار سالہ عہد کے آغاز میں اسلامی تعلیمات کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک کر کے اصلی رنگ میں دوبارہ جاری کیا۔ ۱۸ انہوں نے اسلامی نظریات کو ان کی حقانیت کے ساتھ محفوظ رکھنے کے لیے غلط عقائد و نظریات کے خلاف سب سے پہلے جدوجہد کا آغاز کیا۔ ۱۹ ان کی تحریک احیائے عقائد کی نوعیت سیاسی تھی۔ اس کے ذریعہ انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان امتیاز کیا جو تصوف کی غیر اسلامی صورتوں کے باعث مٹنے لگا تھا۔ اکبر کی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوؤں اور ان کی تہذیب سے مسلم معاشرہ کی سالمیت کو جو خطرہ لاحق تھا، اس کی نشاندہی کی۔ ان کی تحریک احیائے عقائد کا اہم مقصد یہی تھا کہ اسلامی تعلیمات کو ہندو مت کے ساتھ اشتراک سے روکیں۔ ۲۰ شیخ احمد سرہندی نے دیگر علماء و صوفیا کے برعکس دیگر مذاہب سے اسلام کی انفرادیت کو برقرار رکھنے پر شدید اصرار کیا۔ ان کے خطوط غیر مسلموں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کثرت سے کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان اسلامی حکومت کے دور میں احکام اسلامی پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔

> "اکبر کے زمانے میں کفار برملا اور غلبے کے طور پر کفر کے احکام دارالاسلام میں جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام کے اظہار سے عاجز تھے اور کر بیٹھتے تھے، تو قتل کر دیے جاتے تھے واویلا! واخزناہ! وامصیبتاہ! محمد ﷺ کے محبوب رب العالمین ہیں، آپ کی تصدیق کرنے

والے ذلیل وخوار تھے اور آپ کے انکار کرنے والوں کی عزت ہوتی تھی۔ انہی کا اعتبار تھا۔ مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی تعزیت میں مشغول اور کفار ان کا مذاق اڑا کر ان کے زخموں پر نمک چھڑکا کرتے تھے۔ آفتاب ہدایت گمراہی کے پردے میں چھپ گیا تھا اور حق کا نور باطل کے حجابوں میں سمٹ گیا تھا۔"۲۱

ہندو مسلم اتحاد کو شیخ احمد سرہندی نے ناممکن قرار دیا۔ اور ہندو مسلم اختلافات کا حل ہمسایانہ رواداری (Neighbourly Co-existence) قرار دیا۔۲۲ کیونکہ مسلم معاشروں میں اقلیتوں کے ساتھ مذہبی رواداری اور انصاف تو موجود ہے لیکن مذہب پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہے۔ اسی لئے شیخ احمد سرہندی نے بھی اس پر زور دیا۔ اس طرح آپ نے سیاسی سطح پر پہلی بار دو قومی نظریہ کو پیش کیا۔ آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کی نفی کو سعی لاحاصل اور خرابیوں کا پیش خیمہ قرار دیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لیے خطرہ عظیم محسوس کیا۔۲۳ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں آزاد خیالی اور رواداری کی عمومی فضا اگرچہ قائم رہی لیکن مذہب پرست امراکے اثر ورسوخ میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔۲۴

عقائد کے اعتبار سے دارالشکوہ اکبر کا ہمنوا تھا۔ اگر اسے اقتدار حاصل ہو جاتا تو یہ اکبر سے بڑھ کر ثابت ہوتا۔ یہ ہندومت اور اسلام کے بالکل ایک ہونے پر پکا یقین رکھتا تھا اور اس نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔۲۵ اس نے مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کے عقائد پر ایک کتاب "مجمع البحرین" لکھی۔ جس میں صفات الٰہی، نبوت، ولایت اور عالم برزخ وغیرہ کے متعلق خیالات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔۲۶ اس کی ایک اور اہم کتاب "سرِّ اکبر" تھی۔ جس میں اپنشدوں کے قریباً پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ دارالشکوہ مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کا رہنما تھا جو تصوف اور ویدانت میں دونوں قوموں کے لیے ایک مشترک روحانی مطمع نظر تلاش کر رہے تھے۔۲۷ اس کے مقابلے میں راسخ العقیدہ طبقے کی امیدیں اورنگ زیب عالمگیر سے وابستہ تھیں۔ اورنگ زیب عالمگیر نے شیخ احمد سرہندی کی راہ اختیار کی۔ اکبر کے پیدا کردہ فتنے کی وجہ سے راسخ العقیدگی کو سلطنت میں دوبارہ جگہ دینا، دقت طلب تھا۔ مخالف عناصر اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ ان کو

برتری کے مقامات سے ہٹانا کوئی آسان کام نہ تھا۔لیکن اورنگ زیب عالمگیر جیسا لائق حکمران جس میں شہیدوں کا ساجوش عقیدت موجود تھا۔۲۸ برسر اقتدار آ کر نہ صرف اس نے سلطنت کو استحکام بخشا بلکہ قومیت کو بھی تشخص آشنا کیا۔اس نے مشکلات سے پامردی سے مقابلہ کیا اور اخلاقی انحطاط کو روکنے اور اسلام کی غیر اسلامی روائد سے پاک رکھنے کی کوششیں کیں۔۲۹

اٹھارویں صدی عیسوی کے ابتداء ہی میں مغلوں کی حکمرانی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور صرف اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے پچاس (۵۰) سال بعد بنگال جو سب سے زرخیز صوبہ تھا اس کے نواب کو شکست دے کر اس کی حکومت اور وسائل پر قبضہ کرلیا۔ایک سو سال کے بعد آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بغاوت کا الزام لگا کر رنگون جلاوطن کر دیا گیا۔اورنگزیب کی وفات کے بعد ہندوؤں کی مختلف قوتیں ابھر کر سامنے آ گئیں۔سرہند سے جس تجدیدی تحریک کا آغاز ہوا، اب اس نے اصلاحی شکل اختیار کرلی۔قوم کی زبوں حالی نے شاہ ولی اللہ۳۰ کو جنم دیا۔

شاہ ولی اللہ ایک متبحر عالم تھے۔جنہیں قدرت نے حکیمانہ بصیرت اور ہمہ گیر ذہن عطا کیا تھا۔انہوں نے اٹھارویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا جائزہ لیا۔ان کے ذہن میں بہت جلد یہ بات آ گئی کہ انھیں ایک انتہائی مسئلہ درپیش ہے۔سلطنت کا زوال، معاشرتی نظام کی فرسودگی کا نتیجہ تھا۔۳۱ جو اس معاشرے کی اخلاقی تباہی کا باعث ہوا۔جو خود غرضانہ کوتاہ بینی سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔اس لیے اخلاقی احیاء کی تحریک کا اجراء اس وقت کی بنیادی ضرورت تھی۔مگر اس کے لیے وقت درکار تھا اور اس کی شدید ضرورت تھی کہ اسے فوری خطرات سے بچایا جائے۔ یہ شعوری احساس دہلی پر نادر شاہ کے حملے اور ہندوؤں کے مختلف فرقوں کی غارت گری سے اور زیادہ بڑھ گیا۔شاہ ولی اللہ نے ملت میں اتحاد کے احساس کو بحال کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا جو بہت سی اندرونی آویزشوں کے باعث شکستہ ہو گیا تھا۔وقت کا تقاضا یہی تھا کہ ایسے نظام حکومت کی تعمیر کی جائے جو صحیح نظریات کا حامل ہو۔وہ اس مقصد کے لیے ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو اس ارتجاعی نظام کو ختم کر کے عادلانہ نظام قائم کرے۔۳۲ آپ کے انقلابی نظریہ کا عنوان " فک کل نظام " ہر بوسیدہ نظام کا خاتمہ تھا۔ اس کے لیے آپ حسب ضرورت جہاد کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔کیونکہ معاشرے میں ایسے معاشی اور سماجی عناصر بھی

داخل ہو گئے تھے جوامت کے مجتمع کرنے کے درپے تھے۔ جس کی وجہ سے اسلامی اخوت لازماً ایک حقیقت ثانیہ بن گئی تھی۔ ۳۳ے لیکن اسکے باوجود ملی احساس دوردراز کے علاقوں اور نوآبادیوں میں موجود تھا۔

شاہ ولی اللہ نے عدم توازن کو انحطاط کا باعث قرار دیا۔ مسلمانوں میں ایک کثیر التعداد طبقہ دست کاروں، تاجروں اور تھوک پیداوار کرنے والوں کا تھا۔ صدیوں میں جو معاشی نظام قائم ہوا تھا۔ اسے نراجیت نے منتشر اور درہم برہم کردیا اور ایسے عناصر پیدا کردیے جو عوام سے سخت مشقت کے عوض اس کے معاوضے میں انھیں کچھ نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے کسانوں، دست کاروں کی معاشی فلاح و بہبود پرزور دیا کیونکہ اس زمانے میں صحت مند معاشیات کی بنیاد یہی تھی۔ ۳۴ے محاصل کا نظام ظلم کا ذریعہ بن گیا۔ سیاسی رہنما اپنی ذمہ داریوں سے منحرف ہو گئے تھے۔ مرکز کے ضعف کے باعث جو علاقے خود مختار ہو گئے تھے۔ وہاں امراء نے چھوٹی چھوٹی جابرانہ حکومتیں قائم کر رکھی تھیں۔ جس سے استحصال بالجبر کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ شاہ ولی اللہ کی حقیقی عظمت اس بنا پر ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے انحطاط کے بنیادی اسباب پر غور کیا اور ان کا علاج معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ۳۵ے چنانچہ انہوں نے اصلاح کے لیے مرکز دہلی کو منتخب کیا جو مسلم ہندوستان کا خاص شہر سمجھا جاتا تھا۔ اپنی جدوجہد کے آغاز میں انہوں نے بادشاہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ ناکام رہے۔ پھر انہوں نے امراء کو منعطف کیا، مگر امرا کسی سنجیدہ مشورے کو سننے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔ ۳۶ے شاہ ولی اللہ نے ملت کے استحکام کے لیے راسخ العقیدہ طبقے کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ ان کی مذہبی مخاصمت کے باعث ان کی مدد حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے احمد شاہ ابدالی سے مدد کی درخواست کی۔ جنہوں نے پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کو شکست دی۔ پانی پت میں مسلم افواج کی فتح شاہ ولی اللہ کی سیاسی جدوجہد کے مختصر المیعاد لائحہ عمل کی معراج تھی، کیونکہ اگلے سال ۱۷۶۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۳۷ے مگر یہ فتح وقتی ثابت ہوئی اور وہ ثمرات حاصل نہیں ہو سکے جن کی امید کی جاسکتی تھی۔ کیونکہ بے صلاحیت قائدین مستقبل میں آنے والے چیلنجوں کا ادراک نہیں کر سکے۔ جس کی وجہ سے بہت جلد ایسٹ انڈیا کمپنی پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ۳۸ے ان کا خیال تھا کہ برعظیم کے مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کا بنیادی سبب خود اسلام سے ناواقفیت ہے۔ جبکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات قرآن میں ہیں۔ اس لیے انہوں نے قرآن کا فارسی

زبان میں ترجمہ کیا، جواس وقت کی مقبول زبان تھی۔ اس کا نام "فتح الرحمان" رکھا۔ اس سے آپ کا مقصد قرآن فہمی کو عام کرنا تھا۔ انہوں نے "تفسیر الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں قرآن کے اصول وضع کیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ اخلاقی اصولوں سے لاپرواہ ہو جائیں۔ [۳۹] شاہ ولی اللہ نے ہندوستان میں علم حدیث کو رواج دیا۔ اس سے پہلے علم حدیث کو ہندوستان میں کوئی وقعت حاصل نہ تھی۔ آپ کے فیض سے ہندوستان میں اس فن کو بڑی ترقی حاصل ہوئی اور ہندوستانی مسلمانوں میں علم حدیث اور تفسیر سے دلچسپی بڑھی۔ [۴۰]

شاہ ولی اللہ کے نزدیک مسلم معاشرے کی صحت کا تقاضا یہی تھا کہ اسلامی اصولوں اور قدروں کو ان کی خالص پاکیزگی کے ساتھ قائم رکھا جائے اور خارجی اثرات سے پاک رکھا جائے۔ وہ مسلمانوں کی علیحدہ ہستی کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ لباس میں بھی مقامی وضع قطع کو اختیار کرنے کے خلاف تھے۔ [۴۱] وہ برعظیم کے مسلمانوں کی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ملت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کے وجدان اور بلند اصولوں کا سرچشمہ اسلام اور ایک عالمی ملت کی اسلامی روایات ہی رہیں۔ [۴۲] شاہ ولی اللہ کے نزدیک اسلام کے اخلاقی پس منظر کے بغیر عمرانیات، معاشیات اور سیاسیات کے ذریعے انسانی زندگی کا بلند ترین مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے ایک اچھے اور صحت مند معاشرے کے لیے سیاسی اسلام کی روحانی اور اخلاقی قدروں پر زور دیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک قوم کی صحت کے لیے سیاسی اقتدار ناگزیر ہے۔ [۴۳] اس کے لیے انہوں نے خالص اسلامی رسوم وعقائد پر زور دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سیاسی انحطاط کے جز کو نہیں روک سکے، مگر انہوں نے ان میں اخلاقی شعور کو بیدار کیا تاکہ وہ اپنے عقائد کی پاکیزگی کو برقرار رکھ سکیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس کا بندوبست کرنا ضروری ہے کہ ان کی وفات کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کی اخلاقی وسیاسی نشاۃ الثانیہ کا لائحہ عمل جاری رہ سکے۔ اس لیے انہوں نے ایسے علماء کی ایک جماعت تیار کی جو ان کے نظریات سے بخوبی واقف تھے اور ان ہی کے بلند اصولوں سے متاثر وفیض یاب تھے۔ [۴۴] شاہ ولی اللہ کے بعد آپ کی اصلاحی تحریک کو آپ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز اور تلامذہ نے آگے بڑھایا اور آپ کی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا، جن کا اسلوب عام فہم تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے "فتح الرحمان" کو عام فہم بنانے کے لیے "فتح العزیز" لکھی۔ جو اس دور کی مقبول تصنیف تھی۔

شاہ ولی اللہ کی متعدد کتب کا ترجمہ اردو میں کیا گیا۔ اس سے ذخیرہ اردو میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور ان کی تعلیمات سے مسلمان سیاسی و تہذیبی سطح پر متاثر ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کا رسالہ "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کا ترجمہ مولانا رشید احمد انصاری نے کیا اور یہ ۱۹۱۴ء میں مطبع علی گڑھ سے شائع ہوا۔ حجۃ اللہ البالغہ اسرار دین پر آپ کی بہترین تصنیف ہے۔ جس میں انسان کی دینی زندگی، تمدنی زندگی کے مدارج اور سیاست ملی پر بحث کی گئی ہے۔ یہ اصل کتاب عربی زبان میں تھی اس کا بھی اردو زبان میں ترجمہ ہوا۔ "ازالۃ الخلفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں عہد خلافت راشدہ میں اسلامی فکر کے ارتقاء اور سیاسی تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ ۱۲۸٦ھ/۱۸٦۹ء میں مطبع صدیقی سے شائع ہوئی۔ "انصاف فی سبب الاختلاف" فقہ سے متعلق تھی۔ یہ عربی رسالہ معہ اردو ترجمہ مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی نے ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع کیا۔ "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" ہندوستان میں موجود صوفیاء کے سلسلے پر لکھی گئی ۱۲۹۱ھ میں مولوی خرم علی نے مطبع نظامی کانپور سے اردو ترجمہ اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے حاشیہ کے ساتھ شائع کی اور اس کا نام "شفاء العلیل" رکھا۔ اسی سلسلے کی ایک اور کتاب "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں سید ظہیر الدین نواسہ شاہ رفیع الدین دہلوی نے اردو ترجمہ کے ساتھ مطبع احمدی سے شائع کیا۔ مکتوبات فی مناقب امام بخاری و ابن تیمیہ مولوی عبدالرؤف جو کتب خانہ نزیریہ کے مہتمم تھے، نے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا۔ "سرور المحزون" حضور کی حیات طیبہ سے متعلق تھی۔ اس کے متعدد اردو ترجمے مختلف مکتبوں سے شائع ہوئے۔ "کنز المکنون" مولانا بخشی چشتی، مطبع ستارہ ہند دہلی سے ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۳ء میں ہوا۔ "الذکر المیمون" مولانا عاشق الہی، فتح پرنٹنگ ورکس دہلی سے شائع ہوا اور "قرۃ العیون" نواب محمد وزیر خان کے حکم سے ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء سے تیار کیا گیا۔ یہ مطبع محمدی ٹونک سے شائع ہوا۔ "المقالۃ الوفیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ" "وصیت نامہ کے عنوان سے متعدد بار شائع ہوا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس کی شرح لکھی جو ۱۲٦۸ھ/۱۸۵۲ء میں مطبع مطبع الرحمٰن شاہ جہاں آباد سے شائع کیا گیا۔ ۴۵

شاہ عبدالعزیز نے تمام زندگی اپنے والد کے بلند اصولوں اور افکار و آراء کی نشر و اشاعت میں گزار دی، متعدد کتابیں لکھیں۔ جو شاہ ولی اللہ کے خیالات پر مبنی تھیں، ان کی زبان اتنی عام فہم تھی کہ انھیں اوسط درجے کی تعلیم کا آدمی بھی بہ آسانی سمجھ سکتا تھا۔ ۴٦ انہوں نے اپنے والد کی طرح درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے

بھائی اس سلسلے میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔۴۷ شاہ عبدالقادر نے قرآن کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ "موضح القرآن" کے نام سے کیا تا کہ جولوگ فارسی زبان سے نابلد ہیں وہ قرآن کے معنی اردوزبان میں سمجھ سکیں اور شاہ رفیع الدین نے اردو میں قرآن کا لفظی ترجمہ کیا۔۴۸ انہوں نے "اسرار المحبہ" اور "تکمیل الاذہان" بھی تصنیف کیں، جوشاہ ولی اللہ کے فلسفے کی شرحیں تھیں۔شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی باریکیوں کے مبسوط تعارف کے لیے، شاہ اسمٰعیل ۴۹ نے "عبقات" لکھی۔اس میں شیخ اکبراور مجددالف ثانی کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ کی حکمت کوفوقیت دی۔۵۰ انہوں نے شاہ عبدالعزیز سے شاہ ولی اللہ کا علم وفضل سیکھ کر جمہور میں عام کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔۵۱ شاہ اسماعیل کی اہم ترین کتاب "تقویت الایمان" ہے۔ جوانہوں نے اردوزبان میں تصنیف کی۔اس سلسلے پر متعدد کتب تصنیف کی گئیں۔جس نے ایک اچھا خاصا ادب مہیا کر دیا۔

شاہ ولی اللہ نے جن حالات میں اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تھا، ان کی نوعیت اب بدل چکی تھی۔مغل حکمران اپناوقار کھو چکے تھے۔اب ان کی حیثیت محض وظیفہ خوار کی تھی۔۵۲ جب کہ عوام اس فریب میں مبتلا تھے کہ ہندوستان میں مسلم اقتدار قائم ہے۔اس صورتحال میں اب عملی اقدام کی ضرورت تھی۔چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے سید احمد کی سرکردگی میں مجاہدین کی تنظیم کی۔جس کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔سید احمد اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام وقوانین وحدود کے اجرااور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں بے کار ثابت ہونگی۔صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہوگی، لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔۵۳

شاہ عبدالعزیز نے مجاہدین کی تنظیم کے ساتھ ہی عوام میں سیاسی صورتحال کوواضح کیا۔اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی ذہنی الجھن کودور کردیااور یہ فتوہ دیا کہ برعظیم اب دارالسلام "یعنی وہ ملک جہاں اسلام کو برسراقتدار یا کم سے کم آزاد سمجھا جاسکے" نہیں رہا۔اس واقعے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انگریزوں نے مخصوص اسلامی شعائر میں مداخلت نہیں کی ہے۔مسلمان اب دارالحرب میں ہیں، یعنی ایسا علاقہ جہاں اقتدار سے انھیں محروم کردیا گیا ہے۔۵۴ اس فتوے میں یہ بات مضمر تھی کہ اس قسم کے علاقوں کے مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مسلم

اقتدار کی بحالی کے لیے جدوجہد کریں۔۵۵ اس منصوبے کے لیے کام کی ضرورت تھی کیونکہ اس وقت فاصلے طویل تھے اور نشر واشاعت کے ذرائع انتہائی محدود تھے۔ تاہم شاہ عبدالعزیز اور ان کے رفقائے کار نے آہستہ آہستہ بڑے صبر وتحمل کے ساتھ ان مشکلات پر قابو پا لیا۔۵۶

اس تحریک کا آغاز ۱۸۲۰ء میں ہوا، جب سید احمد اپنے دونوں رفیقوں مولانا شاہ اسمعیل اور مولانا عبدالحیٔ کے ساتھ مشرق بعید اور جنوبی ہند کے دورے پر روانہ ہوئے۔ جس میں وہ مسلمانوں کو احکام شریعت کی پابندی اور غیر اسلامی رسوم اور بدعات کو ترک کرنے کی تلقین کرتے۔۵۷ اس طرح جہاد کے لیے راہ ہموار کی گئی۔ ۱۸۲۴ء میں حج سے واپسی کے بعد آپ نے باضابطہ جہاد کی تحریک شروع کی۔ اس مقصد کے لیے آپ نے دوبارہ ملک کا دورہ کیا۔ اس جہاد کا رخ سر دست پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا۔ جس کے مسلمانوں پر ظلم کرنے اور ان کی مذہبی آزادی میں خلل انداز ہونے کی خبریں سید صاحب تک پہنچی تھیں۔ جہاد کی تمام تیاریاں انگریزوں کی عملداری میں ہو رہی تھیں۔ انگریزوں کا رویہ بظاہر غیر جانبدار رہا، لیکن در پردہ وہ اس تحریک کی تائید میں تھے۔ کیونکہ اس جنگ سے انھیں ہندوستان کی دو طاقتوں کے ختم ہو جانے یا کمزور ہو جانے کی توقع تھی۔ جس کے بعد وہ فاتح اور مفتوح دونوں پر آسانی سے غلبہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن شاید وہ سید احمد کے حقیقی ارادوں سے باخبر نہیں تھے کہ سکھوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کے خلاف جہاد کریں اور ہندوستان سے نکال باہر کریں۔۵۸ لیکن اس سے پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب کی سکھ حکومت سے جنگ کی جائے۔ سکھوں کی حکومت ظالم تھی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتہائی تعصب رکھتی تھی۔۵۹ ان کی مملکت کا بہت بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل تھا جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اپنی حکومت کو شمال مغرب میں پٹھانوں کے وطن پر وسعت دینے کا عمل سکھوں کی طرف سے اب بھی جاری تھا۔ حامیان تحریک کا خیال یہ تھا کہ اگر پنجاب کے مسلم اکثریت والے علاقے اور پٹھانوں کی مملکت کو آزاد کرا لیا گیا تو مزید سرگرمیوں کے لئے یہ علاقہ ایک مرکز بن جائیگا۔۶۰ ۱۸۲۴ء میں سید احمد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پٹھانوں کے علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے جب سکھوں کے خلاف جنگ شروع کی تو ابتداء میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی مگر جلد ہی دشواریاں پیدا ہونے لگیں۔ سکھوں نے قبائلی سرداروں میں باہمی منافرت کی مہم جاری کر دی اور پشاور کے سردار یار محمد خان کو مجاہدین سے منحرف کرنے میں کامیاب

ہو گئے۔ یار محمد خان پہلے تو سید احمد کو زہر دینے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے بعد اس نے میدان جنگ میں اپنے اتحادیوں سے غداری کی۔۶۱ سید احمد کو اپنی مدافعت کے لیے جنگ کرنا پڑی۔۶۲ قبائلی سرداروں کو شکست ہوئی اور ان کے رہنماؤں کو جنگ کے دوران اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اسی طرح پشاور میں سید احمد کی قیادت کو دوبارہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد سکھوں سے بھوگر منگ اور مظفر آباد کے مقامات پر لڑائی ہوئی، جس میں مقامی آبادی نے سید احمد کا ساتھ دیا۔ مگر اس مہم کا خاتمہ قریب آ گیا تھا۔ کسی مقامی شخص نے سکھوں کو بالاکوٹ کا ایک متروک اور مخفی راستہ بتا دیا اور وہ اسی راستے سے شہر پر حملہ آور ہوئے۔ مجاہدین نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنا دفاع کیا مگر سکھوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کے پاس سامان جنگ بھی وافر تھا۔ چھ سو مجاہدین شہید ہوئے۔ جن میں سید احمد اور شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسمٰعیل بھی شامل تھے۔ یہ واقعہ مئی ۱۸۳۱ء کے اوائل میں پیش آیا۔۶۳

سید احمد شہید کے بعد اس تحریک کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ بیسویں صدی کے اوائل تک یہ چلتی رہی۔ ابتداً انگریز اس تحریک سے پریشان نہیں تھے کیونکہ مجاہدین رنجیت سنگھ کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ مگر جب سکھوں کی قوت ختم ہو گئی۔ تو اس قسم کی تحریک کا جاری رہنا کچھ اور اہمیت رکھتا تھا۔۶۴ مگر بہت جلد یہ سب کچھ بدل گیا، کیونکہ اب تحریک کا رخ خود انگریزوں کے خلاف ہو گیا تھا۔ اب تحریک کے رہنماؤں پر بغاوت اور سازش کے جرم میں انبالہ، مالوہ، راج محل، اور پٹنہ میں مقدمات چلائے گئے اور انھیں سخت سزائیں دی گئیں۔۶۵ پٹنہ میں محلّہ صادق پور مسمار کر دیا گیا کیونکہ وہاں تحریک کا مرکز قائم تھا۔۶۶ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریزوں کو استحکام حاصل ہوا تو ایسی تمام تحریکوں کا چلانا ناممکن ہو گیا تھا جن کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔

یہ تحریک مسلمانوں میں سیاسی تشخص کا احساس اور اردو زبان کے فروغ کا سبب بنی۔ اردو زبان کو ذریعہ اظہار و تبلیغ کا بنایا گیا۔ اس میں کتب لکھی گئیں۔ جس کا اظہار بعد میں وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا۔ بیداری کی لہر کا جو آغاز شاہ ولی اللہ سے شروع ہوا تھا اس کے اثرات ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی نظر آتے ہیں۔ انگریز مجاہدین کو وقتی طور پر دبانے میں کامیاب ہو گئے مگر ان کی سرگرمیاں مخفی طور پر جاری رہیں۔ جس کا اظہار وقتاً فوقتاً جاری رہا۔ قیام پاکستان کے مطالبہ، دوقومی نظریہ کا شعور بھی دراصل اسی تحریک سے حاصل ہوا۔ جس کا مقصد مسلمانوں میں

جداگانہ احساس اور اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ بلاشبہ یہ تحریک ایسے انمٹ نقوش چھوڑ گئی۔ جس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

برصغیر میں علیحدہ اسلامی مملکت کا قیام دراصل انہی قومی ضرورتوں کی تکمیل اور قوانین کا اجراء کرنا تھا جس کا ایک مخلوط معاشرے میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی، نہایت ضروری امر تھا۔ اسلام میں دین اور ملک دونوں کو قوام فرمایا گیا ہے یعنی مسلمانوں کو اگر حکومت حاصل ہے تو وہ اپنے دین پر قائم رہ کر تمام قوانین کا اجراء کر سکتے ہیں۔[٦٧] قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

الذین اِن مکنھم فی الارض اقامو اصلوٰۃ واتوالذکوٰۃ وامروا

بالمعروف ونھو عن المنکر ولله عاقبة الامورo

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انکو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں

اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں

کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔[٦٨]

نظام صلوٰۃ کا قیام ایک مخصوص نوعیت کے ماحول اور معاشرے کے ایک خاص کردار کی تشکیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ زکوۃ کی فراہمی اور اس کی تقسیم کا کام بھی ایک مخصوص طرز کا معاشی نظام ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ اس نظام میں مساکین، مقروض اور اہل حاجت کی دست گیری کا تصور موجود ہے۔ نیکی کا حکم دینے کے لئے ایک ایسے نظام قانون کی ضرورت ہے[٦٩] جو نیکیوں کی اجازت کے ساتھ ساتھ ان کی پرورش کی ہمت افزائی اور تحفظ کا ماحول بھی فراہم کرے تا کہ اس معاشرے میں نیکی کرنا سب سے آسان کام ہو۔ اسی طرح بدی سے روکنے سے مراد یہ ہے کہ پورے معاشرے کی ظاہری اور داخلی فضاء کو اس طرح سنوارا جائے کہ اس میں بدی کی پرورش کے تمام راستے بند ہو جائیں اور پورے معاشرے میں صالحیت اور پاکیزگی بتدریج چھا جائے کہ نیتوں کا فتور تک اصلاح پزیر ہو جائے۔[٧٠]

برصغیر کی تقسیم سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں میں کسی چیز کی بندش نہیں تھی وہ آزادی کے ساتھ فرض اور مستحسن عبادات کی ادائیگی کر سکتے تھے۔ تبلیغ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسلامی مدارس پر حکومت کی کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ قربانی کی کہیں مخالفت نہیں تھی، تعلیم گاہوں میں عربی، فارسی اور اردو کے پڑھنے پڑھانے کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ یہ سب آزادیاں ہندوستان کے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے تھے اور اٹھا رہے تھے۔ ا؂ ان تمام دینوی اور دنیوی سہولیات کے باوجود حدود اللہ کا نفاذ اس مخلوط معاشرے میں ممکن نہیں تھا اسکی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں قانون کی طاقت نہیں تھی اور حکومت میں ان کا عمل دخل نہیں تھا۔ ۲؂ ریاست کے قیام میں مسلمانوں کا نصب العین لادینی ریاست کے لیے جدوجہد سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ ہندو آزادی کے اس لیے خواہاں تھے کہ ہندوستان ہندوستانیوں (ہندوؤں) کو ملنا چاہیے۔ حکومت اکثریت کا حق ہے لیکن مسلمان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں تھے تاکہ ان کے پاس انسانی زندگی کے لیے جو دستور العمل ہے اس کا نفاذ ہو جائے۔ مسلمان وطنیت کے "ہمرنگ زمین دام" کے سحر میں گرفتار نہیں تھے۔ بقول شاعر ملت علامہ محمد اقبال (مرحوم) کے وطنیت کا حال یہ ہے کہ

"جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے۔" ۳؂

اسلامی ریاست میں نسل تفرقہ اہمیت کا حامل کبھی نہیں رہا بلکہ اسلامی ریاست کا قیام اور اس کا نصب العین صرف اور صرف خدا کے قانون کا نفاذ کرنا ہے۔ اس عالمگیر قانون کے بغیر انسان چین، اطمینان اور امن وسکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتا ہے۔

سورۃ البقرہ میں آیت ۱۴۳ میں ارشاد ربانی ہے کہ:

وکذلك جعلنك امة وسطا لتکونوا شھدآء علی الناس
ویکون الرسول علیکم شھیداط

"اور ہم نے تم کو ایک ایسی امت بنا دیا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے
تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول اللہ تم پر گواہ رہیں۔" ۴ ؎

سورۃ انعام آیت ۵۷ میں ارشاد ہے:

ان الحکم اِلّلہط یقص الحق وھو خیر الفصلینo
"حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے۔ وہ حق بات بیان کرتا ہے
اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" ۵ ؎

سورۃ یوسف آیت ۴۰ میں بیان کیا گیا ہے:

اِن الحکم الاللہط امر الا تعبدو الا ایاہط ذلك الدین القیمo
"حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اللہ کے سوا تم
کسی کی بندگی اطاعت نہ کرو یہی صحیح طریقہ ہے۔" ٦ ؎

اسی طرح سورۃ اعراف آیت نمبر ۳ میں ہے:

اتبعو اما انزل الیکم من ربکم و لا تتبعو امن دو نه اولیاءط

"پیروی کرو اس قانون کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سر پرستوں کی پیروی نہ کرو۔"۷۷

سورۃ الناس میں اس طرح مذکور ہے:

قل اعوذ برب الناس o ملك الناس o اله الناس o من شر الوسواس o الخناس o
الذی یوسوس فی صدور الناس o من الجنة والناس o

"کہہ دیجئے میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی۔ جو تمام انسانوں کا مالک ہے۔ جو انسانوں کا الہ ہے۔ شیطان کے شر اور وسوسوں سے۔ جو وہ (شیطان) انسانوں (کے ارادوں) میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔ جو جن و انس میں سے ہے۔"۷۸

اس سورۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت تسلیم کرنے کا نام ہی ایمان و اسلام ہے۔ اس سے انکار قطعی کفر ہے۔

مذکورہ موضوع قرآن وسنت کی بنیاد پر ملت اسلامیہ کی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ مباحث سے پہلے دنیا میں رائج مختلف نظام ہائے حکومت کا بنظر غائر تحقیقی مطالعہ ضروری ہے تا کہ ان ظالمانہ اور مشرکانہ نظاموں کی پہچان سے اسلام کے عادلانہ اور توحید پر مبنی نظام ہائے سیاست کی سچائی پر یقین و ادغان میں مزید پختگی پیدا ہو جائے۔۷۹

غیر اسلامی نظام ہائے سیاست میں سب سے زیادہ مروج اور قدیم ترین نظریہ ملوکیت اور بادشاہت ہے۔۸۰

اللہ تعالیٰ سورۃ النمل میں ارشاد فرماتا ہے کہ:

"یقیناً بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اسکو خراب کر دیتے ہیں اور کرڈالتے ہیں وہاں کے باعزت لوگوں کو بے عزت اور ایسا ہی کرتے ہیں۔۸۱"

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے وہ ان لوگوں کو جو نہیں چاہتے اپنی بڑائی زمین میں اور نہ بگاڑ ڈالنا اور عاقبت بھی ہے تقویٰ والوں کی۔"۸۲

ان آیات کی روشنی میں ملوکیت کی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ:

"وہ نظام حکومت جو زمین پر فساد پھیلانے اور لوگوں کو ذلیل کرنے کے لیے بنایا گیا ہو اور جس کا اصل مقصد حکمران کی شخصی اور ذاتی بڑائی اور بالادستی قائم کرنا ہو۔"۸۳

علامہ ابن خلدون نے ملوکیت کی فنی اور اصطلاحی تعریف اس طرح سے کی ہے کہ:

"استبدادی بادشاہت وہ حکومت ہے جو لوگوں کو بادشاہ کی ذاتی اغراض اور خواہشات پوری کرنے پر مجبور کرتی ہو۔"۸۴

ملوکیت کے شہنشاہی نظام میں بادشاہ کی منشاء ماخذ قانون ہوتی ہے۔ پوری قوم اور قومی خزانہ اسکی ذاتی ملکیت تصور ہوتا ہے۔ وہ تنقید سے بالاتر سمجھا جاتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ کسی شخص کا بادشاہ بن جانا اس بات کا ثبوت سمجھا جاتا ہے کہ وہ خدا کا نمائندہ ہے اور اس کا ہر حکم ماننا منشاء خداوندی ہے۔ گویا بادشاہ انسانی شکل میں خود بادشاہ ہے۔ ۸۵

مشہور مصری محقق عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں ازمنہ قدیمہ کے بادشاہوں کے متعلق لکھا ہے کہ:

"زمانہ قدیم کے بادشاہوں نے اپنے اردگرد مقدس ہونے کا دائرہ بنادیا تھا اور اپنے آپ کو خدائی کا درجہ دیدیا تھا۔ اسکی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو واقعی انسانوں سے بالاتر مخلوق سمجھتے تھے۔ انکو یہ دھوکا نہیں تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام کی بغاوت سے محفوظ رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا مقدس ہونا شورش اور انقلاب برپا کرنے والوں کے راستے میں بڑی رکاوٹ بن جائے گا۔ ابراہیمؑ کے زمانے میں نمرود کا یہی حال تھا۔ موسیٰؑ کے آنے کے بعد آنے والے یونانی اور رومی بادشاہوں اور مصر کے فرعونوں کا بھی یہی حال تھا۔" ۸۶

سید سلیمان ندوی پروفیسر ولسن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

مصر میں سامیہ اولیٰ کے زمانے میں ستارہ پرستی جاری تھی۔ سب سے بڑا دیوتا آفتاب تھا۔ جس کو وہ اپنی زبان میں 'رع' کہتے تھے۔ ان کے دارالحکومت کا نام 'مدینۃ الشمس' تھا جس کو مصری 'اُن' کہتے تھے۔ یہی سورج دیوتا کا مندر تھا۔ بادشاہ سورج دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا لقب 'رعمسیس' یعنی 'ابن شمس' ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ سلاطین مصر کو خدائی کا دعویٰ تھا۔" ۸۷

مولانا عبدالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ:

"مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو ونما پا چکا تھا اور تاجداران مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ ان کا لقب 'فاراغ' اسی لیے ہوا تھا کہ وہ 'راع' یعنی 'سورج دیوتا' کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔"۸۸

ہندوستانی کے برہمنی تمدن کی مستند کتاب 'منوشاستر' میں بادشاہ کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ:

"بادشاہ اگر طفل نابالغ بھی ہو تو اسے یہ خیال کرکے یہ بھی ایک انسان ہے حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے، بادشاہ فی الواقع خدا ہے انسان کی شکل میں۔"۸۹

روم میں بھی استبدادیت اور مطلق العنانیت کا دوردورہ تھا۔ رومی شہنشاہیت کا آغاز دراصل جولیس سیزر (Julius Ceasar) سے ہوا۔ جس نے اپنے دور اقتدار میں پورے طور پر استبداد اور مطلق العنانی کا مظاہرہ کیا۔۹۰ اس وقت سے قیصر صفات الوہیت کا مالک ہے کے عقیدے کا آغاز ہوا۔۹۱ لیکن بادشاہت کو موروثیت میں تبدیل کرنے والا اغسطس (Augustus) تھا۔ اس کی صفات کے بعد ٹائرس (۱۴ء تا ۳۷ء) برسر اقتدار آیا۔۹۲ اسکی تخت نشینی کے وقت مطلق العنانیت کا دعویٰ پھر کیا گیا کہ 'نا قابل تقسیم شہ کو تقسیم کرنا غیر ممکن ہے'۔ سلطنت ایک جسم واحد ہے اور صرف ایک ہی شخص کا دماغ اس پر حکمرانی کرسکتا ہے۔۹۳ چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر گبن کے مطابق روم زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے مطابق:

"روم کی مثال بعینہ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی جس کے سائے میں ایک وقت تک تمام اقوام عالم آباد تھیں مگر اب ایسی خزاں آئی کہ برگ وبار کے ساتھ ساتھ اس کی شاخیں

اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا۔"۹۴

شہنشاہ رومہ کی تاریخ نہایت عظیم الشان معلوم ہوتی ہے مگر دنیا کو وہ سبق دے گئی کہ ایسا لامتناہی اختیار نہ حکمران کے لیے مفید ہے اور نہ اس کی رعایا کے لیے۔۹۵

سلطنت رومہ کا اصل و اصول بادشاہت تھا۔ بادشاہ کے اختیارات غیر محدود تھے اور وہ تمام سیاسی اور مذہبی عہدوں کا سرچشمہ تھا۔۹۶ سلطنت کا تمام طرزِ عمل شاہی مرضی کے تابع اور تمام تنظیمات کا تعلق بادشاہ سے ہی تھا۔۹۷ اس لیے ادارے مثلاً امراء کی مجلس (Senate) یا مجلس جمہور وغیرہ بظاہر جمہوری نظر آتے ہیں مگر وہ بالکل مصنوعی تھے۔ بادشاہت صرف ایک مخصوص گروہ، جماعت اور وطن کے اندر محصور تھی۔ حکمرانوں کی یہی وہ مخصوص جماعت تھی جس کی خاطر داری سلطنت کا مقصود تھی۔۹۸

رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffalt) لکھتا ہے کہ:

"رومی سلطنت... انسانوں سے (ظلم و زیادتی کے ذریعہ) ناجائز فائدہ اٹھا کر انسانوں کی مخصوص جماعت (حکمرانوں) کی راحت رسانی اور عیش و آرام کا سامان فراہم کرتی تھی۔"۹۹

فارس:۔

فارس میں بھی روم کی طرح شخصی، وموروثی اور مطلق العنان بادشاہت تھی۔ یہی ایرانی نظامِ فکر و سیاست میں محور کی حیثیت رکھتا تھا۔ حکمران یہ دعویٰ کرتے تھے کہ:

"انکی رگوں میں خدائی خون ہے۔"

تو دوسری طرف اہل فارس بھی انہیں خدا کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان حکمرانوں کی فطرت میں ایک مقدس آسمانی چیز ہے چنانچہ یہ لوگ ان کے آگے سربسجود ہوتے تھے۔ ان کی الوہیت کے گن گاتے تھے اور انہیں قانون، تنقید اور بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے۔ [100]

اہل فارس الوہیت میں اس قدر آگے نکل چکے تھے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ حکمرانوں کا ہر انسان پر پیدائشی حق ہے اور لوگوں کو سوائے احکام کی بجاآوری کے کسی امر میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ اس وقت اہل فارس پر ایک خاص گھرانہ (کیانی خاندان) حکومت کر رہا تھا۔ ان کے بارے میں اعتقاد تھا کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت و تاج کے وارث اور ملک و سلطنت کے مالک ہو سکتے ہیں اور یہ حق وراثتاً نسل بعد نسل منتقل ہوتا رہے گا۔ یہ لوگ بادشاہ وقت پر ایمان رکھتے تھے اور حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے، اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ نہیں ملتا تو بچے ہی کو تاج شہنشاہی پہناتے تھے۔ [101] بادشاہت کا یہ نظریہ صرف چھٹی صدی عیسوی تک مخصوص ہ تھا بلکہ سولہویں صدی عیسوی میں سیاست کو منظم کرنے والا اور بادشاہت کا نظریہ پیش کرنے والا میکیاوَلی [102] (متوفی ۱۵۲۷ء) تھا۔ میکیاوَلی کے نزدیک جو بادشاہت مذہب واخلاق سے آزاد ہوگی وہ بہترین حکومت ہوگی۔ میکیاوَلی "بادشاہ" [103] میں لکھتا ہے:۔

"ایک مطلق العنان بادشاہ (پرنس) جو شر کو دبانے کے لیے شر ہی کا استعمال کرتا ہو، کسی اخلاق و مذہب کا پابند نہ ہو، ہر قسم کا مکروفریب، جوڑتوڑ کرتا ہو، سازش کرتا ہو اور ہر ممکن طریقے سے اقتدار کو بحال رکھنے کے لیے مفید ہو، ہی بہتر قانون ہے۔" [104]

اس کتاب میں دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ لکھتا ہے کہ:

"بادشاہ کے لیے صفت رُوباہی نہایت ضروری ہے تا کہ دجل وفریب کا جال پھیلا سکے۔ اس کے ساتھ 'جوئے شیر' بھی ضروری ہے تا کہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے... نیکی ایک واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اصل شے برائی ہے۔ اس لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی

جاتی ہے اور اس کے لیے کونسا وقت موزوں ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں لیکن اس میں بظاہر خوبیوں کا دکھائی دینا (نمائشی طور) پر ضروری ہے۔"۱۰۵

میکیاولی کے نظریات سولہویں صدی کے تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں دنیا میں انقلاب برپا ہوا۔ ۱۴ اگست ۱۷۸۹ء میں فرانس میں انقلاب ہوا۔ جس میں جمہوریت کا موجودہ دور شروع ہوا۔۱۰۶ موجودہ جمہوریت ملوکیت کی دوسری انتہا اور اس کی عین ضد ہے۔ انقلاب کی دھات کا نچوڑ یہ تھا کہ قوت حکم وارادہ اشخاص و ذات کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ جماعت و افراد کے تسلط میں ہو۔۱۰۷ دوسرے لفظوں میں عوام کی حکومت، عوام کی طرف سے، عوام کے لیے تھی۔ اور قوم اور قومیت کا تصور پختہ ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں سائنسی ترقی کے نتیجہ میں جب وسائل ابلاغ میں وسعت اور نقل وحرکت میں آسانی اور تیز رفتاری پیدا ہوئی تو دنیا میں ایک عالمی برادری کا احساس پیدا ہوا۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں برپا ہوئی جس میں بہت سے ممالک کو چار و نا چار حصہ لینا پڑا۔ جنگ کے اختتام (۱۹۱۸ء) پر عالمی امن کو برقرار رکھنے کے لیے جمعیت اقوام (League of Nations) کا قیام عمل میں آیا جو ناکام ثابت ہوئی۔ جس کی بنیادی وجہ وہی پرانی ذہنیت تھی کہ طاقتور حکومتوں کے مفادات کمزور ملکوں کی حمایت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

جمعیت اقوام (League of Nations) کی ناکامی کا ثبوت دوسری جنگ عظیم تھی۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء) کے اختتام پر ایک دوسرے عالمی ادارہ (UNO) کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد امن قائم کرنا تھا جس کے لیے بہت سے قواعد بنائے گئے۔ اس مقصد کے لیے عالمی عدالت بھی قائم کی گئی۔ تحدید اسلحہ کی کوشش بھی کی اور دنیا بھر کے انسانوں کے لیے 'بنیادی حقوق کا چارٹر' بھی شائع کیا گیا۔ مگر اس کے نتائج بھی لیگ آف نیشنز سے مختلف نہ تھے کیونکہ بڑی بڑی طاقتیں اپنی انا کو قائم رکھنے کے لیے مفادات کے حصول کے لیے کمزور ملکوں کے حقوق و مفادات کو کچل دیتی ہیں۔۱۰۸ ان دونوں اداروں (League of Nations) اور UNO پر قدرت اللہ شہاب نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے کہ:

"پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں امن وامان کو فروغ دینے کے لیے لیگ آف نیشنز وجود میں آئی تھی لیکن یہ انجمن کفن چوروں کی ثابت ہوئی اور اقوام عالم کی بہت سی قبریں آپس میں تقسیم کرنے کے بعد اس نے آرام سے جنیوا میں دم توڑ دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کی تنظیم نو UNO نے جنم لیا۔ ادارے کا رہنما اصول، جس کی لاٹھی اس کی بھینس سے جب کوئی لاٹھی والا طاقتور ملک جارحیت سے کام لیکر کسی چھوٹے اور کمزور ملک کی بھینس زبردستی ہنکا کر لے جاتا ہے تو یو۔ این۔ او اسے فوراً جنگ بندی کا اعلان کر کے فریقین کے درمیان سیز فائر لائن کھینچ دیتی ہے۔ جنگ بندی کے خط پر یو۔ این۔ او کی نامزد فوج اور مبصر متعین ہو جاتے ہیں۔ جو اس بات کی خاص نگہداشت رکھتے ہیں کہ مسروقہ بھینس دوبارہ اپنے مالک کے پاس نہ جانے پائے۔ اس کے بعد یہ سارا معاملہ جنرل اسمبلی اور سیکورٹی کونسل کی قراردادوں میں ڈھل ڈھل کر نہایت پابندی کے ساتھ یو۔ این۔ او کے سرد خانوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔[۱۰۹]

بڑے بڑے مفکرین اب اس مصیبت سے نجات کی راہ تلاش کر رہے ہیں ان کی فکر کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ جب تک تمام دنیا میں ایک عالمگیر حکومت قائم نہ ہوگی عالمی امن کی ضمانت دینا ممکن نہیں ہے۔ عالمی حکومت کا اقتدار اعلیٰ صرف ایک ہی ہونا چاہیے۔[۱۱۰] تمام عالم اب اسی فکر کی طرف لوٹ رہا ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے دی۔

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ دین و دنیا کی جامعیت رکھتا ہے، وہ روحانی عقیدے کا نام نہیں بلکہ اس میں دونوں جہاں کی برکتیں ہیں، اور اس کے خزانہ ہدایت میں سیاست کے محاسن اور سیاست کے اصول وضوابط موجود ہیں۔ اسلام نوع انسانی کو ہر شعبۂ حیات میں روشنی مہیا کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا ابر کرم بن کر افق عالم پر نمودار ہوا کہ جس کے ذریعے پوری انسانیت کی تشنگی دور ہوئی۔ اسلام نے دین اور دنیا کی تفریق ختم کر کے ایک جامع نظام ریاست قائم کیا۔ انسانی معاشرہ کی تنظیم اور اسلامی ریاست کی تشکیل ایک عظیم

عالیشان انقلاب فکر کی نقیب بنی۔ اس انقلاب کا عنوان ایک ہے اور صرف ایک ہے اور وہ ہے عقیدہ توحید۔ اسلام کا واضح اعلان ہے۔[111]

ان الحکم الا للہ

بیشک حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے

اس اعلان سے حکومت، خاندان، نسب، رسم و رواج، وطنیت اور قومیت کے سارے بت پاش پاش ہوگئے۔ وہ تمام بیڑیاں جن کے بوجھ سے نوع انسانی کے پاؤں شل ہو گئے تھے کٹ کر گر گئیں۔ انسان اپنا سر ایک چوکھٹ پر جھکا کر تمام بندگیوں سے آزاد ہو گیا۔ اللہ کی ہستی کے سوا کوئی چیز اس کے دل کو مرعوب کرنے والی نہیں رہ گئی۔[112]

تصور ریاست اسلامی تعلیمات قرآنی کی روشنی میں

جب بھی ہم ریاست کا تصور اسلامی تعلیمات قرآن کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت فوراً آجاتی ہے:

واللہ ملک السمٰوٰت والارض وما بینھما والیہ المصیر ۝ [113]

"اور آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے سب پر اللہ ہی کی حکومت ہے
اور (سب کو) اسکی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

گویا عالم موجودات کا حقیقی اور واحد حاکم تو اللہ تعالیٰ ہے، اور جب وہی واحد حاکم ہے تو تمام کائنات فی الواقع ایک ہی ریاست ہے۔ اب اس واحد ریاست کائنات کے اجزاء اور ان اجزا کے مزید اجزا میں جتنی بھی ریاستیں قائم ہیں یا ہوں گی وہ سب کی سب اللہ ہی کی ریاستیں ہیں اور ان سب میں حقیقی حکومت اللہ تعالیٰ کی ہے۔[114]

اللہ تعالیٰ کی حکومت کی حقیقت کو قرآن میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ زمر آیت نمبر ۴۴ میں ارشاد ہے کہ:

له ملك السمٰوٰت والارض ثم اليه ترجعونo ۱۱۵

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے پھر اسی کی
طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

سورۃ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

ان الله له ملك السمٰوٰت والارض ط يحي ويميت ط ۱۱۶

اللہ ہی کے قبضے میں زمین اور آسمانوں کی سلطنت ہے
اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے

یہ تو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اعلان ہے مگر اس سے زیادہ تاکیدی اعلان مختلف دوسری آیات میں بھی موجود ہے جس میں اس عمل کو بالتصریح بیان کیا گیا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اس کے علاوہ اگر چھوٹے چھوٹے حاکم ہمیں نظر آتے ہیں تو وہ سب اپنی مختصر اور محدود مدت کے لیے اسکے مرہون منت ہیں۔ ۱۱۷

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان الحكم الا الله oيقص الحق وهو خير الفاصلينo

حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے وہ حق بات بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۱۱۸

سورۃ القصص آیت نمبر ۸۸ میں ارشاد ہے:

كل شيء مالك الا وجهه له الحكم واليه ترجعونo

اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے اس کا حکم ہے اور اسکی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے۔ ۱۱۹

تعلیمات قرآنی کی روشنی میں تصور ریاست اسلامی کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مالک الملک ہے، ساری مخلوقات کائنات اس کی ہیں لہٰذا قدرتی طور پر اپنی مخلوقات پر حکم صادر کرنے کا حق بھی اسی کو حاصل ہے اور انسان تو بس اس دنیا میں اسی کا نائب و خلیفہ ہے۔[120]

سورۃ فاطر آیت ۱۳ میں ارشاد ہے کہ:

ذالکم اللہ ربکم لہ الملك

وہ ہے اللہ، تمہارا رب، ملک اسی کا ہے۔[121]

سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۱۱ میں ارشاد ہے کہ:

لم یکن لہ شریك فی الملك

بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔[122]

سورۃ کہف میں ارشاد ہے کہ:

ولا یشرك فی حکمہ احداً

اور وہ اپنے حکم میں کسی کو حصہ دار نہیں بناتا۔[123]

ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہے کہ:

الا لہ الخلق والامر ط

خبردار خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔[124]

تعلیمات قرآن کریم پر نظر ڈالنے سے یہ بات بھی ماہ منور کی طرف روشن نظر آتی ہے کہ اسلامی ریاست چونکہ اللہ کی زمین پر قائم ہوئی ہے اسی لیے اس سرزمین پر صحیح حکومت اور عدالت صرف اور صرف وہی ہوگی جو اس ابدی قانون الٰہی کی بنیاد پر ہوگی جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے بھیجا۔ درحقیقت اس نظام شریعت کا نام ہی خلافت ہے۔

سورۃ نساء میں ارشاد ربانی ہے کہ:

انا انزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بمااراك الله ط

اے نبی ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان
اس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔ ۱۲۵

ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہے:

وان احكم بينهم بما انزل الله

اور یہ کہ تم ان کے درمیان حکومت کرو (اس ہدایت کے مطابق)
جو اللہ نے اتاری ہے۔ ۱۲۶

اسلام کے نام سے روئے زمین پر قائم ہونے والی کسی بھی ریاست میں جو بھی حکومت یا عدالت اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ شریعت کے علاوہ کسی دوسرے نظریے یا کسی دوسری بنیاد پر قائم ہوگی وہ باغیانہ حکومت و عدالت ہوگی۔ ۱۲۷

سورۃ نساء آیت ۱۱۵ میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

ومن يشاقق رالرسول من بعد ماتبين له الهدى ويتبع غير

سبيل المومنين نوله ماتولى ونطه جهنم وسآء ت مصيرا

اور جوکوئی رسول سے جھگڑا کرے درآں حالیکہ راہ راست اسکو دکھادی گئی اور ایمان داروں کا

راستہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود مڑ گیا ہے

اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ۱۲۸

ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہے:

فلاوربك لايومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم

پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہونگے جب تک کہ اے نبی تجھ کو اپنے

باہمی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کرلیں۔ ۱۲۹

ان آیات سے اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت واہمیت جامہ ظہور سے مزین ہوکر نگاہ ذوق کی تسکین کا باعث بن جاتی ہیں اور تعلیمات قرآن کی روشنی میں ترقی ونشوونما کا صحیح مفہوم بھی عیاں ہوجاتا ہے۔ ۱۳۰ اسلام کے نزدیک مادی ترقی وارتقاء کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس کے نزدیک اگر کوئی ترقی احسن اور مطلوب ہے تو وہ روحانی اور اخلاقی ترقی ہے۔ اس تصور ترقی کا ارتقاء صرف اسلامی ریاست میں ممکن ہے۔ جدید دور کے پیچیدہ مسائل کا حل تعلیمات قرآنی کی روشنی میں اس کے مکمل قیام اور شریعت اسلامیہ کے عمل اور مکمل نفاذ میں ہے۔ ۱۳۱ اس تمام بحث سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ حاکم اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کوئی فرد، خاندان، گروہ، بلکہ پوری ملت بھی حاکمیت کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہے۔ کسی دوسرے کو قانون سازی کا اختیار نہیں اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں ردوبدل کرسکتا ہے حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کرسکتا۔

۳۔ اسلامی حکومت کا امیر صرف اسی صورت میں اطاعت کا مستحق ہے کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرے۔
۴۔ اسلام میں قانونی اور سیاسی حاکمیت میں کوئی امتیاز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی سیاسی اور قانونی مقتدر اعلیٰ ہے۔[۱۳۲]

نظام خلافت میں مقتدر اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک اور وہی قانون ساز ہے۔ ملت اسلامیہ اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے بنیادی قوانین اللہ تعالیٰ خود بذریعہ انبیاء انسانوں کو بتلاتا ہے۔ ایسی قانون سازی کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس دوسرے تمام نظام ہائے سیاست میں مقتدر اعلیٰ کوئی ایک انسان یا ادارہ ہوتا ہے۔ ملوکیت اور آمریت میں یہ مقتدر اعلیٰ بادشاہ یا ڈکٹیٹر ہوتا ہے۔ جمہوریت میں سیاسی مقتدر اعلیٰ تو عوام ہوتے ہیں اور قانونی مقتدر اعلیٰ پارلیمنٹ۔[۱۳۳] اسلامی نظام سیاست میں رعایا کا مفہوم دوسرے نظام ہائے حکومت سے مختلف ہے۔ ریاست کی جو مختلف تاریفیں کی جاتی ہیں ان کے مطابق ریاست کے ترکیبی اجزاء آبادی، علاقہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ ہیں۔ لیکن نظام خلافت کے لیے مخصوص علاقہ کوئی شرط نہیں ہے۔ نظام خلافت سیاست کے بجائے ملت کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس میں کسی مخصوص علاقہ کی قید نہیں ہے۔ اس کا مقصد عمدہ عالمی نظام قائم کرنا اور اس کی تعمیر و بلندی ہے۔ اسلام نے یہ پیغام صرف مسلمانوں کو ہی نہیں دیا بلکہ یہ پیغام تمام دنیا کے لیے یکساں ہے۔[۱۳۴]

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

یاایھاالناس اِنّا خلقنکم من ذکروانثی وجعلنکم شعوبا
وقبآئل لتعارفو۔ان اکرمکم عنداللہ اتقکم(۴۹/۱۳)
لوگوں ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے
تا کہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔ اور خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ
عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔[۱۳۵]

نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ اس ملک کی تریاق اردو ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے حالانکہ پاکستان بھر میں ایسے افراد کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ ہوگی جو عربی بول سکتے ہیں۔ پس قومی یا سرکاری زبان کے معاملے میں جب عربی تجویز کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم صدیوں تک انگریزی سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے دفاتر کی زبان ایک غیر ملکی زبان ہے جو یہاں نہ بولی جاتی ہے، نہ سمجھی جاتی ہے جس کے بولنے والے سات ہزار میل دور ہیں۔ یہ ایک قومی حادثہ تھا کہ وہ یہاں آئے اور کچھ عرصہ رہ کر چلے گئے اب اس زبان کے تسلط سے نکلنے کا علاج کیا ہے؟ میری رائے میں اردو کے سوا کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو انگریزی کی جگہ لے سکے۔"

انھوں نے اردو کی صلاحیت اور پرمایگی کی تحسین کی اور زور دے کر فرمایا کہ:

"مولوی عبدالحق صاحب کو اندیشہ ہے کہ اردو کے بجائے کوئی اور قومی زبان بنادی جائے گی، میں کہتا ہوں کہ نہ یہ ہوسکتا ہے نہ یہ کسی کی مجال کہ اردو کے سوا کسی دوسری زبان کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان بنا سکے۔ اس معاملے میں تو دل میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں لانا چاہیے۔"[۲۶]

اس کانفرنس میں پاکستان بھر کے صوبوں کے نمایاں لوگوں نے شرکت کی ان میں میاں جعفر شاہ کاکاخیل (صوبہ سرحد)، قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان)، جناب فضل الرحمٰن وزیر تعلیم مرکزی (مشرقی پاکستان)، مولانا اکرم خان (مشرقی پاکستان) اور ہر صوبے کے مقتدر صاحبان بھی جن میں اکثر مسلم لیگ سے متعلق تھے، اردو کے حق میں تقریریں بھی کیں۔

لیکن خواجہ ناظم الدین اس ادراک کے باوجود لسانی تنازع کو بڑھنے سے نہ روک سکے۔ وہ عناصر جو غیر منقسم ھندوستان میں مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ اب بھی انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بنگال ہی کو محاذ بنایا اور زبان کے حساس مسئلے کو اختلاف کی بنیاد بنادیا۔ حالانکہ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ جن طاقتور عناصر نے تقسیم بنگال کے خلاف ایک طوفان برپا کیا تھا اور انگریز اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوگئے تھے، اب قیام پاکستان کے بعد وہ دوبارہ مستعد ہوگئے تھے۔ اب ان کا مقصد مرکز گریز رجحانات کو ہوا دینا تھا۔ سب سے پہلے عوام کے جذبات میں زبان کے ذریعے وسوسہ پیدا کیا گیا۔ جس کے لیے دستور ساز اسمبلی میں بھی اور مشرقی بنگال کے تعلیمی مرکزوں (خصوصاً ڈھاکہ یونیورسٹی) میں آبادی کی اکثریت کے حوالے سے بنگلہ کو پاکستان کی قومی زبان بنائے جانے کا پروپیگنڈا کیا گیا۔ قائداعظم کے بروقت اقدام سے یہ شوشہ وقتی طور پر دب گیا۔ لیکن قائداعظم کی وفات کے بعد یہ عناصر پھر سے اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے اور انھوں نے دستور سازی میں تاخیر سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دستور سازی میں تاخیر کی پہلی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے انتظامی ڈھانچہ کا آغاز صفر اور بے پناہ مسائل کے ہجوم سے ہوا تھا۔ مہاجرین کی آبادکاری ایک بہت بڑا مسئلہ تھا جسے حل کرنے میں ایک آدھ سال کا عرصہ لگا۔ دوسری وجہ قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت تھی۔ اس سے جو صدمہ پاکستان کو پہنچا اس کو سہنے میں کچھ عرصہ لگا۔ قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد پیش کی مگر اس کا دستور کے متن سے کوئی تعلق نہ تھا یہ صرف ایک تمہید تھی۔ دستور ساز اسمبلی کی کمیٹی برائے بیسک پرنسپل نے دستور کا خاکہ مرتب کیا۔ بی۔ پی۔ سی رپورٹ پر اسمبلی میں اور ملک کے باہر مختلف مکتبہ فکر میں بحث و مباحثے کا آغاز ہوگیا۔ اس وقت لیاقت علی خان وزیراعظم تھے۔ دستور ساز اسمبلی اور پارلیمان میں وہ مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ مسلم لیگ کے دستور میں ترمیم کر کے وہ اس کے صدر بن گئے تھے۔ لیاقت علی خان کے اندر صلاحیتیں موجود تھیں۔ ملکی حالات بھی سازگار تھے۔ لوگوں کے دلوں میں جوش و جذبہ بھی موجزن تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے دستور سازی کے مسئلے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور اختلاف رائے کو دیکھتے ہوئے دستور سازی کے مسئلے کو سرد خانے کی زینت بنادیا۔ لیاقت علی خان کو ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں شہید کردیا گیا تو اس کے بعد یہ سازگار دور بھی ختم ہوگیا جس میں پاکستان کی متفقہ آئینی بنیاد فراہم ہونی تھیں۔ ۲۷ جبکہ بھارت کا آئین نومبر ۱۹۴۹ء میں مکمل ہوکر نافذ ہوچکا تھا۔ ناگری ہندی کو قومی زبان قرار

دیا جا چکا تھا۔ بھارت جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا جبکہ پاکستان لسانی تنازع میں الجھا ہوا تھا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اپنے بنیادی فریضہ سے غافل ہو کر پارلیمنٹ کی شکل میں اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف تھی۔ ۲۸

لیاقت علی خان کے بعد گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین دوسرے وزیر اعظم بنے۔ انھیں بنگال میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی موجودگی میں فتنہ کچھ عرصہ دبا رہا۔ لیکن مشرقی بنگال سے آنے کے بعد لسانی عصبیت نے پھر سر اٹھایا۔ اب ذرا ذرا سی بات پر فسادات ہونے لگے۔ فروری ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ میں تیسری پاکستان تاریخ کانفرنس کے صدارتی خطبے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے یہ الفاظ ادا کر دیئے کہ "بنگلہ زبان ہندو تہذیب کے اثرات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ لہٰذا اسے اب مسلم اثرات سے سرشار کرنا چاہیے۔" اس پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں سخت فساد ہوا، فائرنگ بھی کی گئی۔ اس سے یہ نقصان ہوا کہ بنگلہ تحریک ملک گیر تحریک ہو گئی اور اردو اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پھیلا دی گئی۔ ۲۹ اب بنگلہ زبان کے علاوہ اکثریتی تفوق کے سیاسی رتبے کی بحث بھی چھڑ گئی جس میں حکمران جماعت مسلم لیگ نے بھی حصہ لیا اور اردو کی مخالف ہو گئی۔

اردو کے قومی اور سرکاری زبان بننے کے عملی مسائل، طریق کار اور لائحہ عمل ابھی ابتدائی مراحل ہی میں تھے کہ مملکت کی دستوری اور سیاسی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ سیاست کاری نے اقتدار پسندی کو مملکت کے معاملات میں شامل کر کے حالات اور واقعات کو مائیکرو پولیٹکس کا موضوع بنا دیا۔ ۳۰

خواجہ ناظم الدین کے دور حکومت میں تقریباً ڈیڑھ سال بعد بی۔ پی۔ سی کی طرف سے دوسری رپورٹ پیش کی گئی۔ اس رپورٹ میں متحدہ مشرقی بنگال کے مقابلے میں مغربی پاکستان کو نو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جو بنگلہ کے اقتدار کو پورے پاکستان پر مسلط کرنے کی ایک صورت تھی۔ بنگلہ زبان کی تحریک نے اردو اور مغربی پاکستان کے خلاف جو بے اعتمادی کی فضا پیدا کی اس میں سیاسی عناصر نے خوب فائدہ اٹھایا جو مسلم لیگ کے مخالف تھے۔ جس کے اثرات اپریل ۱۹۵۴ء کے صوبائی انتخابات میں رونما ہوئے اور مسلم لیگ کے مقابلے میں جگتو فرنٹ پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ بنگال میں مسلم لیگ کو بدترین شکست ہوئی۔ اس کے باوجود دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ بدستور اکثریت میں تھی۔ مگر اس سیاسی صورتحال سے مسلم لیگی رہنما بھی متاثر ہوئے اور سیاسی مفادات کے پیش نظر اُردو کے مخالف گروہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۵۴ء کو بنگلہ کو اُردو کے برابر درجہ

دینے کا فیصلہ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے کیا اور قائد اعظم کے اس فرمان کو فراموش کر دیا کہ "پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان صرف اُردو ہوگی" مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا اساسی اصولوں پر سمجھوتہ گو کہ ان کی ذات کے لئے تو فائدہ کا سبب بن سکتا تھا لیکن انھوں نے پورے ملکی مفادات کو اپنے ذاتی تسکین کے لئے قربان کر دیا۔ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے فیصلے کے بعد دستور ساز اسمبلی نے بھی اس فیصلے کی توثیق کر دی کہ پاکستان کی دو زبانوں بنگلہ اور اُردو کو قومی زبان کا حق حاصل ہوگا۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں اس دستور ساز اسمبلی کو ختم کر دیا گیا جو سات سال کے طویل عرصے میں ملک کو اس کے اساسی نظریہ کے مطابق متوازن دستور دینے میں ناکام رہی تھی۔ صوبائی اسمبلی کے اراکین نے نئی دستور ساز اسمبلی تشکیل دی۔ نئی دستور ساز اسمبلی نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں برابری (Parity) کی بنیاد پر مغربی پاکستان کے صوبے ختم کر کے ایک وحدت (Unit) کی صورت دی اور مساوات کے اصول کے تحت دونوں بازوؤں کے نمائندوں کے مابین جو سمجھوتے ہوئے ان کی روشنی میں ۱۹۵۶ء میں ملک کا پہلا دستور مکمل ہو کر نافذ ہوا۔ ۱۳؎ ملک کے پہلے دستور ۱۹۵۶ء میں دو قومی زبانوں کا اصول تسلیم ہو جانے کے بعد زبان کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کر گیا۔ اس اختلاف کی آڑ میں انگریزی زبان کو زیادہ سے زیادہ تحفظات دینے کا اہتمام شروع کر دیا گیا۔ دستور ۱۹۵۶ء میں پاکستان کی سرکاری یا قومی زبانوں کے بارے میں یہ دفعات دستور کے متن میں شامل تھیں۔

۱۔ جمہوریہ کی سرکاری زبانیں اُردو اور بنگلہ اور ایسی دوسری صوبائی زبانیں ہوں گی جنھیں متعلقہ صوبائی اسمبلی کی سفارش پر صدرِ مملکت یہ حیثیت دینے کا اعلان کر دے۔

۲۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو انگریزی کے علاوہ اُردو اور بنگلہ میں تقریر کرنے کا حق ہوگا۔

۳۔ مندرجہ بالا دفعات کے باوجود، آئین کے نفاذ کے بعد ۲۰ سال کے عرصے کے لئے انگریزی کو حسبِ سابق تمام سرکاری معاملات میں استعمال کیا جائیگا۔

۴۔ مرکزی ملازمتوں کے امتحانات کے لیے صوبائی زبانوں کو مساوی درجہ دیا جائے گا۔

۵۔ ثانوی سکولوں میں عربی، اردو اور بنگلہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا تا کہ طلباء اپنے ذریعہ تعلیم کے علاوہ ان میں سے بھی ایک یا دو زبانیں سیکھ لیں۔

۶۔ حکومت ایک مشترکہ قومی زبان کی ترقی و فروغ کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔

۷۔ آئین کے نفاذ کے دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو انگریزی کی جگہ متبادل انتظام کے لیے سفارشات پیش کرے گا۔[۳۲]

مندرجہ بالا سفارشات نے صرف قومی زبان پر ضرب کاری نہیں لگائی تھی بلکہ پاکستانی قومیت کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ وحدت کے تصور کو پارہ پارہ کر دیا گیا اور صوبائیت، علاقائیت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے دستور ۱۹۵۶ء کی لسانی شقوں کا تجزیہ کچھ اس طرح سے کیا ہے:

شق ا: بنگالے میں شورش تو اردو زبان کے ساتھ بنگلہ کو قومی زبان بنانے کے لیے تھی لیکن دستور کی متعلقہ شق کے مطابق جمہوریہ (پاکستان) کی سرکاری زبانیں دو سے بھی زیادہ ہو جانے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ صرف بنگلہ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ پاکستان کے ہر صوبے کی زبان کو یہ حق دے دیا گیا کہ صدر کے حکم سے وہ قومی زبان بن سکتی ہے۔ صرف اسمبلی (صوبائی) سے پاس کرانے کی شرط رکھی گئی اور یہ کونسا مشکل امر تھا علاقائی تعصّبات کو ابھار کر فوراً سے طے کرایا جا سکتا ہے۔

اس شق نے اردو کی اس فوقیت کو بالکل ختم کر دیا جس کی خاطر قائداعظم نے شدید علالت کے باوجود ڈھاکہ کا سفر اختیار کیا... ایک سرکاری زبان نہیں کئی کئی سرکاری زبانیں کسی عقلی انتظامی جواز کے بغیر۔ اس ایک اقدام نے لسانی انتشار کے علاوہ، ہر شعبہ زندگی میں صوبائیت اور علاقائیت کی زبردست حوصلہ افزائی کی۔ اس کے معنی یہ سمجھے جا سکتے ہیں کہ جو فتنہ کلکتہ سے اٹھا تھا اسے مغربی پاکستان میں بھی ہمنوا اور شریک کار مل گئے جن کی مدد سے ملک کے اس حصے کو بھی بدگمانی، افتراق اور جنگ آزمائی کا میدان بنانا آسان ہو گیا۔

صوبہ پرستی کی اس مہم میں پنجاب کو بدنام اور کمزور کرنا بھی مقصود تھا۔ اس کی آڑ میں اسلامی اپیل کو کمزور کرنا اور ملک کے فوجی عنصر کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنا بھی مدنظر تھا۔ پنجاب کے خلاف باقی چھوٹے صوبوں کی جتھہ بندی کرنا بھی اس شق کا مقصد خاص تھا۔ تعجب ہے کہ اس وقت کی دستور ساز اسمبلی اسے نہ سمجھ سکی اور وہ اسے محض زبان (اور وہ بھی بقول ان کے پردیسی زبان) کا سوال سمجھی۔

شق ۲: پارلیمینٹ میں تقریر کے لیے بنیادی زبان انگریزی قرار پائی۔ البتہ اردو بنگلہ کو بھی بولنے کا حق دے دیا گیا۔ انگریزی کو ہر موقع پر اہم قرار دیا گیا، آزادی کا منشور تیار کیا گیا، انگریزی میں تقریر کا حق اول ملا تو انگریزی کو ان پڑھوں کے لیے اردو بنگلہ کی اجازت از راہ لطف و کرم عطا کر دی گئی۔ شکریہ۔ نوازش!

پھر پاکستانی قومیت کا یہ طغریٰ (انگریزی) بیس سال تک باقی رکھا جائے گا... اور فخریہ طور سے آج تک باقی ہے۔

شق ۳: پھر انگریزی پرست گروہ نے فرمایا کہ انگریزی بیس برس تک ملک کی سرکاری زبان رہے گی۔ اس کو شق نمبر ے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دس برس کے بعد یعنی (۱۹۵۴ء کے دس برس بعد ۱۹۶۴ء میں) ایک کمیشن مقرر کیا جائیگا۔ جو انگریزی زبان کی جگہ متبادل انتظامات کے لیے سفارشات پیش کرے گا۔ صرف سفارشات ... کون کہہ سکتا ہے کہ اس کمیشن کی رائے عالی میں سفارش یہی ہوتی ہے کہ انگریزی علی الدوام رہے کیونکہ اردو میں اہلیت نہیں لیکن بنگالیوں کا ڈر شاید مانع آ جاتا۔

اگر انگریزی کے یہ عشاق اگر شق ۳ اور ے میں مخلص ہوتے تو یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ دس برس کے لیے بدستور انگریزی زبان استعمال میں آئے گی۔ اس عرصے میں متبادل انتظامات کے لیے مرکزی حکومت مناسب تیاری کرے گی تا کہ گیارھویں برس کے بعد، کسی دفتر، دربار میں انگریزی کی ضرورت نہ رہے۔ مگر یہ سب ٹالنے کی باتیں تھیں....... ۲۰ برس کی مدت بھی خاصی ہوتی ہے۔ ان حضرات نے پکا انتظام کر لیا کہ کم از کم اپنی زندگیوں میں، انگریزی کے سوا کسی اور زبان کی ذلت گوارا کرنے کا موقع نہ آئے گا۔

انگریزی کے پرستاروں نے سکھ کا سانس لیا... ، اور لارڈ میکالے کی روح آسودہ ہوئی کہ اس کی ذریت ابھی مغلوب نہیں ہوئی، بعض عقلا فرماتے ہیں کہ انگریزی کے بغیر فوری طور سے کام چلنا دشوار ہوتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں اس لیے میں نے دس سال کا عبوری زمانہ تجویز کیا ہے۔ اس شرط پر کہ اس عرصے میں وہ متبادل زبان کو دفتری کاموں کے لیے تیار کرنے کا مخلصانہ اہتمام کریں۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ سوئیکارنو نے انڈونیشیا میں ملائی زبان میں دفتری کام کم سے کم مدت میں کیسے چلا لیا تھا؟ چین میں کیسے چلا اور باقی ملکوں میں کیسے چل رہا ہے؟

پاکستان کے افسر نے ذاتی سہولت کو مدِ نظر رکھا۔ اسے اردو یا بنگلہ میں خود کو ڈھالنے کے لیے تھوڑی سی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ شاید وقار کا مسئلہ بھی ہو۔ انگریزی میں رعب زیادہ پڑتا ہے۔

انھوں نے یہ انتظام بھی پکا کرلیا کہ تمام صوبائی زبانوں کو یہ حق دے دیا کہ وہ جب چاہیں سرکاری زبانیں بن جائیں اور اس معاملے میں بنگلہ والے ان کے مؤید تھے۔ ہمارے افسر جانتے تھے کہ دفتروں کی حد تک آٹھ زبانوں کا متبادل انتظام نہ کوئی کرے گا، نہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سنگ بنیاد مضبوط ہے یعنی انگریزی ہی چلے گی۔ [۳۳]

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مشرقی بنگال کی خواہش کو پورا کر دیا گیا اور بنگلہ زبان کو اردو زبان کے مساوی حق دے دیا گیا تھا لیکن بنگال میں شورش بدستور موجود رہی اور علیحدگی پسند تحریکیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے کام کرتی رہیں۔ اصل جنگ سیاسی اقتدار و اختیارات کی تھی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

"مشرقی پاکستان کے لوگ (مسلم + ہندو) قیام پاکستان سے پیدا شدہ نئی صورتحال سے جس میں جمہوریت کو ایک اصول کار بنا لیا گیا تھا پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے اور یہ فائدہ یوں حاصل ہو سکتا تھا کہ بر بنائے اکثریت آبادی، اقتدار میں غالب شرکت یا اگر یہ نہ ہو سکے تو مغربی پاکستان کو بدنام کر کے غیر معمولی حقوق حاصل کرنا اور اس کے لیے علیحدگی کی دھمکی بھی دیتے رہنا۔" [۳۴]

قیام پاکستان کے وقت دو بنیادی باتوں کا پرچار کیا گیا (۱) اسلام اور (۲) جمہوریت و مساوات۔ لیکن ان دونوں اساسیات پر عمل نہیں کیا گیا۔ دستور ساز اسمبلی میں اسلام کے بارے میں بے دلانہ سا رویہ اختیار کیا گیا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دستور کی پہلی صورت میں اسلامیہ کا لفظ موجود ہی نہیں تھا۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اب جنگ مفاداتی تھی نظریاتی نہیں۔ اس میں اہم کردار عوام کے اس روشن خیال طبقے کا تھا جس نے

ایک عظیم سازش کے ذریعے مشرقی پاکستان میں اسلامی جذبوں کو کمزور کر کے ہندو سازشوں کو کامیاب کرایا اور مغربی پاکستان میں اردو اور اسلام کی اپیل کو ضعیف کر دیا۔ اس کی وجہ سے خالص مفاداتی ذہن پیدا ہو گیا جس کے بعد پاکستان کی اصلی غایت اور روح بے جان ہو گئی اور مفاداتی عنصر غالب آ گیا۔ ۳۵

۱۹۵۶ء کے آئین کو اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ختم کر دیا گیا اور مارشل لاء کا پہلا دور شروع ہوا ۳۶ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں انگریزی زبان کو ثانوی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے عہد میں صوبائی سطح پر اچھے پبلک سکول قائم کئے گئے جہاں ذہین طلبہ کی تربیت کی جا سکے۔ سیاستدانوں اور ان کے سیاسی کاموں کے بارے میں اپنی کتاب "Friends Not Masters" میں انھوں نے کچھ اس طرح اظہار کیا ہے کہ

> "خواجہ ناظم الدین اور نورالامین میری بات سمجھ رہے تھے لیکن وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے یا اس کے اہل نہیں تھے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس بات سے خوفزدہ تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ پبلک سکول قائم کرنے پر عمومی ردعمل اس کی حمایت میں نہیں جائے گا۔" ۳۷

فیلڈ مارشل ایوب خان کے عہد میں یہ کوشش بھی رہی کہ آئندہ ملک کا نظم و نسق سنبھالنے والوں کی تربیت میں انگریزی عنصر لازماً موجود رہے۔ اس مقصد کے لیے متعدد کیڈٹ کالج اور اکیڈمیاں قائم کی گئیں۔ ۳۸ فوج میں انگریزی زبان کو اس قدر فروغ ہوا کہ ایک رپورٹ مرتب کی گئی جس میں کہا گیا کہ "اس فوج کے افسروں کے درمیان استعمال کی زبان انگریزی ہوگی۔" اس رپورٹ کو منظر عام پر آنے نہیں دیا گیا۔ ۳۹

فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں چونکہ ۱۹۵۶ء کا دستور اساسی کالعدم ہو گیا تھا چنانچہ مختلف معاملات کو از سر نو دیکھنے کے لیے مختلف کمیشن قائم کئے گئے، ان میں ایک شریف تعلیمی کمیشن بھی تھا۔ اس کے صدر، ایس ایم شریف تھے ۴۰ اس کے اراکین میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، کرنل ایم کے فریدی، ایس۔ حمید شیخ، اے۔ ایف۔ ایم عبدالحق، اے۔ ایف اطوار حسین، منتظر الدین احمد، بی۔ اے ہاشمی، محمد خان، اور ایم۔ اے رشید شامل تھے۔ ۴۱

اس کمیشن نے اردو اور بنگالی کو عوامی (غیر خواص) سکولوں میں چھٹی سے اوپر کی جماعتوں کے لئے ذریعہ تعلیم بنانے کا اعلان کیا جب کہ اس سے سندھی پر جو ان دنوں عوامی سکولوں میں ذریعہ تعلیم تھی، مضر اثرات مرتب ہوئے لیکن اس سے انگریزی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ۴۲ انگریزی سکولوں کا دفاع یوں کیا گیا اور فوجی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

"جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ انگریزی پر لازم ہے کہ قومی زبانوں کو وہ بالاتر حیثیت دے جو اسے تعلیمی نظام میں حاصل ہے تو ہمیں اس بات کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے کہ انگریزی کی ہمارے نظام میں مستقل حیثیت ہونی چاہیے۔" ۴۳

اس رپورٹ میں گو کہ پاکستانی زبانوں کے مسئلے کو خالصتاً قومی نظریہ سے حل کرنے کی کوشش کی گئی اور قومی زبان (یا زبانوں) کو قومیت کا قوی ترین حصہ قرار دیا لیکن اس کے باوجود بدقسمتی سے انگریزی غالب رہی۔
شریف کمیشن نے اپنی رپورٹ ۲۶ اگست ۱۹۵۹ء کو پیش کردی۔ حکومت نے ان سفارشات کو ۶ اپریل ۱۹۶۰ء میں منظور کرلیا۔ ان سفارشات پر عملدرآمد کے لیے تعلیمی سال ۱۹۶۱ء ۱۹۶۲ء قرار پایا۔ لیکن مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے طلباء کی طرف سے کمیشن کی اصلاحات کے خلاف جو خصوصاً سہ سالہ ڈگری کورس سے متعلق تھیں، مظاہرے شروع ہو گئے۔ حکومت ان مظاہروں سے پریشان ہوگئی اور حمود الرحمان کمیشن کا اعلان کردیا گیا جو طلبہ کی بہبود اور مسائل کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ یہ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء کو قائم کیا گیا۔ اس کمیشن کے سربراہ جسٹس حمود الرحمان، جج سپریم کورٹ، اراکین میں جسٹس ایس۔ اے رحمان، قاضی انوار الحق، چیئرمین مرکزی پبلک سروس کمیشن اور ڈاکٹر ممتاز الدین وائس چانسلر راجشاہی یونیورسٹی شامل تھے۔ پروفیسر خواجہ منظور حسین اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۴۴

کمیشن کی تشکیل کا مقصد شریف کمیشن کے ان حصوں کی ترمیم کرنا تھا جس پر اعتراض تھا لیکن عملاً اس کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ اس کمیشن نے شریف کمیشن کی سفارشات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی بلکہ انگریزی زبان کی اہمیت پر زیادہ زور دیا۔[۴۵]

کمیشن نے ان سکولوں کا دفاع کیا جو خاص طور پر مذہبی آزادی کے نام پر مشنری سکولوں اور اعلیٰ کارکردگی کے نام پر دوسرے سکولوں کا دفاع کرتے ہیں[۴۶] اس موقع پر کمیشن نے یہ استدلال پیش کیا کہ ان سکولوں سے سول اور فوجی انتظامیہ کی قیادت (خواص) پیدا ہوتی ہے اس میں کہا گیا:

> "اس قسم کے ادارے بہتر طلبہ پیدا کرتے ہیں جو زیادہ موزوں، نظم و ضبط کے خوگر اور ملک کے دفاع کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے یا سرکاری، نیم سرکاری یا نجی اداروں میں دیگر انتظامی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہوتے ہیں۔"[۴۷]

حمودالرحمٰن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں انگریزی زبان کو مزید مستحکم کیا جس کو شریف کمیشن میں تحفظ دیا گیا تھا۔

فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں ۱۹۶۱ء میں ملک کو دوسرے دستوری مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اس دستور میں ۱۹۵۶ء کے دستور کے اس فیصلے کو برقرار رکھا گیا جو قومی زبان اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے بارے میں کیا گیا تھا۔ لیکن اردو زبان کے نفاذ کے لیے تقریباً پندرہ سال کی مدت طلب کی گئی تھی تاکہ اس دوران قومی زبانیں انگریزی کی جگہ لینے کے لیے مناسب ترقی کر سکیں۔ اس دوران سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد کو مغربی پاکستان کی انتظامی ذریعہ تعلیم میں ضم کر دیا گیا۔ اس لیے ۱۹۵۶ء کے آئین میں اور مارشل لاء کے دستور ۱۹۶۲ء میں جب دو زبانوں کا تصور دیا گیا تو اس سے یہی مراد تھی کہ مشرقی پاکستان کی قومی زبان بنگلہ ہے اور اردو صرف مغربی پاکستان کی قومی زبان ہے اور ان دونوں پر فوقیت حسب سابق انگریزی ہی کو حاصل ہے تاہم ان زبانوں کی وسعت الفاظ کو ترقی دینے کے لیے جولائی ۱۹۵۸ء میں (مارشل لاء سے تین ماہ قبل) مرکزی وزارت تعلیم نے دو بورڈ قائم کیے۔ ایک کا کام اردو زبان کو ترقی دینا تھا اور دوسرے کا کام بنگلہ زبان کو وسعت دینا تھا۔ ان دونوں

بورڈوں کے ذمہ اردو اور بنگلہ زبان کی لغات تیار کرنا قرار پایا۔ ۴۸؎

۱۹۶۲ء کے آئین میں مملکت کی دو قومی زبانیں بنگلہ اور اردو قرار دینے سے قومیت کی تشکیل کی نفی ہوئی اور اس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ لیکن لسانی مسئلہ قومی زبان کے مقام اور منصب کے حوالے سے سیاسی صورت اختیار کر چکا تھا جسے کسی طرح حل کرنا کہ ایک زبان (اردو) کو تسلیم کیا جائے، آسان نہ تھا۔ دو زبانوں سے لسانی فاصلہ رونما ہوا تھا۔ جو مغربی اور مشرقی پاکستان کے امکانی فاصلے کو اور زیادہ شدت سے نمایاں کرتا تھا۔ ایوبی حکومت ایسے فاصلے کم کرنے کی کوششوں میں مصروف رہی اور اردو اور بنگلہ کو قریب تر لانے کی تدابیر پر غور وخوض ہوا اور پاکستان کے دونوں حصوں میں دونوں زبانوں کی ترویج کے لیے کوششیں کی گئیں۔ دونوں زبانوں بنگلہ اور اردو کے رسم الخط بھی جدا تھے جو دو وحدتوں کو آشکار کرتے تھے۔ دیوناگری اور فارسی رسم الخط کو کسی ایک وحدت میں سمونا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ اسکے لیے یہ حل تجویز کیا گیا کہ قومیت کی وحدت کے لیے رسم الخط کو تبدیل کر دیا جائے اور جمہوریہ ترکیہ کے اقدام کی روشنی میں اردو اور بنگلہ کے لیے رومن رسم الخط کو اختیار کیا جائے۔ لیکن یہ تجویز مسترد کر دی گئی اس کے بعد مغربی پاکستان میں بنگلہ زبان کو فارسی رسم الخط میں تحریر کرنے کا رواج پایا مگر اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ قومی یکجہتی کونسل کی کوششوں کے باوجود اردو اور بنگلہ ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں اور فائدہ انگریزی زبان کو ہوتا رہا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اہل علم اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ انگریزی ہی میں رابطہ قائم کرتے رہے اور اس طرح ۱۹۶۲ء کے آئین میں انگریزی ہی سرکاری زبان کا قومی مفہوم میں کردار ادا کرتی رہی۔ ۴۹؎

فیلڈ مارشل ایوب خان کے دورِ اقتدار میں دو مرتبہ صوبائی اسمبلی میں اردو بل پیش کیا گیا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں علامہ رحمت اللہ ارشد نے اردو بل پیش کیا جو مختلف رسمی مراحل میں تھا کہ نئی اسمبلی وجود میں آ گئی اور یہ بل صحیفہ ماضی بن گیا۔ دوسری مرتبہ یہی بل خواجہ محمد صفدر نے پیش کیا یہ صوبائی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد تھے۔ حزب اقتدار نے اسے اپنا وقار کا مسئلہ بنا کر کمیٹیوں اور اسٹینڈنگ کمیٹیوں کے چکر میں ڈال دیا۔ اس طرح قومی زبان کا یہ اہم بل طبقہ خواص کے سیاسی وقار کی بھینٹ چڑھ گیا۔ لیکن اس بل کو قومی زبان کے دفتری نفاذ کے لیے مشتہر کیا گیا اور مختلف سرکاری و نیم سرکاری اور خود مختار اداروں کے ذریعے

دفتری زبان کی تبدیلی کے سلسلے میں رائے طلب کی گئی۔ یہ بات خوش آئین تھی کہ ماہرین اور حکام کی اکثریت اردو کو دفتری زبان بنانے کے حق میں تھی۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کی یونیورسٹیوں کے اصحاب فکر اور ٹیکنیکل یونیورسٹیوں کے نمائندوں نے بھی قومی زبان اردو کے حق میں فیصلہ دیا جو ایک خوشگوار ذہنی تبدیلی تھی لیکن یہ امر تکلیف دہ تھا کہ اسمبلی کی حکمران اکثریت نے بل منظور نہ ہونے دیا۔۵۰

۱۹۶۱ء میں انگریزی کی جگہ اردو کے سائن بورڈ لکھنے کی مہم چلائی گئی ۵۱ مغربی پاکستان یوتھ موومنٹ جو ۱۹۵۳ء میں قائم ہوئی، اردو کی حمایت میں سرگرم ہوگئی اور اس نے پنجاب یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو کرنے کے حق میں دستخط حاصل کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔۵۲ ہر سال اردو کانفرنسیں منعقد کی جانے لگیں اور زندگی کے ہر شعبے میں انگریزی کی جگہ اردو نافذ کرنے کے مطالبے کے لیے مظاہرے کیے جانے لگے۵۳ اس کے باوجود ۱۹۶۹ء میں ایوب دور کے اختتام پر اردو کے حامیوں کے نقطہ نظر سے دگرگوں تھی۔ اس دور میں اردو میٹرک تک تمام اسکولوں میں لازم تھی بلکہ انٹر کی سطح پر بھی اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، مرکزی اردو بورڈ اور مجلس ترقی ادب جیسے ادارے لاہور میں کام کر رہے تھے اور صدر بھی ہر ماہ اردو میں تقریر کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ محض دکھاوا تھا کیونکہ استحقاقی عہدوں پر تقرر اب بھی انگریزی کا مرہون منت تھا۔اعلی منتخب حلقوں میں داخلے کے لیے اب بھی انگریزی پر عبور لازم تھا۔۵۴

۱۹۶۹ء میں پہلا فوجی دور بحالی جمہوریت کی تحریک کے نتیجے میں اختتام کو پہنچا۔ ملک میں دوسرا مارشل لاء نافذ ہوا۔ نئی فوجی حکومت نے "لیگل فریم ورک آڈر" دیا۔ جس کے نتیجے میں وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر دیا گیا، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین مساوات (parity) کے اصول کو ختم کر دیا گیا اور آبادی کی بنیاد پر صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات کرانے کا فیصلہ ہوا جو ۱۹۷۰ء کے آخر میں ہوئے۔۵۵ یحیٰ خان نے برسرِ اقتدار آتے ہی ائیر مارشل نور خان کی سربراہی میں ایک نیا تعلیمی کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن کا مقصد شریف کمیشن اور حمود الرحمٰن کی سفارشات کے حوالے سے تعلیمی مسائل اور طلباء کے مسائل پر تحقیقات کرنا تھا۔ اس کمیشن نے بڑی مستعدی سے کام کیا اور جولائی ۱۹۶۹ء میں اپنی سفارشات مرتب کر کے پیش کر دیں۔۵۶

لسانی تجاویز کے آغاز میں ان رکاوٹوں کا ذکر ہے جن کی وجہ سے قوم میں صحیح معنوں میں ربط و یکجہتی پیدا نہیں ہو سکی۔ ان میں ایک زبان کی رکاوٹ بھی بتائی گئی ہے۔ سفارشات کے صفحہ ۳ کی شق ۶ کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"برٹش راج کی وراثتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سرکار دربار کی زبان انگریزی ہے جبکہ عوام الناس کی زبان یہ نہیں۔ نتیجہ یہ کہ افسر لوگ عوام کے جذبات اور امنگوں سے بالکل بے خبر ہیں اور یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے۔"

"ہماری تعلیمی حکمت عملی قدرتی طور سے افسروں کے خیالات و مقاصد کی ترجمان رہی ہے اور وہ خیالات و مقاصد انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے پر مصر رہے خصوصاً کالج کی سطح پر لیکن اب ہمیں یہ پالیسی ترک کرنی پڑے گی (یعنی انگریزی ذریعہ تعلیم کو چھوڑنا پڑے گا)۔"

"تعلیم کی اعلیٰ سطح پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے میں حاکم اور محکوم کی تفریق کا تاثر پایا جاتا ہے جسے جاری رکھنا بے حد نقصان دہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے جاری رکھنے سے کھاتے پیتے گھرانے تو ایک مفاد یافتہ گروہ کے مانند ان بچوں پر تفوق حاصل کر لیتے ہیں جو دیسی ماحول سے آتے ہیں اور کم مایہ والدین کے بچے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ قومی ضیاع ہے اگر قومی زبانوں کا ذریعہ تعلیم خاص اور عام سب کے لیے یکساں ہو تو عام بچے، مفاد یافتہ طبقے کے بچوں سے کسی طرح کم نہ ہوں گے۔"

"لیکن محض انگریزی ذریعہ تعلیم کو بدل دینے سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک دفتری سرکاری زبان انگریزی ہی رہے گی۔ اس وقت انگریزی ذریعہ تعلیم کے لیے بھی جواز رہے گا۔ حاکم لوگ انگریزی استعمال کرتے رہیں گے اور اس طرح حکام (خواص) اور عوام کے درمیان خلیج حائل رہے گی۔ گورنمنٹ (یعنی ایوب گورنمنٹ) نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۹۷۴ء میں قومی زبانوں کو دفتروں میں استعمال کرنے کا آغاز ہو جائے گا۔"

"لیکن ہماری رائے میں، موجودہ تجویز میں ہم نے دفتری زبان کی تبدیلی کے لیے
سفارشات کی ہیں، ان ہی کو موجودہ حکومت کی سرکاری حکمت عملی سمجھنا چاہیے۔" ۵۷

کمیشن نے انگریزی ذریعہ تعلیم رکھنے کے نقصانات میں یہ نکتہ اُٹھایا کہ یہ لوگ (بقول میکالے) کالے انگریز ہوتے ہیں۔۵۸ اردو، بنگلہ اخبار تک نہیں پڑھتے۔ اپنی عادات واذواق میں انگریز بنتے اور خود کو عامۃ الناس سے اونچا سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں، صرف مغربی تصورات کو حقیقی تصورات سمجھ لیتے ہیں اور مغربی ہیروان کے ہیرو بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے عوام کے یہ خیالات نہیں لہٰذا ان کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ قوم میں وحدت خیال نہیں ہو پاتی۔ کئی کلچر بیک وقت متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا سفارش ہوئی کہ انگریزی پر بے جا زور دینے کی حکمت عملی ترک کر دینی چاہیے۔ اور ہماری تعلیم کا ذریعہ درس وامتحان ابتداء سے آخر تک قومی زبان کو ہونا چاہیے۔۵۹ بطور مضمون مغربی پاکستان میں اردو چھٹی سے دسویں جماعت تک لازمی اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ اسی طرح لازمی۔ صوبوں میں ۱۹۷۴ء تک اور مرکز میں ۱۹۷۵ء تک دفتری زبان انگریزی کو ہر حال میں ترک کر دیا جائے اور بنگالی اور اردو بورڈ تعلیمی زبان کو پوری طرح باثروت بنانے کی کوشش کریں۔ مرکزی حکومت کے ملازمین اردو اور بنگالی دونوں میں دسترس پیدا کریں۔۶۰

نور خان تعلیمی کمیشن نے انگریزی ذریعہ تعلیم کا راستہ بند نہیں کیا تھا اور کیڈٹ کالجوں، مشنری اسکولوں اور یورپین ٹائپ اداروں میں انگریزی کو نہیں چھیڑا تھا، لیکن اس کے باوجود انگریزی زدہ طبقے نے دستخطوں کی ایک مہم چلائی اور قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے مابین تصادم کی فضا پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ جبکہ نور خان تعلیمی کمیشن میں قومی زبان اور علاقائی زبانوں کا اب کوئی جھگڑا باقی نہیں رہا تھا۔ صرف انگریزی کو اداروں سے خارج کرنے کا تھا لیکن مفاد پرستوں نے اس بات سے فائدہ اُٹھایا کہ اس کمیشن میں علاقائی زبانوں کا کہیں تذکرہ موجود نہیں تھا۔ جو شکوک وشبہات پیدا کر رہا تھا۔۶۱

مشرقی پاکستان میں اس کمیشن کی تجاویز پر اطمینان کا اظہار کیا گیا لیکن اب مشرقی پاکستان شدید بحران کی زد میں آ چکا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے اثرات کی وجہ سے اب مسئلہ لسانی نہ تھا بلکہ مغربی پاکستان کے غلبہ سے نکل جانے کا تھا۔۶۲ دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان دولخت ہوگیا اور ایک نئے اسلامی ملک بنگلہ دیش کا وجود نقشے پر ابھرا۔ اب ایک ملک اور دو قومی زبانوں کا اختلاف بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ سقوط ڈھاکہ (۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء) کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پیپلز پارٹی نے پاکستان کی حکومت سنبھالی اور ذوالفقار علی بھٹو صدر مملکت کے عہدے پر فائز ہوئے... صوبوں میں نئے گورنروں کا تقرر ہوا۔ پنجاب اور سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی جب کہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط حکومتیں قائم ہوئیں۔ ۶ مئی ۱۹۷۲ء کو بلوچستان کے گورنر غوث بخش بزنجو نے اعلان کیا کہ صوبے کی دفتری زبان اردو ہوگی۔ اس کے کچھ عرصے بعد سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل نے اپنے صوبے میں اردو کو دفتری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ معراج خالد نے ایک سال کے اندر اندر اردو کو بحیثیت دفتری زبان رائج کرنے کا اعلان کیا۔ جبکہ صوبہ سندھ کی اسمبلی نے ۷ جولائی ۱۹۷۲ء کو زبان کے بارے میں ایک بل منظور کیا کہ:

۱۔ صوبہ سندھ میں سندھی زبان صوبائی زبان کے طور پر نافذ ہوگی۔

۲۔ صوبہ سندھ کے سکولوں میں چوتھی جماعت سے بارہویں جماعت تک سندھی اور اردو لازمی مضمون ہوں گے۔

۳۔ اگر حکومت سندھ چاہے تو سندھی زبان کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں اور اسمبلی میں زیادہ سے زیادہ استعمال کے انتظامات کر سکتی ہے۔۶۳

اس قرارداد پر کراچی میں ردِعمل سامنے آیا اور فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ کراچی سے پورے صوبہ سندھ میں پھیل گیا۔ مفاداتی مسئلہ نے لسانی مسئلے کی صورت اختیار کر کے انسانیت کشی کی راہ اختیار کر لی اس موقع پر ذوالفقار علی بھٹو نے فریقین کے درمیان سمجھوتے کی راہ تلاش کی۔ پاکستان کی نئی دستور ساز اسمبلی (قومی اسمبلی) نے ۱۹۷۳ء کے شروع میں ملک کا نیا آئین متفقہ طور پر بنا لیا۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو صدر مملکت نے آئین کی توثیق کی اور ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو یہ دستور نافذ کر دیا گیا۔ آئین کی شق ۲۵۱ (۱) قومی زبان سے متعلق ہے اس آئین کے

مطابق قومی زبان کے متعلق قرار پایا[۴۶] کہ:

۱۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اسے سرکاری اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال کے اندر انتظامات کئے جائیں گے۔

۲۔ پہلی شق کے مطابق اُردو کو انگریزی زبان کی جگہ لینے کا انتظام کرنے تک انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

۳۔ قومی زبان کے (مذکورہ بالا) منصب کو کسی قسم کا گزند پہنچائے بغیر ایک صوبائی اسمبلی کو اختیار ہوگا کہ وہ جو چاہے تو قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان کی ترقی کا استعمال اور تعلیم کے لئے بھی مناسب قوانین بنائے۔

اس آئین کے مطابق اُردو کو پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے ملک کے منتخب نمائندوں نے متفقہ طور پر تسلیم کیا۔ ایک بار پھر پندرہ سال کا ایک طویل وقت قومی زبان کے نفاذ کی تیاری کے لئے رکھا گیا اور انگریزی کی بالادستی بدستور ۱۹۸۸ء تک قائم رکھی گئی۔

صوبائی سطح پر کسی صوبائی زبان کو سرکاری زبان بنانا مطلوب ہو تو صوبائی اسمبلی مناسب قوانین بنا سکے گی اور ایسا کرتے وقت قومی زبان اُردو کے منصب اور حقوق کو کوئی گزند نہ پہنچے گا اور علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ اُردو بھی مناسب سطح پر استعمال میں آتی رہے گی۔

مملکت پاکستان میں اس کے قیام کے بعد تین دستور کا نفاذ ہوا لیکن ہر دستور میں قومی زبان اردو کی بحیثیت سرکاری زبان کے نفاذ کے لئے وقت طلب کیا گیا۔ لیکن اس کے نفاذ کی نوبت نہیں آئی۔ مجلس زبان دفتری ۱۹۷۹ء سے برابر اُردو زبان کے فروغ کے لئے کام کرتی رہی اور اس نے دفتری اصطلاحات، دفتری کیفیت نگاری اور جائزہ رپورٹوں پر وسیع ذخیرہ مرتب کر لیا لیکن اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔

۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق ۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات کرائے گئے۔ عوام نے ان نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ملک ایک بڑے بحران کا شکار ہوا اور ایک بڑی عوامی تحریک کے نتیجے میں ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو پاکستان میں تیسرا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس مرتبہ آئین معطل کر دیا گیا۔ جو بہر حال

ایک اطمینان بخش پہلو تھا۔۶۵ ان حالات میں ۱۹۷۶ءاور ۱۹۷۷ء میں دوقومی اکابرین قائداعظم اور علامہ اقبال کے صد سالہ یومِ ولادت پر کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ قائداعظم نے ایک ملک، دو سرکاری زبانوں کے تباہ کن مضمرات کا احساس کرتے ہوئے اس کے انجام سے ہمیں بچانے کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی اور ایک پرانے جہاز ڈیکوٹہ میں ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے جبکہ علامہ اقبال اپنی "لسانی عصبیت" کو "دینی عصبیت" سے کسی طرح کم نہیں سمجھتے تھے۔۶۶ یہ وہ ہستیاں تھیں جنھوں نے قوم کو متحد رکھنے میں اپنی توانائیاں صرف کیں تھیں۔

ان دونوں مواقع پر مقتدر شخصیات کی طرف سے قومی زبان اُردو کے بارے میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا گیا۔ ۱۱دسمبر ۱۹۷۶ء کو لاہور میں قائداعظم اُردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے جسٹس سجاد احمد جان (چیف الیکشن کمشنر) نے اپنے خطبہ اختتامیہ میں فرمایا!

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر بحثیت مجموعی ایک قوم کی یہ سوچ ہو جائے جو ایک غیرت مند قوم کی ہونا چاہیے۔ اور وہ یہ طے کرلے کہ اسے اپنی قومی زبان کو فخر ومباہات کے ساتھ اپنانا ہے اور آگے بڑھنا ہے تو پھر کون سا خارجی عنصر یا طاقت اس کے راستے میں حائل ہوسکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ایک طویل عرصے میں غلامی کے بہت سے مہلک اثرات میں سے ابھی تک ہمیں نجات نہیں مل سکی۔ انھیں میں سے ایک انگریزی زبان کا تسلّط ہے جس کی برتری ہمارے ذہنوں پر سوار ہے۔ اپنے دلوں کو ٹٹولیے اور بتایئے کہ کیا ابھی تک اونچی اور درمیانی سطح کا پڑھا لکھا طبقہ انگریزی کے استعمال کو وجہ تفاخر اور عظمت خیال نہیں کرتا۔ کیا یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ نہیں ہے کہ اچھی بھلی اُردو کی گفتگو کے درمیان انگریزی کے جملے محض رعب ڈالنے یا اعلیٰ تہذیب اور تربیت کے لئے ٹھونس دیئے جاتے ہیں اور اکثر اوقات تو انگریزی اور اُردو کو اس طرح خلط ملط کردیا جاتا ہے کہ دونوں کا حلیہ بگاڑ کر نئی قسم کی اُردو نما انگریزی یا انگریزی نما اُردو جنم لے لیتی ہے۔ بظاہر یہ ہماری نئی نام نہاد ترقی یافتہ

تہذیب کا شگوفہ ہے۔ لیکن میں اسے اپنی تہذیب کی سر عام رسوائی سمجھتا ہوں اور اس ذہنیت کو اپنی زبان کہتا ہوں تو بے انصافی اور اس کے بارے میں احساس کم مائیگی اور کمتری پر محمول کرتا ہوں۔ وہ قومی زبان کسی معاشرے میں کیوں کر پنپ سکتی ہے جس کے بارے میں احساس یہ ہو جیسا کہ چند حلقوں میں اُردو کے بارے میں پایا جاتا ہے کہ اُردو تہی دامن ہے۔ یہ سائنسی دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ حالانکہ یہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ وقت اور تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُردو ایک مکمل اور جامع زبان ہے اور اس میں ایک ترقی پذیر زبان بننے کی جملہ صلاحیتیں موجود ہیں" ۶۷

اس تقریب کے ایک سال بعد ۲ نومبر ۱۹۷۷ء کو علامہ اقبال اُردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ جس کے اختتامی اجلاس میں جسٹس ایس اے رحمان نے اُردو کو سرکاری، عدالتی، تعلیمی، علمی اور کاروباری حلقوں میں رائج کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے فرمایا!

"۱۹۷۳ء کے آئین میں اُردو کی شناخت بحیثیت قومی زبان ہو چکی ہے لیکن اس اقرار باللسان کے بعد اسے عملی شکل دے کر، تصدیق بالقلب کے مظاہرے کی تا حال نوبت نہیں آئی۔ اُردو زبان اقبال کی تحریک کے خداوندوں کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور پوچھ رہی ہے کہ اقبال اور قائداعظم کے پاکستان میں کب تک اسے پس منظر کی جھلملیوں سے جھانک کر دیکھنا ہوگا کہ قومی دربار میں ایک غیر زبان اس کی مسند پر جلوہ آرا ہے۔ اُردو کا یہ مطالبہ نہیں کہ اس غاصب زبان کو دیس نکالا دیا جائے۔ وہ تو صرف اپنا جائز قومی حق مانگتی ہے۔ انگریزی کو اس کے مقام اور مرتبے کے مطابق دربار ملی میں مناسب جگہ مل جائے تو اُردو کی ملنساری اس کا خیر مقدم کرے گی۔ اگر اسی سال میں اُردو کو سرکاری، عدالتی، تعلیمی، علمی اور کاروباری حلقوں میں رائج کرنے کی طرف کوئی ٹھوس اقدام ہو سکے تو کیا یہ سال اقبال کی ایک عظیم یادگار نہ ہوگی؟" ۶۸

مندرجہ بالا مطالبے کو قبول کرتے ہوئے ضیاء الحق نے قومی زبان کے نفاذ کے لئے نیشنل لینگویج اتھارٹی (مقتدرہ قومی زبان) کے قیام کی اجازت دی تا کہ اس ادارے کے ذریعے قومی زبان کی تکمیل اور نفاذ کے مقاصد پورے ہو سکیں۔ مقتدرہ قومی زبان کا با قاعدہ قیام ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو عمل میں آیا۔ ۶۹ اس کے پہلے صدر نشین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے۔ انہوں نے اس اعلیٰ ادارے کے پہلے اجلاس میں جو ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں منعقد ہوا، میں حکومتی پالیسی کو سراہا!

"موجودہ حکومت قومی زبان کی ترویج کے سلسلے میں نہایت مخلص ہے۔ چنانچہ جب میں یورپ سے جولائی ۱۹۷۸ء میں واپس آیا، تو جناب صدر کا مکتوب ملا۔ جس میں انہوں نے قومی زبان کی اہمیت پر زور دیا تھا اور تحریر فرمایا تھا کہ اگر میں اس معاملے میں ان سے تعاون کروں تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد پس و پیش کے بغیر میں نے ہر قسم کے تعاون کا وعدہ کیا اور اس میں اپنے کسی سیاسی یا دوسرے رجحانات کو حائل نہیں ہونے دیا۔ اس کے بعد جناب صدر مملکت کی اجازت سے مختلف صوبوں کے اہل قلم و دانش کو دعوت دی گئی کہ وہ کراچی میں تشریف لا کر قومی زبان کے مسائل پر غور کریں۔ چنانچہ تمام صوبوں کے ماہرین نے اس دعوت پر لبیک کہا اور تشریف لائے اور اس مسئلے پر غور و فکر کے بعد چند بنیادی باتیں طے کیں اور یہ بھی طے ہوا کہ اس ادارے کا نام "مقتدرہ قومی زبان" "National Language Authority" ہو۔ اس کے بعد کافی عرصے حکومت کے شعبوں اور وزارتوں سے گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا اور بالآخر ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو مقتدرہ قومی زبان کے بارے میں کابینہ نے اعلان کر دیا"۔ ۷۰

صدرِ مملکت ضیاء الحق کے اس اقدام کو بہت سراہا گیا اور اس ضمن میں جنرل ضیاء الحق کا یہ بیان بھی غور طلب ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ پاکستان اور اُردو کا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ اُردو پاکستانی قوم کی آواز ہے۔ اُردو کی شناخت پاکستان سے ہے اور پاکستان کی شناخت اُردو سے ہے۔ ۷۱

صدرِ پاکستان نے اُردو کی حمایت میں ایک اور اہم اقدام یہ کیا کہ ۱۹۷۹ء سے تمام سکولوں میں کے جی سے اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔۲ے اس کو بتدریج ترقی دی گئی یہاں تک کہ ۱۹۷۹ء میں میٹرک کا امتحان اُردو میں منعقد ہونا تھا اور وزارتِ تعلیم نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ "انگریزی ذریعہ تعلیم کے سکولوں کو اُردو ذریعہ تعلیم سے بدل دیا جائے گا"۔۳ے جس پر کئی سکولوں نے عملی قدم اٹھایا اور اپنی پہلی جماعتوں میں ذریعہ تعلیم اُردو کر دیا۔۴ے اس پر انگریزی سکولوں میں زیرِ تعلیم خواص طبقے کے طلباء کے والدین کی طرف سے حکومت کو شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں بعض اخبارات نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ انگریزی داں طبقے کا بنیادی استدلال اس موقع پر یہ تھا کہ انگریزی کو ترک کرنے سے پاکستان ملکوں کی صف میں بہت پیچھے رہ جائیگا۵ے جبکہ اُردو کے حامی طبقے کا استدلال یہ تھا کہ اُردو میں مطلوبہ کتابیں موجود ہیں اور مزید ترجمہ کی جاسکتی ہیں۔ والدین چونکہ اقتدار کی زبان اپنے بچوں کو پڑھانا چاہتے تھے، اس لئے اُردو کے حامیوں نے یہ سفارش بھی کی کہ آئندہ مقابلے کے امتحان اُردو میں لئے جائیں۶ے کراچی میں اکثر سکولوں میں بھی اس حکم کی خلاف ورزی کی گئی لیکن محکمہ تعلیم نے اپنے احکامات کی خلاف ورزی پر کسی ادارے سے باز پرس نہیں کی اور نہ ہی تادیبی قدم اٹھایا۷ے بلکہ ۱۹۸۳ء میں صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق نے خواص کے انگریزی سکولوں کو اپنے اس حکم سے تحفظ دیا کہ وہ سینئر اور ہائی سینئر کیمبرج امتحانوں کی تیاری مارشل لاء حکم نمبر ۱۱۵ کے تحت کرا سکتے ہیں۔۸ے

۲۸ اکتوبر کو پاکستان ٹائمز نے اس بارے میں لکھا کہ:

> "وفاقی وزیرِ تعلیم نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کے تمام ثانوی سکولوں میں سائنس کے مضامین کے لئے انگریزی کو اُردو یا صوبائی زبان کی جگہ ذریعہ تعلیم بنانے کی اجازت دے دی جائے"

وفاقی وزیرِ تعلیم کے اس بیان سے اُردو داں طبقے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی لیکن یہ وقتی دلاسہ تھا کیونکہ مئی ۱۹۸۳ء میں ایک قانونی ترمیم کے ذریعے "غیر ملکی امتحان" کی تیاری کے نام پر قومی تعلیمی پالیسی سے انحراف کا

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

یاایھاالنبی انا ارسلنك شاھداو مبشرا و نذیرا

اے نبی! ہم نے تمہیں گواہ بنا کر، بشارت دینے والا

اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ۱۳۶

اللہ تعالٰی رب العالمین ہے۔ جس کی ربوبیت کسی وطن یا مقام سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا پیغام امن و نجات دنیا بھر کے لیے یکساں ہے۔ ۱۳۷ اسلام انسان کی وحدت اور اتحاد پر زور دیتا ہے اور یہ اصول دراصل اسلام کے عقیدہ توحید کے ساتھ وابستہ ہے۔ انسانی وحدت قائم کرنے کے لیے ایک منتخب گروہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو دوسرے انسانوں کی رہنمائی کر سکے۔ یہ منتخب گروہ مسلمان ہیں۔ ۱۳۸

ارشاد الٰہی ہے کہ:

انماالمومنون إخوة

تمام مومن بھائی بھائی ہیں۔ ۱۳۹

تمام مسلمان ملت اسلامیہ کے رکن ہیں اور ملت کی تنظیم کے ذریعہ انسانیت کے اتحاد و ترقی کی کوشش کرتے ہیں۔ ملت کی بنیاد توحید اور ختم نبوت کے بنیادی اصولوں پر قائم ہے توحید کا اصول اطاعت خداوندی کی دعوت دیتا ہے اور انسانی اعمال کی رہنمائی کرتا ہے۔ نبوت کی وجہ سے ملت کا نظم و ضبط قائم ہے۔ حضور اکرمؐ ملت کے رہنما ہیں۔ ملت کی تنظیم کا تصور قومیت کے اس محدود نظریے کو رد کرتا ہے جس کی بنیاد جغرافیائی اتصال یا رنگ و نسل اور لسانی اتحاد پر ہے۔ مسلم ملت کی بنیاد دین ہے۔ اس لحاظ سے تمام مسلمان خواہ وہ کسی ملک، نسل یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں، ملت کے اراکین متصور ہونگے۔ ۱۴۰

ملت اسلامیہ کے افراد مختلف زبانیں بولنے، مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے، مختلف رنگوں کے حامل ہونے، مختلف علاقائی حدود میں بسنے اور مختلف لباس اور مقامی رسم و رواج رکھنے کے باوجود ایک ہی طرز پر سوچتے اور ایک

ہی سر چشمہ ہدایت سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ملت واحدہ پر زور دیتی ہے۔ اسلام ایک ایسے آفاقی نظام کے قیام کا خواہش مند ہے جس میں نظریہ اور عمل میں مکمل اتفاق و یگانگت پائی جائے، جو تمام بنی نوع انسان کے ہر شعبہ زندگی میں رہنمائی کرے۔ ۱۴۱

حافظ ابن تیمیہ بیان فرماتے ہیں کہ "بعثت رسل کی غرض و غایت یہی ہے کہ اولاد آدم کو اللہ کے قانون سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی صلاح و فلاح کی تکمیل کر سکیں۔ ان کی عقل مادیت و نفسانیت کی کثافتوں اور ظلمتوں سے پاک ہو کر علم حق کے ادرکات سے روشن و منور ہو جائے، نفسانی اور شیطانی افعال اور گندہ خصلتوں سے نجات پا کر پاکیزہ، اخلاق اور معاشرہ انسانی تمدن کی عظمت و سعادت کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ انسانی حیات اور امن عالم کو تباہ کرنے والی چیز نفس کی خواہشات ہیں۔ وحی الٰہی اور قانون خداوندی نے قدم قدم پر نفس کی شہوتوں پر جو پابندی عائد کی ہے وہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں۔ اہل عقل کے لیے قانون شریعت کے مستحسن ہونے کی یہی بہت بڑی دلیل ہے۔ ۱۴۲

ابتدا آفرینش عالم میں نبوت و رسالت بہ شکل خلافت و بادشاہت نمودار ہوئی۔ حضرت آدمؑ نبی اور رسول بھی تھے اور خلیفہ و بادشاہ بھی۔ حضرت آدمؑ کے بعد نبوت مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئی۔ کبھی نبوت و رسالت کا ظہور بہ صورت سلطنت و حکومت ہوا جیسے حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کہ وہ نبی بھی تھے اور حکومت و سلطنت کا مقام بھی اللہ نے ان کو عطا کیا تھا۔ انہوں نے خلافت الٰہیہ کے امور بے مثال حکمرانی کی شکل میں انجام دیے۔ یہی نمونہ ذوالقرنین کی حکومت کا تھا جو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی اور کبھی نبوت و رسالت کا ظہور بصورت علم و حکمت ہوا جس کا نمونہ حضرت لقمانؑ تھے اور کبھی بہ صورت زہد اور درویش ہوا جیسے حضرت زکریاؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔ یہ سب حضرات زہد و تقویٰ اور درویش کے پیکر تھے اور ان کی رسالت و نبوت اسی رنگ میں ظاہر ہوئی۔ ۱۴۳

ان سب کے بعد خاتم الانبیاء المرسلین حضرت محمدؐ چونکہ افضل الرسل اور خاتم الانبیاء تھے اس وجہ سے آپ کی نبوت و رسالت من جانب اللہ ان تمام صورتوں کو جامع ہوئی۔ آپ کی نبوت میں جہاں علم و حکمت، زہد و تقویٰ، صبر و حلم اور فقیری و درویشی تھی۔ اسی کے ساتھ بادشاہت و سلطنت بھی جمع فرما دی گئی۔ لیکن یہ بادشاہت ملوکیت نہ

تھی بلکہ خلافت الٰہیہ تھی۔ اللہ کے احکام کو اس کی تعلیمات وہدایات کی روشنی میں اسلامی ریاست کا تصور بھی نہیں بلکہ اس کے عملی خطوط وحدود سے بھی پوری طرح واقف ہو کر اس رحمت وعافیت میں حصہ دار بن جائے جو رحمت لیکر آپ دنیا میں مبعوث ہوئے اور رحمت العالمین (تمام جہانوں کے لیے رحمت) کا لقب پایا۔[۱۴۴]

حضورؐ کا آغاز نبوت فقیری و درویشی سے ہوا۔ اسی حالت میں تیرہ سال مکے میں گزارے۔ دشمنان اسلام نے کوئی نوع ظلم وستم کی ایسی باقی نہ چھوڑی کہ جو آپ پر اور آپؐ کے اصحاب واحباب پر اس کا تجربہ نہ کیا گیا ہو۔ ان حالات کے باوجود وحی خداوندی سے یہ بشارت آپؐ کے اصحاب وامت کو دی جارہی تھی کہ گھبرائیں نہیں ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ ان کو روئے زمین کی بادشاہت اور داؤد وسلیمان اور ذوالقرنین جیسی بے مثال سلطنت عطا کریں گے۔[۱۴۵]

سورۃ نور آیت نمبر ۷ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا،
جیسا کہ انکو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو جس کو اس نے
انکے واسطے پسند کیا ہے، جما دے گا اور ان کو انکی اس بدامنی کے بدلے امن دے گا،
میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔[۱۴۶]

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

والذین ھاجرو فی الله من بعد ماظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنه ط

ولا جرالاخرۃ اکبر م

اور جنہوں نے گھر چھوڑا خدا کے لیے ستائے جانے کے بعد ہم انکو دنیا میں اچھا
ٹھکانہ دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔[۱۴۷]

تیرہ سالہ مکی زندگی کے بعد ہجرت کا حکم ہوا۔ آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہ نے ہجرت کی۔ ہجرت کے بعد اسلام کے عروج وترقی کا دور شروع ہوا۔۱۴۸

قرآن کریم میں جہاد کا حکم نازل ہوا کہ:

ادن للذین یقتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علی نصرھم تقدیرo

جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں بھی جنگ کی اجازت دی گئی

کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ انکی مدد پر قادر ہے۔۱۴۹

جہاد کے حکم کے بعد غزوات وسرایا کا آغاز ہوا حتی کہ ۸ ہجری میں سرزمین مکہ فتح ہوئی جس کو آٹھ برس قبل بحالت مجبوری چھوڑ کر ہجرت کی تھی اور فتح مکہ کے بعد پورا حجاز اور نجد اور پھر یمن فتح ہوا۔ اس تمام وسیع علاقے پر اسلامی ریاست کا قیام ہوا۔ اسی دور میں غیر قوموں سے معاہدے بھی ہوئے اور جو علاقہ بھی فتح ہوتا رہا اس میں نفاذ اسلام کا عمل کلی طور پر پورے استحکام کے ساتھ جاری ونافذ ہوتا رہا۔ مسلمانوں کے اموال واراضی پر زکوٰۃ وعشر کا حکم جاری ہوا تو غیر مسلموں پر جزیہ اور خراج لازم کیا گیا۔ مقدمات کے فیصلوں کے لیے اسلامی عدالتیں قائم کی گئیں کیونکہ کسی بھی اسلامی مملکت میں کسی ایسی عدالت کا وجود ناقابل تصور ہے جس میں مقدمات کے فیصلے اللہ اور اسکے رسول کے قانون کے مطابق نہ کیے جاتے ہوں۔ اقامۃ عدل اور اقامۃ امن وامان کو اقامۃ صلوٰۃ کی طرح قائم کرنے کے لیے والی اور قضاء مقرر کیے گئے جیسے حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا والی اور قاضی مقرر کر کے روانہ کیا گیا۔۱۵۰

تجارت وزراعت کے احکام جاری کیے گئے تا کہ یہ سمجھا جاسکے کہ کونسی تجارت جائز اور درست ہے اور کونسی تجارت ممنوع وحرام ہے اور سودی کاروبار بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا کہ اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے۔۱۵۱ مسلمانوں کے دینی نظام کو قائم کرنے اور چلانے کے لیے حفاظ قرآن، علما وفقہا، قضاء اور آئمہ ومورخین کا تقرر فرمایا گیا تا کہ امت مسلمہ علمی وعملی طور سے اپنے دین کے ساتھ وابستہ رہے۔ ساتھ ہی احیائے دین اور اشاعت اسلام

کے لیے غیر مسلموں کی طرف دعوت اسلام کے خطوط جاری کیے گئے۔ انکی طرف دعاۃ و مبلغین کو روانہ کیا گیا۔ باہمی معاشرے کی صلاح و وصیت متعین کیے گئے۔ پھر یہ بھی کہ طرز معاشرت کیا ہو۔ غذا اور لباس کے احکام اور حدود بھی طے کیے گئے تا کہ مسلمان اپنے طرز زندگی ہی سے پہچانا جاسکے کہ یہ مسلمان ہے اور وہ اپنی ہر ادا اور طور طریق سے یہ اعلان کرتا ہو کہ ان صلوٰتی و نسکی و محیایٔ و مماتی للله رب العالمین لاشریك له اور اپنے جملہ احوال سے یہ ظاہر کر رہا ہو کہ میرے رب نے میرا نام مسلمان رکھا ہے تو میں اپنے عمل سے اپنے نام کے ساتھ اپنی مطابقت پیش کرتا ہوں۔ اس طرح اسلامی ریاست کے جملہ خطوط دنیا کے سامنے واضح ہو گئے کہ دینی اور دنیوی شعبے میں سے کسی شعبہ کو بھی ایسا باقی نہ چھوڑا کہ اس کے اصول و احکام پوری طرح مرتب و مدون نہ ہوں۔ سیاست داخلیہ اور خارجیہ کو بھی ایسا مکمل اور منضبط فرما دیا گیا کہ آج بھی اگر کوئی ملک کلیتہً اسلام کی داخلی اور خارجی سیاست اپنائے تو نہ ملک کے ندر کوئی خلفشار باقی رہ سکتا ہے اور وہ باہر کی طاقتیں اس کا استحصال یا اس پر ظلم و تعدی کی جرأت کرسکیں گی۔ ۱۵۲

اسی تاریخی حقیقت کی روشنی میں پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کی اہمیت اور مضمرات کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ نظریہ پاکستان، یعنی دو قومی نظریہ کی بدولت مسلمانوں میں یہ شعور بیدار ہوا کہ وہ علیحدہ قوم ہیں اور اس نظریہ پر عملدرآمد کے لیے اسلامی اصولوں اور اقدار کے نفاذ کے لیے اور اپنے دینی اور اخلاقی نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہیں ایک ایسے ملک یا خطۂ زمین کی ضرورت تھی جہاں انہیں سیاسی اور حکومتی اقتدار حاصل ہو، کیونکہ ایسی قوت کے بغیر، ایک محکوم قوم کی حیثیت سے، وہ اپنا اسلامی تشخص قائم نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا نظریہ پاکستان اور آزاد اور خود مختار سلطنت پاکستان لازم و ملزوم بن کر رہ گئے۔ نظریے میں مکمل یقین و ایمان کے بغیر ہندوستان کی تقسیم کا جواز پیدا نہیں ہوسکتا تھا، اور نہ ہی اس مقصد کے لیے قربانیاں دی جاسکتی تھیں اور آزاد سلطنت کے بغیر نظریہ پر عملدرآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے پاکستان کے مقاصد کی تکمیل نظریہ پاکستان کے تحفظ اور پاکستان میں ایک اسلامی ریاست کی تشکیل اور منصفانہ معاشرے کے قیام کے لیے صحیح اسلامی خطوط پر دیانتدارانہ کوششیں جاری رکھی جائیں۔ ۱۵۳

باب چہارم

نفاذ اُردو میں حائل رکاوٹوں

کا مطالعہ

باب چہارم

نفاذ اردو میں حائل رکاوٹوں کا مطالعہ

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برعظیم، پاک و ہند دو حصّوں میں منقسم ہو گیا۔ اس غیر منصفانہ تقسیم سے ایک علیحدہ اسلامی ریاست اور ایک سیکولر اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا اور تقسیم کا سب سے بڑا سبب اُردو ہندی تنازعہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ وطن عزیز پاکستان میں قومی زبان کا مسئلہ مختلف نوعیت کا تھا۔ پاکستان جو سندھ، بلوچستان، پنجاب، سرحد اور مشرقی بنگال کے الحاق سے ایک اسلامی ریاست کی صورت میں دنیا کے نقشے پر ابھرا، مختلف زبانوں کی آماجگاہ تھا۔ پاکستان کا قیام چونکہ اسلامی تہذیب وتمدن اور تہذیبی وثقافتی، علمی وادبی ورثے کے تحفظ کے لئے ہوا مگر یہ خواب اپنی پوری روح کے ساتھ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ شاید اس کا سب سے بڑا سبب اُردو زبان کے سب سے بڑے مرکز یو پی کا بھارت میں رہ جانا اور انگریزی داں طبقے کا اقتدار میں اثر ورسوخ بڑھانا تھا۔ برعظیم کی تقسیم نے اُردو زبان کی لسانی، تہذیبی اور ادبی مرکزوں پر گہرے نقوش ثبت کئے اور معیاری زبان ایک صحیفہ بن گئی گو کہ پاکستان میں مختلف زبانیں موجود ہیں جن کی علمی وادبی حیثیت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے مگر اُردو کی عوامی رابطے کی فوقیت برقرار رہی۔ انگریزی زبان کے دلدادہ طبقے نے اُردو زبان کو ثانوی حیثیت دی اور ہر دور میں اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ آج وطن عزیز کی عمر ۶۱ برس ہو گئی ہے مگر سرکاری زبان کا مسئلہ ہنوز اپنی جگہ موجود ہے۔ نفاذ اُردو کا مسئلہ ایک منزل سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کے نفاذ کے لئے کچھ سنجیدہ کوششیں بھی کی گئیں جو کامیاب نہیں ہوئیں۔

برطانوی ایکٹ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے تحت برصغیر کو دو آزاد اور خود مختار مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان مملکتوں میں ان کی جداگانہ تحریک آزادی کے تمام تر اجزا اور مضمرات نے جنم لیا تھا۔ جن کے لیے ایک طویل عرصے سے آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا نیشنل کانگریس جدوجہد میں مصروف تھیں۔ ان اجزائے ترکیبی میں ایک اہم جز سرکاری زبان تھی۔ دونوں مملکتوں کے قیام کے بعد زبان کا تنازعہ طے پا چکا تھا اور دونوں مملکتوں نے اپنے اپنے لیے سرکاری زبانوں کا انتخاب کر لیا تھا۔[1] بھارت میں ہندی زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا اور پاکستان میں

اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے بحث کا آغاز ہوا۔ کیونکہ تحریک آزادی کے دوران یہ دونوں زبانیں جداگانہ قومی تشخص کی شناخت بن چکی تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے لیے سرکاری زبان ایک طے شدہ حقیقت تھی اور سرکاری زبان کوئی مسئلہ نہ تھا۔[۲] قائداعظم محمد علی جناح قیام پاکستان سے قبل ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اردو زبان کا پاکستان میں مستقبل کے حوالے سے وضاحت کر چکے تھے۔

"اس اجلاس میں سر فیروز خان نون نے اپنی تقریر جب انگریزی میں شروع کی تو ہر طرف سے شور و غل ہوا۔ اردو! اردو! اس سے مجبور ہو کر انہوں نے کچھ جملے اردو میں ارشاد فرمائے اور اس کے بعد انگریزی ہی میں بولنے لگے اس پر پھر اردو! اردو! کا شور ہوا۔ تب آپ نے جل کر کہا کہ قائداعظم بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ یہ سن کر قائداعظم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور صریح اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ فیروز خان نون نے میرے پیچھے پناہ لی ہے لہذا میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔"[۳]

قیام پاکستان کے وقت یہ امر طے شدہ تھا کہ پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان اردو ہوگی۔ اردو کے بارے میں ہر سطح پر ہم آہنگی موجود تھی۔ اردو کے ساتھ لوگوں کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ قیام پاکستان کے دو تین ماہ کے دوران انگریزی کے بجائے اردو میں سائن بورڈ لکھے گئے اور انہیں آویزاں کیا گیا۔ یہ امر اس لیے بھی قابل توجہ ہے کہ قیام پاکستان محض ایک آئینی اور دستوری واقعہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک طویل جدوجہد کی داستان تھی۔[۴] پرچم، سرزمین اور اردو... ان تین سچائیوں نے قیام پاکستان کے وقت لوگوں کو معروضی طور پر اعتماد فراہم کیا اور اردو زبان قیام پاکستان کے وقت اس مملکت کی شناخت بن کر ابھری اور ہر شخص نے اسے اپنا قومی تشخص قرار دیا۔[۵] اب قومی زبان کے استعمال، ترویج و اشاعت اور ترقی سے متعلق سوالات پیدا ہوئے۔ ایسے سوالات اس وقت جنم لیتے ہیں جب قومی زبان کو قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں داخل کیا جاتا ہے اور زبان کے دائرہ عمل کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش اور علمی زبان کا رتبہ دیا جاتا ہے۔

تاریخی جائزے سے برعظیم، پاک و ہند میں اردو ہندی لسانی تنازعہ کے ساتھ انگریزی کی بھی سرکاری سطح پر ایک مسلمہ حقیقت تھی یہ اہمیت انگریزی کو خواص کی زبان دفتری، سرکاری اور تعلیمی زبان رہنے کی بناء پر حاصل ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود یہ عوامی زبان کا درجہ کبھی نہیں حاصل کر سکی۔ قیام پاکستان کے وقت اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کی لسانی صورتحال عملی طور پر یہ تھی۔ ۶

ا۔ انگریزی ایک غیر ملکی زبان تھی اور دور محکومی میں استعماری حکمت کے تحت سرکاری، دفتری اور تعلیمی زبان کے طور پر برصغیر میں جاری کی گئی پاکستان کو آزادی کے ساتھ یہ تحفہ ورثے میں ملا۔

۲۔ اردو نے برصغیر کی ملک گیر زبان کے طور پر قدرتی حالات میں نشوونما پائی تھی۔ ہندی اور اردو تنازع کے بعد اردو نے ہندی مسلمانوں کے الگ قومی تشخص کو واضح شکل دینے میں اہم حصہ لیا تھا۔ تحریک پاکستان کی نشر و اشاعت میں بھی اردو کا مقام واضح تھا اور آل انڈیا مسلم لیگ نے حصول آزادی سے قبل اردو کو پاکستان کی قومی زبان کے طور پر ذہنی طور پر قبول کیا تھا اور اسلامیان ہند نے اس کی تائید کی تھی۔ اس بارے میں کسی سطح کے شکوک وشبہات موجود نہیں تھے کہ آزادی کے بعد انگریزی کی جگہ اردو کو پاکستان کی قومی، سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ حاصل ہوگا۔ کیونکہ رابطے کے طور پر اردو ہی پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی اور سمجھی جا سکتی تھی۔ انگریزی کو یہ حیثیت محدود دائرے میں سرکاری زبان کے طور پر حاصل ہوئی تھی جبکہ اردو کو یہ حیثیت قدرتی عوامل نے عطا کی تھی اور ملک گیر سیاسی اور معاشرتی تحریکوں نے اسے برصغیر کی لنگوا فرینکا بنا دیا تھا۔

۳۔ پاکستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں کی مقامی زبانیں تھیں جن کی علاقائی حیثیت مسلم تھی اور ان میں بعض زبانیں ترقی یافتہ اور شعر و ادب کے لحاظ سے باثروت تھیں، مگر ان کی کارفرمائی اپنے اپنے علاقے تک محدود تھی۔ اپنے علاقے کی حدود سے نکل کر یہ زبانیں ملک گیر رابطے کا کام نہیں دے سکتی تھیں۔ ان زبانوں کی کارکردگی کا تعین بھی ضروری تھا۔

قیام پاکستان کے بعد لسانی اعتبار سے انگریزی کی حیثیت اور اردو کے مقام کا تعین کے علاوہ مختلف اہم علاقائی زبانوں (بنگلہ، پشتو، سندھی، پنجابی، بلوچی وغیرہ) کی کارکردگی و کارفرمائی کے حدود مقرر کرنے کا مسئلہ

موجود تھا۔ انیسویں صدی میں ہندی اردو تنازع کے پس منظر میں زبانوں کو ان کے لسانی تقاضوں سے قطع نظر سیاسی امور و معاملات میں جو اہمیت دی گئی تھی اس کی وجہ سے یہ مسئلہ جدید دور کا بہت نازک اور پیچیدہ مسئلہ تھا۔ ے جسے بعد میں بعض عناصر نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ آزادی کے فوراً بعد پاکستان گوناگوں مسائل سے دوچار ہوا، لیکن جذبہ ملی سے معمور اہل پاکستان نے قائداعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں تعمیر و استحکام کا آغاز کیا اور ان گنت مسائل کے باوجود نوزائیدہ مملکت شاہراہ ترقی پر گامزن ہوئی۔ نئے انفراسٹکچر کے لیے اور سرکاری زبان اردو کی ضرورت اور حیثیت متعین کر کے جدوجہد آزادی کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کوششوں کا آغاز بھی فوری طور پر کیا گیا۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے کراچی میں ایک نمائندہ تعلیمی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس میں قومی زبان کے مسئلے کو خاص اہمیت دی گئی۔ ۸

کل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء سے پہلی دسمبر ۱۹۴۷ء تک دارالحکومت کراچی میں پانچ روز تک جاری رہی۔ اس میں پورے پاکستان سے وزراء، نظما اور ماہرین تعلیم کو مدعو کیا گیا۔ یہ کانفرنس اس اعتبار سے اہمیت کی حامل تھی کہ اس میں تمام اہم اور بنیادی تعلیمی مسائل پر غور کیا گیا۔ قومی زبان کے مسئلہ کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ کانفرنس کے صدر مرکزی وزیر تعلیم مسٹر فضل الرحمٰن تھے۔ جن کا تعلق مشرقی بنگال سے تھا۔ انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں اردو زبان کی قومی زبان کی حیثیت سے بھرپور تائید کی اور صوبائی زبانوں کی اہمیت کا ان کے صوبائی حدود میں بھرپور اعتراف کیا۔

> "ہمیں اپنی صوبائی زبانوں کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش رکھنی چاہیے۔ نہ صرف ذریعہ تعلیم کے لیے بلکہ اس تہذیب کی اشاعت کے لیے بھی جو ان زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن صرف اس حد تک کہ اس مشترک تہذیب (کلچر) کی وحدت کو کوئی آسیب نہ پہنچے۔ اس وحدت کے تعین کے لیے ہمیں ایک بین الصوبائی زبان کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں اردو زبان کے حقوق ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ یہ مسلمانان ہند کی خاص تخلیق ہے اور اس نے مقابلۃً کم مدت میں ادائے مافی الضمیر خیال کے نازک سے نازک فروق

اور تخیل کے بلند ترین پرواز کے اظہار کی غیر معمولی قوت اور نزاکت احساس حاصل کر لی ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ مستعار لینے اور اپنے میں جذب کرنے کی صلاحیت، فارسی، عربی اور انگریزی سے اس کے تاریخی تعلقات اور نظم ونثر میں اس کا اعلیٰ تخلیقی سرمایہ، یہ سب میری نظر میں اسے پاکستان کی "لنگوا فرینکا" کا مرتبہ دینے کے حق میں ناقابل تردید دلائل ہیں۔"[9]

اس کانفرنس میں مختلف کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئیں جن کے سپرد درجہ تعلیم کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ ۲۹ نومبر کو تینوں درجوں یعنی ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی کی جملہ کمیٹیوں کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ اجلاس کی صدارت میاں افضل حسین نے کی۔ اس مشترکہ اجلاس میں کمیٹیوں کی جانب سے یہ سفارش کی گئی کہ:

"تمام سکولوں میں اردو بطور لازمی زبان پڑھائی جائے اور یہ امر ملحوظ رہے کہ صوبائی حکومتیں سکول ہی کے دوران تعلیم میں ذریعہ یا ذرائع تعلیم کا فیصلہ کریں مگر پاکستان کے نظام تعلیم میں ترقی رفتار کے ساتھ بتدریج اردو کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کیا جائے۔"[10]

اس کانفرنس کی خاص بات یہ تھی کہ تمام مندوبین کا تعلق ملک کی مختلف زبانوں سے تھا لیکن اس کے باوجود کانفرنس کے آخری اجلاس میں اردو کو پاکستان کی قومی زبان تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی۔ پاکستان کی پہلی تعلیمی کانفرنس میں لسانی مسئلے پر یہ فیصلے قومی مفاد میں درست سمت میں اور بروقت کیے گئے۔ پنجاب یونیورسٹی[11] نے ان فیصلوں کی ذمہ داری سے بخوبی عہدہ براہ ہونے کے لیے بروقت اقدام کا فیصلہ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات جو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک تھے، نے واپس آ کر باہمی مشاورت اور اردو کو تعلیمی اور قومی زندگی میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے ایک اردو کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۸ء میں لاہور میں پہلی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔[12] اس کانفرنس میں اردو کی تعلیم میں پنجاب یونیورسٹی کے کردار اور

اردو کے فروغ وترقی کے لیے یونیورسٹی کے وسائل واختیارات کو بطور خصوصی موضوع بحث بنایا گیا اور پہلے سے ڈاکٹر سید عبداللہ کو ایک یادداشت مرتب کرنے کی ذمہ داری تفویض کی گئی تاکہ ٹھوس مشورے اور تجویزیں کانفرنس کے نتیجے میں سامنے آسکیں اور بروقت عملی قدم اٹھایا جاسکے۔ اس سے ڈاکٹر عمر حیات کا مقصد یہ تھا کہ اردو کے فروغ کی جو اہم ذمہ داری اہل پنجاب پر ڈالی گئی ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس صوبے میں اردو زبان کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے ہم جو قدم اٹھائیں وہ علمی اور تعلیمی لحاظ سے حد درجہ معقول اور حال اور مستقبل کی ضرورتوں کے لحاظ سے برمحل اور مناسب ہو۔ اس کانفرنس کو دوسرا نام "سبجکٹ کانفرنس ان اردو" کا دیا گیا۔[۱۳]

پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام سہ روزہ اردو کانفرنس کا انعقاد ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو ہوا۔ اس کانفرنس میں تعلیمی اداروں، علمی وادبی حلقوں اور حکومت پاکستان کے نمائندوں اور وزیروں نے شرکت کی۔[۱۴] اس کانفرنس میں قراردادوں کے ذریعے طے پایا۔[۱۵]

۱۔ حسب امکان جلد از جلد انگریزی کے بجائے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم وامتحان قرار دیا جائے۔

۲۔ زیادہ سے زیادہ چار سال کے عرصے میں اردو کو وہی مقام دیا جائے جو اس وقت انگریزی کو حاصل ہے اور عبوری دور میں دسویں جماعت تک اردو کو لازمی مضمون قرار دیا جائے اور ایف۔اے اور بی۔اے میں اردو کو انتخابی مضامین (Full elective subjects) میں فوراً شامل کر دیا جائے۔

۳۔ ایم۔اے کے امتحان کے لیے اردو کو ایک مضمون قرار دیا جائے اور ایم۔اے اردو کا پہلا امتحان ۱۹۵۰ء میں ہو۔

۴۔ اردو زبان کو یونیورسٹی کی دفتری زبان قرار دیا جائے۔

۵۔ جلد از جلد دو علمی ادارے قائم کیے جائیں جو دارالترجمہ اور دارالتصنیف کے نام سے موسوم ہوں اور جن کی وساطت سے نہ صرف دنیا کی بہترین تصانیف کو اردو میں منتقل کیا جائے بلکہ طبغراد تصنیفات کے لیے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔

۶۔ اردو رسم الخط اور ٹائپ کی اصلاح اور تکمیل کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کرے جو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور وخوض کرنے کے بعد ایک مکمل اور جامع سکیم پیش کرے۔

صوبائی یا وفاقی حکومتوں سے بھی ان قراردادوں میں مطالبے کیے گئے۔ ۱۶

۱۔ تمام دفتروں، عدالتوں اور حکومت کے دوسرے اداروں میں جملہ کاروائی اردو میں ہوا کرے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے حکومت فوراً کم از کم عارضی طور پر ایک محکمہ اردو قائم کرے جو تمام محکموں میں جلد از جلد یہ تبدیلی عمل میں لانے کی تدابیر اختیار کرے۔

۲۔ دسمبر ۱۹۴۸ء تک ایک ایسا کتب خانہ قائم کرے، جس میں اس کتب خانہ کے قیام کے بعد کی تمام اردو مطبوعات کے دو دو نسخے قانوناً محفوظ کر دیے جائیں۔

۳۔ مرکز اور صوبائی مقابلے کے امتحانوں میں اردو کو انگریزی کی طرح لازمی مضمون قرار دیا جائے۔

۴۔ (مرکزی حکومت سے سفارش) کہ وہ بیرونی ممالک بالخصوص اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس کا انتظام کروانے کے لیے، بہت جلد عملی تدابیر اختیار کرے۔

آزادی سے قبل اس خطے کو سہ لسانی (اردو، ہندی، پنجابی) تنازعات کا سامنا تھا جس نے کمیونل مسئلے کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ ۱۹۳۳ء کی اینڈرسن ایجوکیشن رپورٹ میں انگریزی کے بجائے ان زبانوں کے نفاذ کی تجویز پیش کی گئی تھی لیکن اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد صورتحال میں تبدیلی آئی تھی اس لیے اردو کانفرنس کی تجاویز اول اور دوم پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی تاہم قراردادوں میں احتیاط اور تدریج کی حکمت کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔

۱۹۴۷ء سے قبل امتحانات میں اردو زبان کو استعمال کرنے والے امیدواروں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ پنجاب یونیورسٹی میں چونکہ اردو ذریعہ تعلیم و امتحانات کے بارے میں فضا سازگار تھی اس لیے تعلیمی کانفرنس اور اردو کانفرنس کے کچھ ہی عرصے بعد یونیورسٹی نے میٹرک کے امتحان میں انگریزی کے سوا باقی سب مضامین میں اردو کو ذریعہ امتحان بنانے کا اختیار دے دیا اور ۱۹۵۲ء میں اردو کو میٹرک میں لازمی ذریعہ امتحان بنا دیا گیا۔ البتہ یورپین سکولوں اور غیر ملکی طلبہ کو ۱۹۵۴ء تک انگریزی کو امتحان میں ذریعہ اظہار کا اختیار دے دیا گیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں دسویں جماعت میں اردو لازمی مضمون قرار پائی اور ایف۔ اے اور بی۔ اے میں بھی اردو آپشنل کے بجائے اختیاری مضمون قرار پائی۔ اردو ایم۔ اے کی تدریس کے لیے کلاسوں کا آغاز اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہوا اور

پہلا امتحان ۱۹۵۰ء میں لیا گیا۔ حکومت پنجاب نے ۱۹۴۹ء کے دسمبر میں مجلس دفتری زبان کے قیام کی منظوری دی جس کے ذمے دفتری زبان کی تبدیلی کے لیے مناسب تدابیر اور ضروری تیاری کے مراحل قرار پائے۔ ۱۹۵۰ء میں انسائیکلو پیڈیا کی تدوین کے لیے دائرہ معارف اسلامیہ کا شعبہ قائم کیا جو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ ۱۷

اس مرحلے پر جب کہ قومی زبان کے لیے ہونے والے اقدامات درست سمت میں رواں دواں تھے۔ ملک کی عمومی فضاء تعمیر و ترقی کے لیے نہایت سازگار تھی۔ قومی زبان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا، علاقائی زبانوں کے لیے جذبہ خیر سگالی موجود تھا۔ حکومت پاکستان نے سنگین مسائل سے دوچار ہونے کے باوجود تعلیم اور قومی زبان کے مسئلے کو زیر بحث لا کر یہ واضح کر دیا تھا کہ قومی مستقبل کی تعمیر کے لیے تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سمت کا تعین نئے ملک کے لیے بے حد ضروری ہے۔ نوزائیدہ مملکت کے اس عزم و ارادے کو دیکھتے ہوئے تعمیری قوتوں کے ساتھ ساتھ تخریبی قوتوں نے بھی میدان عمل میں حصہ لیا۔ ان تخریبی قوتوں نے مشرقی بنگال کو اپنا ہدف بنایا اور بنگلہ زبان (کثرت آبادی) کا سوال اٹھایا گیا۔ اس تحریک کا مرکز کلکتہ تھا اور کلکتہ ریڈیو نے اس لسانی عصبیت کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸ کلکتہ کے بنگالی مدرسہ فکر نے بھارت کے ایما اور اہتمام سے پاکستان کے قیام کا بدلہ کھلی مخالفت کے بجائے آئینی سوال اٹھا کر لیا اور بنگلہ کثرت آبادی کو بنیاد بنایا۔ انہی عناصر کی شہ پر دستور ساز اسمبلی میں بنگالی لیڈروں نے زبان کے مسئلے پر تقریریں کیں اور ابھی ملکی آئین ابتدائی مراحل ہی میں تھا کہ مشرقی پاکستان میں لسانی تنازع نے ایک بھیانک صورت اختیار کر لی۔ ۱۹ کلکتہ مرکز کے علاوہ اس اختلاف کو شدید کرنے میں بمبئی کے کمیونسٹ بھی سرگرم ہو گئے۔ اس وقت بمبئی کے کمیونسٹ مرکز کا تعلق پاکستان کے کمیونسٹ مرکز کے ساتھ تھا اور ہدایات کا مستقل ایک سلسلہ جاری تھا۔ لاہور کے ترقی پسند اردو کی حمایت میں سرگرداں تھے تو کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری سجاد ظہیر مشرقی بنگال میں بنگلہ زبان کی مرکزی حیثیت کے لیے کام کر رہے تھے۔ ۲۰ اس میں ان سیاستدانوں کا بھی عمل دخل تھا جو ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کے مقابلے میں شکست سے دوچار ہوئے تھے۔ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں بنگالی نوجوانوں نے بنگلہ کو سرکاری زبان کی حیثیت دلانے کے لیے مظاہرے کیے۔ ایک جانب کلکتہ کے ہندو مکتبہ فکر نے جس میں قوم پرست ہندو بنگالیوں کے علاوہ

مسلمانوں کی کچھ تعداد شامل تھی۔ مشرقی پاکستان میں مرکز گریز بنگلہ پرستانہ خیالات کی اشاعت جاری رکھی گئی تو دوسری طرف سیاسی اور معاشی مسائل کے خلاف بے اطمینانی کو بھی زبان کے مسئلے کے پردے میں پھیلا دیا گیا۔[۲۱]

اس وقت مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین تھے۔ انہوں نے اس لسانی فتنے کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن مغربی پاکستان کے خلاف نفرت و حقارت کے لیے بنگلہ زبان کو وسیلہ اظہار کچھ اس طرح بنایا گیا کہ قائد اعظم کو باوجود شدید علالت کے مشرقی پاکستان کا سفر کرنا پڑا۔[۲۲] ڈھاکہ میں قائد اعظم نے اپنی دو تقریروں میں پاکستان کی قومی زبان اردو کو قرار دیا اور وقتی طور پر مخالفتوں کو دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"مجھے آپ سے صاف صاف بات کر لینی چاہیے کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے یہ بات مبنی بر حقیقت نہیں کہ اس حوالے سے آپ کی روزمرہ زندگی کو چھیڑا جائے یا کوئی رخنہ اندازی کی جائے گی۔ آپ ہی، یعنی اس صوبے کے عوام ہی اس صوبے کی زبان کے بارے میں فیصلہ کریں گے لیکن میں آپ کو صاف طور پر بتا دوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ درحقیقت پاکستان کا دشمن ہے۔ واحد سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو متحد رہ سکتی ہے اور نہ روبہ عمل۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ پس جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے، پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔"[۲۳]

تین روز بعد ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا:

"پاکستان کی سرکاری زبان کے سلسلے میں، میں اپنے نقطۂ نظر کا پھر اعادہ کرتا ہوں۔ اس صوبے کے دفتری استعمال کے لیے اس صوبے کے عوام جس زبان کو چاہیں منتخب کر سکتے ہیں

یہ مسئلہ اس صوبے کے عوام کی خواہشوں کے مطابق ان کے منتخب نمائندے کسی مناسب وقت آزادانہ طور پر اور مکمل غیر جانبداری سے حل کر سکتے ہیں۔ تاہم لینگوا فرینکا کی حیثیت سے صرف ایک زبان ہی مملکت کے مختلف صوبوں میں باہمی رابطے کا کام دے سکتی ہے اور وہ زبان اردو ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ سرکاری زبان اردو ہی کو ہونا چاہیے۔ یہ وہ زبان ہے جسے برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے پروان چڑھایا ہے اور جو پاکستان کے طول وعرض میں سمجھی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی بھی صوبائی زبان سے کہیں زیادہ اسلامی تہذیبی سرمایہ اور مسلم روایات کا ذخیرہ اس زبان میں موجود ہے اور یہ دوسرے اسلامی ملکوں کی زبانوں کے نزدیک تر ہے۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ اردو کو ہندوستان سے نہ صرف نکال باہر کیا گیا بلکہ اس کے رسم الخط کو بھی دفتری استعمال کے لیے ممنوع کر دیا گیا ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے علم میں بھی ہے جو زبان کے مسئلے کو اچھالنا اور مسائل پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کسی مظاہرے کا کوئی جواز نہیں بنتا لیکن یہ حقائق تسلیم کرنا شاید انہیں گوارا نہیں۔ اس سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اس مملکت کے مسلمانوں میں تفرقے کو ہوا دے سکیں۔ جبکہ درحقیقت وہ غیر بنگالی مسلمانوں کے خلاف نفرت ابھارنے کی کوششوں کو پوشیدہ نہیں رکھ سکے۔ زبان کے مسئلے پر آپ کے وزیر اعلیٰ کے اس بیان کے بعد، جو انہوں نے کراچی سے واپسی پر دیا تھا، مظاہروں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ جہاں تک اس صوبے کے عوام کے اس حق کا تعلق ہے کہ اگر وہ چاہیں تو دفتری زبان کے طور پر بنگالی کو استعمال کر سکتے ہیں، ان لوگوں نے اپنی چالیں بدل لی ہیں۔ اب انہوں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا ہے کہ بنگال مرکز پاکستان کی سرکاری زبان ہونی چاہیے اور یہ جانتے ہوئے کہ مسلم مملکت کی دفتری زبان کی حیثیت سے اردو کا مقام اظہر من الشّمس ہے۔ انہوں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا ہے کہ بنگالی اور اردو دونوں کو پاکستان کی سرکاری زبانیں بنایا جائے۔ خبردار! اس سلسلے میں کوئی غلطی نہ کرنا۔ سرکاری زبان صرف

ایک ہوسکتی ہے۔ اگر اس مملکت کے مختلف حصوں کو کوئی زبان متحد رکھ سکتی ہے تو وہ زبان میری رائے میں صرف اردو ہوسکتی ہے۔"[۲۴]

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے ارشادات میں صوبائی زبانوں کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اس تاریخی حقیقت کو بھی واضح کردیا کہ سرکاری زبان صرف اردو ہی ہوگی۔ کیونکہ ایک سے زیادہ زبانوں کو ملک میں مروج کرنا انتشار کا باعث بنتا جو مسلمانوں کے تاریخی شعور اور اجتماعی ملی وحدت کی نفی کرتا تھا۔

قائداعظم کا ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو کراچی میں انتقال ہوگیا اور خواجہ ناظم الدین ملک کے دوسرے گورنر جنرل نامزد ہوئے۔ خواجہ ناظم الدین نے دوسری اردو کانفرنس جو پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں ۱۹۵۱ء میں منعقد کی گئی تھی، میں قائداعظم کے فرمان کا اعادہ کیا۔[۲۵]

"اردو کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پاکستان کے کسی صوبے کی زبان نہیں اور سب کی زبان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو نہ تو بنگال کے دیہات میں بولی جاتی ہے، نہ پنجاب، سرحد، سندھ یا بلوچستان کے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ آپ بنگال میں پنجابی یا پنجاب میں بنگالی، سرحد میں سندھی یا سندھ میں پشتو بولیں تو آپ کی بات کو سمجھنے والا کوئی مقامی باشندہ مشکل سے ملے گا۔ مگر اردو یا کم از کم ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے یا سمجھنے والے تھوڑے بہت، قریب قریب ہر جگہ مل جائیں گے۔ صرف یہی ایک زبان ہے جو پاکستان کے مختلف حصوں میں مشترک ہے بلکہ پاکستان کے باہر بھی اس سے کام چلایا جاسکتا ہے۔" قائداعظم کی مادری زبان اردو نہ تھی۔ انھیں سب سے زیادہ مہارت انگریزی زبان میں حاصل تھی، مگر انکی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا کہ سوال ذاتی یا صوبائی نہیں، بلکہ قومی اور ملی ہے۔"

"اگر پاکستان کی مختلف زبانیں بولنے والوں کو آپس میں شیر وشکر بنانا ہے اور اگر پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے تو اس کی ایک قومی زبان بھی ہونی چاہیے اور یہ زبان سوائے

اردو کے دوسری نہیں ہوسکتی۔ لہذا انھوں (قائداعظم) نے کھلے الفاظ میں اس بات کا اعلان فرمایا، اور ان کا اعلان ہمارے لیے حکم آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم سب کا فرض یہ ہے کہ اپنی قومی زبان کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی کوشش کریں۔"

انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام ۱۹۵۱ء کی کراچی میں منعقد اس تقریب میں سردار عبدالرب نشتر نے اردو کے خلاف اٹھائے گئے اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔ انھوں نے تمہیدی کلمات کے بعد فرمایا:

"مجھے تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ قیام پاکستان کے ساڑھے تین سال بعد اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا جائے۔ درآں حالیکہ گو رسمی طور پر مجلس دستور ساز میں یہ فیصلہ نہ ہوا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے مگر واقعاتی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ حیثیت اردو ہی کو حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ جو لوگ تحریک پاکستان سے واقفیت رکھتے ہیں، انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جن وجوہ نے برعظیم کے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کے مطالبے پر آمادہ کیا، ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ۱۹۳۷ء میں جب صوبائی خودمختاری کے زمانے میں ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم تہذیب وثقافت کے مٹا ڈالنے کے منصوبے بنائے گئے اور اس غرض سے اردو کو مختص کیا گیا تو مسلمان چلا اٹھے اور برداشت نہ کر سکے، ان میں ایک چیز یہ تھی کہ اردو کو اغیار کی دست برد سے محفوظ کریں۔ اردو ہندی کا جھگڑا تقسیم سے پہلے بھی اٹھایا گیا تھا۔ مسلمان تو عام طور سے سبھی اور بہت سے ہندو بھی کوشاں تھے کہ ملک کی زبان اردو قرار دی جائے مگر بعض متعصب ہندو صرف اس خیال سے مخالف ہو گئے کہ وہ زبان جس کے الفاظ اسلامی تاریخ وعقائد میں رچے ہوئے ہیں... ہندو نفسیات پر برا اثر ڈالے گی۔ مجھے یاد ہے کہ یوپی کے ایک ہندو وزیر نے... اردو کی مخالفت میں اس لیے بیان دیا کہ ان

کی لڑکی نے ایک موقع پر ان کے سامنے اللہ کا نام لیا تھا۔ انھوں نے کہا 'اللہ' کی طرح بہت سے الفاظ جو مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں اردو زبان کے ذریعے آہستہ آہستہ ہندوؤں کے دماغوں میں داخل ہو گئے ہیں اور اس سے ان کے مذہبی عقائد کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔

پنڈت ٹنڈن اس لیے اردو کی مخالفت فرماتے ہیں کہ یہ اس دور میں پیدا ہوئی جب ہندو، مسلمانوں کے غلام تھے۔ اب سنا ہے کہ کوئی صاحب کراچی میں کہہ گئے ہیں کہ اردو (مسلمانوں کی) غلامی کے زمانے کی یادگار ہے...، الغرض تقسیم سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں اور کثیر ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ اردو راس کماری سے پشاور تک سارے ہندوستان کی زبان ہونی چاہیے۔ آج حیرت ہے کہ اسی ملک کے کسی گوشے سے یہ آواز اُٹھے کہ اردو کے بجائے کوئی اور زبان ہو، یہ آواز کم سے کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

یہ انتشار جن افراد نے پھیلانے کی کوشش کی ہے ان کے آلہ کار دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض تو وہ سادہ لوح جو نادانستہ ان کے فریب میں آ گئے اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے پاکستان کی وحدت پر حملہ کیا اور اس کے قومی اور ملی اتحاد کو مٹانے کی غرض سے یہ ناعاقبت اندیشانہ سوال اٹھایا ہے۔ ایک مقتدر صوبے کے چند ناعاقبت اندیش نوجوان، دشمنان قوم کے جھانسے میں آ گئے اور کہنے لگے کہ بنگالی چونکہ اکثریت کی زبان ہے اس لیے پاکستان کی قومی زبان اسے قرار دیا جائے۔ اس وقت حضرت قائد اعظم بقید حیات تھے انھوں نے محسوس فرمایا کہ یہ تحریک ملک کی وحدت اور بنیادی تخیل پر ایک کاری ضرب ہے اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے کر بنگال پہنچے یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان نیا نیا عالم وجود میں آیا تھا اور حکومت بے سروسامانی کی حالت میں قائم ہوئی تھی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا طیارہ موجود نہ تھا جو ایک ہی اڑان میں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان پہنچ جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس نازک زمانے میں جب کہ ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا قائد اعظم ہی کا ناقابل

شکست اور محکم عزم ہمارا اثاثہ تھا اور انھیں ہم کسی خطرے میں ڈالنا نہ چاہتے تھے مگر قائد اعظم نے ایک پرانی مشین میں مزید پٹرول کا انتظام کیا اور ڈھاکہ کے سفر کا خطرہ مول لیا۔ ہماری درخواستوں کی پروا نہ کر کے انھوں نے اپنی زندگی کو لسانی وحدت واستحکام کی بازی پر لگا دیا۔ ایک پرانے (ڈیکوٹہ) جہاز میں ڈھاکہ پہنچے اور ان سر پھرے طلبہ کو جنھوں نے دشمنان پاکستان کے کہنے میں آ کر اس قسم کا سوال اٹھایا تھا سمجھایا کہ اگر تم پاکستان کو قائم و برقرار رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ پاکستان کی زبان صرف اردو ہو سکتی ہے کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔ اس واقعہ سے آپ حضرات اندازہ لگائیں کہ زبان کے سوال کو قائد اعظم کس قدر اہمیت دیتے تھے...،"

پھر صوبائی زبانوں کی اپنی حدود میں ترقی کرنے کی ضرورت اور مشترکہ اردو کی غیر صوبائی، قومی نوعیت کا فرق بتا کر فرمایا کہ:

" کچھ دن سے ایک سوال عربی کا اٹھایا گیا ہے کہ اسے پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے... حیرت ہوتی ہے کہ جو حضرات عربی کو قومی زبان قرار دینے کے محرک و مدعی ہیں، ان میں سے بمشکل ایک آدھ ہی عربی لکھ یا بول سکتے ہیں... عربی قرآن پاک کی، (رسول پاکؐ) کی مقدس زبان ہے۔ پاکستان اسلامی اساس پر بنا ہے آپ ضرور اس بات کی تبلیغ کیجیے عربی کی تعلیم عام ہو مگر اس معاملے میں غلط مبحث نہیں کرنی چاہیے... ہمارے سامنے مسئلہ بالکل صاف اور واضح یہ ہے کہ اس وقت انگریزی دفتروں پر مسلط ہے۔ سیاسی طور پر ہم آزاد ہو گئے ہیں مگر ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس وقت تک آزاد نہیں سمجھ سکتے جب تک ہمارے دفتروں پر انگریزی کا تفوق قائم ہے۔ اب اگر ہماری نجات کے لیے کوئی شخص عربی کا نسخہ بتائے تو میں کہوں گا کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود۔ ہمیں عملی نقطہ

دروازہ کھول دیا گیا۔ جسے نجی اور سرکاری تعلیمی اداروں نے تیزی کے ساتھ اختیار کیا۔ ۹ے پاکستان میں قومی زبان اُردو کے نفاذ میں مسلسل کوتاہی کی متعدد وجوہ ہیں۔ جن میں ایک بڑا سبب انگریزی داں طبقہ ہے۔ اس طبقے کی نشاندہی جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کی ۲۵ سالہ تقریب کے موقع پر خطبہ صدارت میں کی

> "حقیقت یہ ہے کہ اس راستے کا سب سے بھاری پتھر ہمارے معاشرے میں انگریزی پرست طبقہ ہے۔ جو اپنی علمیت کی بناء پر نہیں بلکہ دورِ غلامی کے اثرات کے تحت انگریزی زبان کے بولنے اور لکھنے کی وجہ سے اپنا قد لمبا کئے ہوئے ہے اور یہی وہ طبقہ ہے جو اپنی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزی زبان کو قومی زبان پر فوقیت دیتا ہے۔ شاید اس لئے کہ انگریزی میں رعب زیادہ پڑتا ہے۔ رعب ڈالنے کی کوشش کی بات کچھ ہے بھی صحیح، کیونکہ ابھی انگریز کی غلامی سے آزاد ہوئے تینتیس سال ہی تو ہوئے ہیں۔ اس طبقے کے خیال میں ان کا اور ان کی اولاد کا مستقبل انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب سے وابستہ ہے۔ درحقیقت اُردو کو قومی زندگی میں جائز مقام دینے کا مسئلہ اس قدر علمی اور عملی نہیں ہے۔ جتنا انگریزی پرست یا دوسرے لفظوں میں مغرب پرست طبقے اور ان کی اولاد کی معاشی بقاء کا ہے۔ جو کبھی ملکی ترقی کی دھائی دیتا ہے اور کبھی علاقہ واریت کا سہارا ڈھونڈتا ہے، مگر درپردہ مقصد اصل انگریزی زبان کے ذریعے ہمیشہ اپنی بقاء اور بالادستی ہوتا ہے۔"۸۰

درحقیقت صدر ضیاءالحق کے آخر دورِ اقتدار میں انگریزی کی بالادستی قائم رہی۔ تیسرے مارشل لاء کا خاتمہ ۱۹۸۸ء میں ہوا اور زمام اقتدار پیپلز پارٹی کے ہاتھوں میں آیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے محترمہ بےنظیر بھٹو کو وزیرِ اعظم بنایا گیا۔ یہ اعزاز انھیں دو مرتبہ حاصل ہوا۔ اول یکم نومبر ۱۹۸۸ء سے اگست ۱۹۹۰ء تک اور دوم اکتوبر ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء تک بےنظیر بھٹو نے اپنے دونوں ادوار میں یہ کوشش کی کہ "انگریزی تعلیم کو ہر طبقہ میں عام ہونا چاہیے"۸۱ اس لئے پی پی پی حکومت کے پہلے حکم نمبر ایف ۳۔۸۵/۴ انگریزی، ۲ مئی ۱۹۷۹ء میں کہا گیا

"یہ فیصلہ کیا گیا کہ جماعت اوّل سے تمام مضامین میں انگریزی ذریعہ تعلیم کا اختیار دیا جائے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اُردو یا منظور شدہ صوبائی زبان کے ذریعہ تعلیم کے سکولوں میں بھی انگریزی جماعت اوّل سے اضافی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے"۔

دوسرے دور میں انگریزی جماعت اوّل کے نصاب کا حصّہ بنا دی گئی۔ حکومت کا یہ خیال تھا کہ یہ اقدام غریبوں کے بچوں کو مراعات یافتہ طبقے کا ہم پلہ کر دے گا۸۲۔ پی پی پی کے اس اقدام کی شدید مخالفت کی گئی اور اسے ملک کے خلاف سازش قرار دیا گیا۔ اس اقدام سے اُردو زبان کے فروغ کا راستہ بند کر دیا گیا۔ طبقات کے درمیان امتیاز کو ختم کرنے کے جوش میں ۱۹۷۳ء میں قومی زبان سے متعلق شق کو فراموش کر دیا گیا۔ وہ ادارے جو اُردو کے فروغ کے لئے مختلف ادوار میں قائم کئے گئے تھے ان کے ترقیاتی کاموں سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ انگریزی کو اُردو پر غالب کرنے کی تحریک شروع کر دی گئی۔

ان حالات میں مولوی عبدالحق قومی یونیورسٹی کمیٹی کے ایک وفد نے پروفیسر کرار حسین کی قیادت میں ۱۳ نومبر ۱۹۹۴ء کو یونیورسٹی کے قیام کی یادداشت گورنر سندھ حکیم محمد سعید کو پیش کی۔ اس یادداشت کے سرگرم رکن و سیکریٹری پروفیسر حسن عسکری فاطمی تھے۔ ان کے علاوہ اس وفد میں پروفیسر محمد رفیع عالم، پروفیسر ہارون الرشید، ڈاکٹر منظور الدین احمد، بیگم ممتاز راشدی موجود تھے۔ اس یادداشت میں ۱۹۷۷ء میں صدر جنرل ضیاء الحق کے وعدہ کو یاد دلایا گیا کہ اگر دونوں کالج پوسٹ گریجویشن کے کامیاب تدریسی تجربے سے گزر جائیں تو انھیں یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے گا۔ اُردو کالج نے اس یقین دہانی پر ۱۹۷۸ء میں دونوں کالجوں (آرٹس اور سائنس) میں ایم اے، ایم ایس سی کی تدریس شروع کر دی۔ جو کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض سرکاری حلقوں نے ان کالجوں کو ملا کر ایک یونیورسٹی کا درجہ دینے کے معاملے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ چنانچہ کالج کے اساتذہ کے ایک وفد نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے خواب کی تعبیر کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انجمن ترقی اُردو اور مختلف شخصیات اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف اوقات میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے اخبارات و رسائل میں اس مطالبے کو شدّ ومد کے ساتھ دہراتے رہے۔ مگر اس پورے عرصے میں کوئی باضابطہ منظم حکمت عملی

وضع نہیں کی گئی۔ اُردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لئے باقاعدہ دو گورنروں حکیم محمد سعید اور بیرسٹر کمال اظفر کو بھی یادداشتیں پیش کی گئیں۔ ان عرضداشتوں میں حکومت سے درخواست کی گئی کہ:

"جناب والا! ہم بصورت وفد زیرِ قیادت ممتاز ماہرِ تعلیم، استاد الاساتذہ پروفیسر کرار حسین، سابق شیخ الجامعہ، جامعہ بلوچستان، مذکورہ اہم قومی مطالبے کے سلسلے میں آپ کی عملی مدد، وکالت اور سفارش کے خواستگار ہیں اور مستدعی ہیں کہ ہمارا مطالبہ بہ ادب و شائستگی اپنی پرزور حمایت و سفارش کے ساتھ صدر پاکستان اور موجودہ وزیرِ اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی خدمت میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم) کے قائم کردہ کالج کو وفاق پاکستان کے تحت سرکاری شعبے میں "مولوی عبدالحق یونیورسٹی" کا چارٹر دے کر یونیورسٹی کے قیام کا حکم صادر فرمائیں۔

جناب عالی! اس اقدام سے سندھ کے شہریوں خصوصاً سندھ کے دارالحکومت کے عوام کا دیرینہ مطالبہ پورا ہوگا اور آئین پاکستان میں قومی زبان کے تحفظ، ترویج اور فروغ کو فراہم کردہ دستوری ضمانت کا لفظاً اور معناً اثبات مہیا ہوگا۔ عرض یہ ہے کہ: مملکت خداداد پاکستان میں یہ دونوں درس گاہیں قومی زبان میں اعلیٰ ترین سطح پر سائنسی اور سماجی و معاشرتی علوم کی تدریسی اور تحقیقی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ یہ دونوں اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ وہ پاکستان کے تمام صوبوں اور علاقوں کے طلبہ کو بلا تفریق و امتیاز اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے مواقع فراہم کر رہی ہیں اس طرح دونوں کالجز قومی ہم آہنگی اور یک جہتی کی وفاقی علامت اور قومی مظہر ہیں۔ نیز ان کا تدریسی اور غیر تدریسی عملہ بھی پاکستان کے تمام صوبوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والوں پر مشتمل ہے۔

یہ کالج ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ وفاقی وزارت تعلیم نے اپنی تحویل میں لینے کے بعد ۱۹۷۵ء اور ۱۹۸۵ء میں یکے بعد دیگرے ان اداروں کی اساسی قراردادوں میں ان کے منفرد قومی کردار کی بناء پر آئینی تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ یہ عہد کیا تھا کہ ان کے انتظامی اور تدریسی معیار کو بلند کیا

جائے گا۔

جناب والا! اب جبکہ شہرِ قائد کراچی میں چار پرائیویٹ یونیورسٹیوں کو چارٹر دیئے جا چکے ہیں، وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج کو حق پہنچتا ہے کہ انھیں باہم ملا کر مجوزہ یونیورسٹی کا چارٹر دیدیا جائے تا کہ عوام کا احساس محرومی کم ہو اور وہ اپنا حق ملنے پر مطمئن ہو جائیں کیونکہ صوبہ سندھ میں کوئی وفاقی یونیورسٹی موجود نہیں ہے"۔[۸۳]

دوسری عرض داشت ۳ ستمبر ۱۹۹۵ء کو بیرسٹر کمال اظفر، گورنر سندھ کو پیش کی گئی کہ:

"یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ مذکورہ دونوں کالج جو اب علیحدہ علیحدہ عمارتوں میں الگ الگ بورڈ آف گورنرز کے تحت ۱۹۷۸ء سے ایم اے، ایل ایل ایم، اور ایم ایس سی کی اعلیٰ جامعاتی سطح پر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے قائم کردہ اُردو کالج کا حصہ ہیں۔ انھوں نے بانیانِ پاکستان کی ہدایت پر ۱۹۴۹ء میں یہ درس گاہ بنیادی طور پر اقامتی اُردو یونیورسٹی بنانے کے عزم کے ساتھ قائم کی تھی اور اس کا نصب العین اور عظیم مقصد یہ تھا کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں سائنسی اور عمرانی علوم کی اعلیٰ ترین تدریس و تحقیق، قومی زبان اُردو میں ہو، تا کہ وطنِ عزیز دوقومی نظریہ کے مطابق اپنی آئندہ نسل تیار کرے۔

"بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کی سرکاری زبان اُردو قرار دی تھی۔ چنانچہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے ایک مثالی درسگاہ کے قیام کی ضرورت تھی تا کہ قومی زبان کا عملہً نفاذ ہو سکے۔ گزشتہ ۴۶ سال میں اُردو کالج نے اس قومی چیلنج کا جواب کامیابی کے ساتھ دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ منجملہ علوم کی اعلیٰ تدریس قومی زبان میں ممکن اور قابلِ عمل ہے" ۱۹۷۷ء میں صدر جنرل ضیاء الحق نے کالج کے معائنے کے موقع پر یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر ایم اے، ایم ایس سی کی سطح پر تدریس کو کامیاب کر دیا جائے تو وہ کالج کو جامعہ کا درجہ عطا کر

دیں گے۔اس کے بعد سے اب تک ۱۶ شعبوں میں کامیاب تدریس ہورہی ہے اور دونوں کالج جامعاتی سطح پر نمایاں نتائج پیش کر رہے ہیں"۔

"۱۳ نومبر ۱۹۹۳ء کو مذکورہ حقائق پر مبنی ایک تفصیلی عرضداشت جناب حکیم محمد سعید، گورنر سندھ کے توسط سے صدر مملکت اور وزیر اعظم پاکستان کو پیش کی گئی جس میں دردمندانہ درخواست کی گئی تھی کہ دونوں کالجوں کو ملا کر وفاقی حکومت کے تحت قومی یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے"۔

"اس درخواست کے ایک سال کے بعد سندھ اسمبلی نے مذکورہ قرارداد منظور کر کے وفاقی وزیرِ تعلیم کو بھیج دی جس پر مطلوبہ مثبت کاروائی نہیں ہوئی۔ حالانکہ سندھ کے موجودہ وزیرِ اعلیٰ سید عبداللہ شاہ اور عوامی حکومت کے دیگر ارکان نے قرارداد کی متفقہ حمایت کی تھی جو قومی زبان سے ان کی محبت کا مظہر ہے"۔ ۸۴؎

ان دو عرضداشتوں کے باوجود یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ ہنوز اپنی جگہ رہا اور اُردو زبان میں تدریس کے قیامِ پاکستان کے بعد سب سے بڑے اور قدیم ادارے کی اہمیت وافادیت کو غیر شعوری طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا اور اس کے مسائل سے چشم پوشی کی جاتی رہی جبکہ وہ درسگاہ تھی جس میں اُردو زبان کو ذریعہ تدریس بنا کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ خواہ کوئی شعبہ ہو اُردو زبان اتنی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ تعلیم و تعلّم کے لئے استعمال ہو سکے۔ اُردو کالج ہی کی وجہ سے کالجوں میں اُردو زبان کو وقعت حاصل ہوئی۔

جنرل پرویز مشرف کے دورِ اقتدار میں اس خواب نے حقیقت کا روپ دھارا اور وفاقی اُردو یونیورسٹی کا قیام ایک آرڈیننس کے تحت عمل میں آیا جس میں ایچ ای سی کے کردار کو خصوصاً پروفیسر ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کی کوششوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال اُردو زبان اس جائز حق سے محروم رہی جس کے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا اور اُردو کو اپنی تہذیبی اور علمی ورثہ کی زبان قرار دیا گیا بلکہ غلامی کے اثرات آج ۶۱ برس گزرنے کے باوجود ہنوز موجود ہیں۔ لیکن حکومتی اور انگریزی داں طبقے کے اس تمام عمل کے باوجود نفاذ اُردو کی تحریکیں نئے مقاصد کے ساتھ میدان میں سرگرمِ عمل ہیں کہ شاید ایک دن اُردو کو اس کا جائز مقام اور صحیح معنوں میں قومی اور

سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہو سکے۔اس مقصد کے لیے اردو زبان کے ترقی وفروغ کے لیے مختلف ادارے وجود میں آئے تا کہ اردو زبان کو بحیثیت سرکاری زبان نافذ کیا جا سکے اور اعلیٰ حکام کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف مبذول کرائی جاتی رہے۔

باب پنجم

قیام پاکستان کے بعد فروغ اُردو کے اداروں کا قیام اور ان کا کارکردگی

باب پنجم

قیام پاکستان کے بعد فروغ اردو کے اداروں کا قیام اور ان کی کارکردگی

قیام پاکستان کے بعد قومی زبان اردو کے حوالے سے اختلافات پیدا ہوئے۔ جن کو بنیاد بنا کر اردو زبان کی تمدنی، ثقافتی و تہذیبی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اجنبی زبان انگریزی کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا گیا کہ قومی زبان یا سرکاری زبان اجنبی نہیں ہوسکتی بلکہ وہ زبان ہوتی ہے جو اس ملک کے تمام تمدنی، ثقافتی و تہذیبی اور معاشرتی پہلو سے ہم آہنگ ہو۔ اس کے برعکس مقابلے کے اعلیٰ امتحانات کی زبان بھی انگریزی قرار پائی۔ یہ عمل اس چھلنی کی مانند تھا جس میں نو آبادیاتی آقاؤں کی زبان بولنے اور لکھنے والوں کو چھان کر قومی سیاسی حکمرانوں کے طور پر آگے لانا تھا یوں قومی زبان کی عام ترویج پر ایک بہت بڑی قدغن لگادی گئی جو اب تک قائم ہے یہی حال ملک کی عدلیہ کے سلسلے میں جاری ہے جس کی زبان انگریزی ہے اور انصاف کے تقاضے قانون اور آئین کے مسائل اسی زبان کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ چنانچہ اس صورتحال میں اردو زبان کے تحفظ کے لیے مختلف ادارے وجود میں آئے تا کہ نفاذ اردو میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے اور اعتراضات کا مدلل جواب دیا جاسکے۔ ذیل میں چند اہم اداروں کا مختصر احوال درج کیا جارہا ہے جنھوں نے قیام پاکستان کے بعد فروغ اردو کے لیے سیاسی، تعلیمی اور سرکاری سطح پر جدوجہد کی۔

انجمن ترقی اردو پاکستان:

انجمن ترقی اردو پاکستان نوزائیدہ ادارہ نہیں تھا بلکہ اس کی جڑیں برعظیم، پاک و ہند کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ اس ادارے کی تاریخ صرف ایک ادارے کی ہی نہیں بلکہ یہ برعظیم، پاک و ہند میں موجود دو بڑی قوموں میں فروغ ارتباط اور مسلمانوں کی اپنی لسانی و ثقافتی تحفظ کی طویل جدوجہد کی داستان بھی ہے۔[1] اردو، ہندی لسانی و سیاسی مسئلے کا آغاز فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء کی مرہون منت ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے رسم الخط کے ذریعے برعظیم، پاک و ہند کی عام فہم اردو زبان کو جو لوگوں کی مشترکہ زبان تھی، فارسی اور عربی الفاظ کو نکال کر سنسکرت زبان کے

الفاظ سے مزین کر کے ہندی کا نام دیا۔اس طرح اردو زبان دو زبانوں میں تقسیم ہوگئی۔۲ ہندی کی تبلیغ وترقی کے لیے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور فورٹ ولیم کالج، کلکتہ نے اہم کردار ادا کیا اور پھر یہ کام انگریزوں کی تعلیمی ولسانی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔۳ ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اردو زبان کو سرکاری حیثیت دی گئی اور ۱۸۳۹ء میں اس کا نفاذ عدالتی سطح پر بھی کیا گیا۔انگریزوں کا یہ اقدام بظاہر مسلمانوں کے حق میں تھا۔لیکن اس کے دوررس نتائج سامنے آئے۔ ۱۸۳۷ء اور ۱۸۳۹ء کے احکامات میں ایسی شقیں موجود تھیں، جن کی آڑ میں انگریز اپنے مقبوضہ صوبوں میں کسی بھی زبان کو رائج کر سکتے تھے۔۴ انگریزوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ہندوستان میں موجود مختلف علاقائی زبانوں کو مختلف صوبوں میں رائج کیا۔اس سے مسلمانوں کے ثقافتی اتحاد اور یکجہتی کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی جو فارسی زبان کے ذریعہ قائم تھی۔۵ اردو زبان برعظیم، پاک وہند کے مسلمانوں کی تہذیبی علامت تھی اور متعصب ہندوؤں کی وجہ سے اس کی بقاء کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔اس لیے مسلمانانِ ہند نے اس کے تحفظ کو اپنے قومی تشخص کی حفاظت کا جز تسلیم کرلیا۔۶ ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہندوؤں نے اردو زبان کے خلاف تحریک کا آغاز کیا اور اجتماعی حیثیت سے قومی مسئلے کے طور پر اردو کی مخالفت میں تقریر وتحریر کا سلسلہ شروع ہوا۔اس موقع پر سرسید احمد خان نے ہندوؤں کی اس جارحیت کے خلاف آواز اٹھائی لیکن ہندوؤں نے مسلمانوں کے احتجاج کی کوئی پرواہ نہ کی اور اردو کے خلاف ان کی کارروائیاں بڑھتی چلی گئیں۔۷ ۱۸۷۱ء میں بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر جارج کیمبل نے اردو زبان کے خلاف زہر اگلنے کے بعد ہندی کا بہار میں اجراء کیا۔۸ اس سے پہلے بنگال میں دیوناگری رسم الخط اختیار کیا جاچکا تھا۔مسلمانوں کو کیمبل کے فیصلے پر تشویش لاحق ہوئی۔۹ جبکہ ہندوؤں کے حوصلے بلند ہوگئے۔اب یوپی اور پنجاب میں بھی اردو زبان کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ہر شہر میں اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے ہندو سبھا اور ہندی سبھا کے نام سے انجمنیں بنائیں گئیں۔الہ آباد اور لاہور کی ہندی پرچارنی سبھائیں اس سلسلے میں بڑی فعال تھیں اور ان کے حلقہ اثر میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔اب مسلمانوں نے بھی اس مسئلے پر اجتماعی سطح پر غور وفکر کرنا شروع کردیا۔۱۰ سرسید احمد خان نے ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو اردو کی حمایت میں الہ آباد میں جلسہ کیا اور اردو کے دفاع کے لیے مرکزی مجلس تحفظ اردو قائم کی۔مسلمانوں کی بروقت مزاحمت تحریک احیائے ہندو کی راہ میں حائل ہوئی اور دیوناگری رسم الخط کا نفاذ کچھ

عرصے کے لیے مؤخر ہو گیا۔ [۱۱] لیکن سر سید احمد خان کے انتقال کے صرف دو برس بعد ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں ہندی اور دیوناگری رسم الخط کو عدالتوں میں رائج کر دیا گیا۔ [۱۲]

سر سید احمد خان کے رفقاء نے ان کے بعد اردو زبان کے دفاع کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ نواب محسن الملک جو علی گڑھ کالج کے سیکریٹری تھے، نے زبان سے، مولوی بشیر الدین مدیر البشیر نے قلم سے صوبہ متحدہ کے گورنر میکڈانل کا مقابلہ شروع کر دیا۔ لکھنؤ میں "مجلس تحفظ اردو" کی بنیاد رکھی گئی۔ جلسہ لکھنؤ اردو زبان کی تحریک کے فروغ کا سبب بنا۔ گورنر میکڈانل خود علی گڑھ پہنچا اور کالج کے ٹرسٹیز کو دھمکی دی کہ اگر سیکریٹری کی جانب سے سیاسی شورش جاری رہی تو کالج کی سرکاری امداد بند کر دی جائیگی۔ کالج کی بقاء کے لیے نواب محسن الملک نے تحفظ اردو کی تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ [۱۳] لیکن زبان کے مسئلے کی اہمیت کا شعوری احساس بیدار رہا۔ اہل علی گڑھ نے دوڈھائی سال کے بعد اپنی سالانہ تعلیمی کانفرنس میں ایک شعبہ علمیہ قائم کیا اور مقصد کی صراحت کے لیے اس کا نام "انجمن ترقی اردو" رکھا گیا۔ [۱۴] ہندی کی ترویج کو روکنا مسلمانوں کی قوت استعداد سے باہر تھا لیکن اردو زبان وادب کی ترقی وفروغ مسلمانوں کا اولین مقصد اور نصب العین قرار پایا۔ جنوری ۱۹۰۳ء میں دہلی کے اجلاس میں با قاعدہ ایک تنظیم قائم کی گئی۔ [۱۵] ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۱ء تک مولانا شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور مولوی عزیز مرزا یکے بعد دیگرے انجمن کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ابتدا میں یہ ادارہ کسمپرسی کا شکار رہا اور صرف چند کتب کے اجراء سے زیادہ اس کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔ فروغ اردو زبان کے اس ادارے میں مولوی عبدالحق نے نئی روح پھونکی اور سر سید کی طرح تحریر وتقریر کے ذریعے چندہ جمع کر کے انجمن کو استحکام بخشا۔ اس ادارے کی طباعت واشاعت علی گڑھ سے ہوتی رہی۔ پھر یہ مولوی عبدالحق کے ساتھ ۱۹۱۲ء میں اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔ اس وقت ریاست حیدر آباد مسلم تہذیب کا مرکز تھی۔ سرکاری زبان اردو تھی جب جامعہ عثمانیہ قائم کی گئی تو تمام علوم وفنون کے لیے ذریعہ تعلیم اردو زبان ہی کو اختیار کیا گیا۔ نصابی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے تصنیف وتالیف کا کام وسیع پیمانے پر کیا گیا۔ جس میں انجمن ترقی اردو کی خدمات قابل توجہ ہیں۔

اب انجمن ترقی اردو نے ایک خود مختار اور بڑے ادارے کی حیثیت اختیار کر لی، مولوی عبدالحق کی ذاتی کوششوں، عطیات، کتابوں کے فروخت سے انجمن کی حالت بہتر ہونے لگی اور جامع منصوبوں پر کام کیا جانے

لگا۔ ١٦؎ انجمن ترقی اردو کا دفتر جب اورنگ آباد سے دہلی منتقل کیا گیا تو اس کو "کل ہند" کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ انجمن کے نئے صدر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی منتخب ہوئے۔ انھوں نے انجمن کی مالی بدحالی کو دور کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ١٧؎ مولوی عبدالحق کی کوششوں سے ملک کے ارباب صحافت نے انجمن ترقی اردو کی حمایت میں مضامین اور اداریے لکھے ١٩١٤ء میں انجمن کی ذیلی شاخیں مختلف صوبوں میں قائم ہونے لگیں سب سے پہلے صوبہ اورنگ آباد کے ضلع تر بھینی میں، پھر جالندھر، بھوپال، کان پور، کراچی، اور لکھنؤ میں ذیلی شاخیں قائم ہوئیں ١٩٢٠ء تک انجمن کے مختلف شہروں میں دفاتر کی تعداد چالیس ہوگئی تھی۔ کراچی کی شاخ کا الحاق اور سندھ اردو کانفرنس ١٩١٨ء میں منعقد ہوئی۔ ١٨؎

ابتداً انجمن ایک غیر سرکاری تنظیم تھی مگر ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم کے بعد تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات نے اسے سیاست میں عملی قدم رکھنے پر مجبور کیا۔ ہندو احیاء پرست جماعتوں کے ساتھ کانگریس کا تعاون اس کے دعووٴں کے برعکس تھا۔ کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک قوم پرست اور سیکولر جماعت ہے۔ جو متحدہ قومیت پر یقین رکھتی ہے۔ ١٩؎ جب کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو اس رجحان نے ان کو قوت بخشی تھی لیکن جنگ عظیم اوّل کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے نتیجے میں مہاتما گاندھی، لالہ جیت رائے اور مدن موہن مالویہ نے مقبولیت حاصل کی۔ ان ہندو زعماء نے کانگریس کی پالیسی میں زبردست تبدیلیاں کیں۔ جس سے ماضی میں ہندو مسلم اتحاد اب قصہ پارینہ بن گیا۔ اور مسلمان اپنے مستقبل، اپنی تہذیب و ثقافت، سیاسی اور معاشی حقوق کے تحفظ کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنے لگے۔ قائداعظم محمد علی جناح جیسے وسیع النظر، روشن خیال اور سیکولر رہنما کانگریس کی پالیسیوں سے اختلاف کے باعث کانگریس سے علیحدہ ہوگئے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لی۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے آخر میں کانگریس نے زبان کے مسئلے کو بھی سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اردو زبان کی بقا کے لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو عملی سیاست میں قدم رکھنا پڑا۔ کیونکہ انھوں نے اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ جو کام پہلے ہندو فرقہ پرست تحریکیں کر رہی تھیں اب وہ عوامی تحریک بنتی جا رہی تھی اور اس میں کانگریسی زعماء گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈر بھی برابر کے شریک ہیں۔

۲۴اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگ پور میں "ہندی ساہتیہ پریشد" کل ہند کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی نمائندگی کی۔ اس کانفرنس کا مقصد ہندوستان کے تمام صوبوں میں رائج زبانوں میں تخلیق ہونے والے ادب میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ اس کانفرنس میں اس قرارداد پر اتفاق کیا گیا کہ پریشد کا سارا کام "ہندی۔ ہندوستانی" میں ہوگا۔ مولوی عبدالحق کے مطابق یہ لفظ (ہندی۔ ہندوستانی) پہلی بار سننے میں آیا تھا۔ جس پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے یہ سوال اٹھایا کہ نیشنل کانگریس کی قرارداد میں صرف "ہندوستانی" کو ملک کی زبان تجویز کیا گیا جو دیوناگری فارسی کسی بھی رسم الخط میں تحریر کی جائے اس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا کہ "وہ قرارداد میں نے بنائی تھی"۔ ان سے جب استفسار کیا گیا کہ ہندوستانی کے یہ معنی پہلے نہیں بتائے گئے تھے۔ تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ "اب میں نے بتا دیے ہیں۔ اب سمجھ لیجئے" ۲۰ پھر اس لفظ کو جس طرح مختلف قالب میں ڈھالا گیا وہ برعظیم، پاک و ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی بقاء اور تحفظ کے لیے جو جدوجہد کی اس کے نتیجے میں سیاسی حلقوں اور اردو داں طبقے میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی۔ ۲۱ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء میں عام انتخابات ہوئے۔ جس کے نتیجے میں ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ ان وزارتوں کے قیام سے اردو زبان کو لاحق خطرات میں اضافہ ہوا اور ہندی زبان کے حامی فرقہ پرستوں نے نہ صرف ہندی، بلکہ ہند قدیم کی تہذیب کی حمایت شروع کر دی اور انگریزوں کا تعاون انھیں بدستور حاصل رہا۔ کانگریس نے اپنے دور وزارت میں اردو زبان کے خلاف اقدامات کو جاری رکھا۔ جس کے خلاف انجمن ترقی اردو نے سخت مزاحمت کی۔ ناگ پور میں جب اردو اسکولوں پر پابندی عائد کی گئی تو تقریباً بیس ہزار مسلمانوں نے اس کے خلاف ستمبر ۱۹۳۸ء میں ناگ پور کی صوبائی اسمبلی کے سامنے مظاہرہ کیا اور اکتوبر ۱۹۳۸ء میں اردو کانفرنس میں اردو کے حق کو تسلیم کروانے کے لیے قانون شکنی کی قرارداد منظور ہوگئی۔ مسلم لیگ گو کہ ۱۹۳۶ء میں اردو کی قرارداد منظور کر چکی تھی۔ اس کے باوجود لیاقت علی خان نے جو مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل تھے، ناگ پور میں مسلمانوں کو قانون شکنی روک دینے کی ہدایت کی۔ اردو کے خلاف یہ مہم ۱۹۳۹ء تک جاری رہی جب تک کہ کانگریسی وزارتیں ختم نہیں ہوگئیں۔ ۲۲ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور منظور ہوئی تو مسلمانوں کا نصب العین بھی متعین ہوگیا اور ابہام کی کیفیت کا

خاتمہ ہوا۔ مسلمان جوں جوں آزادی کی منزل کے قریب ہوتے گئے اردو زبان کی مخالفت بھی بڑھتی گئی جس کے لیے یہ حکمت عملی بنائی گئی کہ ہندوستان کے ہر گوشے میں اردو زبان کے حق میں کانفرنسیں منعقد کی جائیں۔ مہاتما گاندھی اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان قرار دے چکے تھے ۱۹۴۴ء میں ہندو مہاسبھا کے صدر ساورکر نے بڑے پیمانے پر "اینٹی اردو ویک" منانے کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب برعظیم کو پاکستان اور بھارت دو ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی دہلی میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے۔ جس سے انجمن ترقی اردو کا دفتر بھی متاثر ہوا۔ کتابیں جلا دی گئیں اور عمارت پر قبضہ کر لیا گیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے یہ کوشش کی کہ وہ ہندوستان میں رہ کر اردو زبان کی خدمت کر سکیں لیکن حالات آپ کی خواہش کے برعکس تھے۔ مجبوراً آپ کو ترک وطن کرنا پڑا۔ انہوں نے انجمن کی اور اپنی ذاتی کتب پاکستان لانے کی کوشش کی۔ جس کو ناکام بنا دیا گیا۔

پاکستان میں انجمن ترقی اردو کی ذیلی شاخیں موجود تھیں جن کا مرکز دہلی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ مرکز ختم ہو گیا۔ چنانچہ کراچی جو پاکستان کا پہلا دارالحکومت تھا یہاں انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر قائم کیا گیا۔ پیر الٰہی بخش، پیر حسام الدین راشدی، اور سید ہاشم رضا کی کوششوں سے انجمن کو شاردا دویا مندر (واقع مشن روڈ موجودہ بابائے اردو روڈ) کی عمارت مل گئی۔

۱۳ فروری ۱۹۴۹ء کو انجمن ترقی اردو پاکستان کی نئی مجلس نظما کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت وزیر خزانہ، حکومت پاکستان جناب غلام محمد نے کی۔ اس جلسے میں انجمن کا دستور العمل پیش کیا گیا۔ جس کی مجلس نظما نے توثیق کی۔ مجلس نظما کے ارکان میں جناب شعیب قریشی، جناب چودھری خلیق الزماں، جناب حکیم محمد احسن، جناب غلام محمد (صدر جلسہ)، جناب نواب صدیق علی خاں، جناب پیر الٰہی بخش، جناب سید ہاشمی فرید آبادی اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق (معتمد اعزازی) شامل تھے۔ ۲۳ صدارت کے عہدے پر شیخ عبدالقادر فائز ہوئے۔ مولوی عبدالحق بدستور سیکریٹری رہے۔ شیخ عبدالقادر کی وفات کے بعد صدارت کے فرائض مولوی عبدالحق کے سپرد کیے گئے۔ بابائے اردو کا انتقال کراچی میں ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو ہوا۔ مولوی عبدالحق کے بعد انجمن ترقی اردو کے تیسرے دور کا آغاز ہوا۔ مولوی عبدالحق کے بعد انجمن کے صدر مغربی پاکستان کے سابق گورنر اختر حسین اور معتمد اعزازی

جناب جمیل الدین عالی بنائے گئے۔ جناب اختر حسین صدر انجمن ترقی اردو کا انتقال ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء کو ہوا۔ ان کے بعد قدرت اللہ شہاب کو نیا صدر منتخب کیا گیا اور جناب نور الحسن جعفری اعزازی ناظم منتخب ہوئے۔ انجمن کے تیسرے صدر قدرت اللہ شہاب کا ۱۹۸۶ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد نور الحسن جعفری کا صدر انجمن ترقی اردو کے لیے انتخاب ہوا۔ ۳ دسمبر ۱۹۹۶ء کو جناب نور الحسن جعفری وفات پا گئے تو ان کی جگہ آفتاب احمد خان نئے صدر مقرر ہوئے جو تا حال انجمن کے صدر ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور مشرقی پاکستان میں لسانی وحدت کے لیے کوششیں کیں۔ اس مقصد کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں انجمن کی شاخیں قائم کی گئیں۔ جن میں صوبہ سندھ کے کراچی، حیدرآباد، نواب شاہ، ٹنڈو محمد خان، شکار پور، کوٹری، صوبہ پنجاب کے لاہور، پاک پتن، سرگودھا، چکوال، تلہ گنگ، راولپنڈی، خانیوال اور ملتان، صوبہ بلوچستان کے کوئٹہ، صوبہ سرحد کے ڈیرہ اسماعیل خان، اور پشاور صوبہ مشرقی پاکستان کے ڈھاکہ، سلہٹ، میمن سنگھ، سید پور، چاٹ گام، کومیلہ وغیرہ شامل ہیں۔[۲۴] قیام پاکستان کے بعد انجمن کا مقصد اردو کو پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان کی حیثیت سے نافذ کرنا اور اردو یونیورسٹی قائم کرنا تھا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد سرکاری اور قومی زبان کے سلسلے میں مشرقی بنگال میں اردو کی شدید مخالفت ہوئی۔[۲۵] اس مخالفت کو ختم کرنے کے لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مشرقی بنگال کا دورہ کیا۔ انھوں نے ۱۳ مارچ ۱۹۴۸ء کو اردو کانفرنس (سلہٹ) کے افتتاح کے موقع پر مشرقی بنگال اور ملک کے دوسرے حصوں کے درمیان اتحاد کے رشتے کو مضبوط بنانے اور یہاں پر اردو کے فروغ اور ترقی پر زور دیتے ہوئے کہا:

> "قوم اور زبان ایک ہیں۔ جدا جدا نہیں... ملک کے باشندوں کے لیے جو مختلف علاقوں میں آباد ہیں مشترک ہونا لازم ہے ورنہ ان میں خیالات کا اتحاد، جیسا کہ ہونا چاہیے، نہ ہو سکے گا اور خیالات کا اتحاد سب سے بڑا اور قومی اتحاد ہے۔ اس وقت مشرقی پاکستان کے لیے اتحاد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے اہلِ حکومت اور ذی اثر اصحاب کو اس معاملے

میں بڑی جرأت، تدبر اور دور اندیشی سے کام لینا چاہیے۔ اس سے غفلت برتی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ علاقہ پاکستان میں وہ حیثیت حاصل نہ کر سکے گا جو کثرت آبادی اور قدرتی خوبیوں کی وجہ سے اسے حاصل ہونا چاہیے اور یہ اپنی قومی تہذیب اور روایات سے محروم رہ کر پاکستان کے دوسرے علاقوں سے بیگانہ ہو جائے گا۔ باقی پاکستان سے اس کا تہذیبی اور روحانی تعلق قطع ہو جائے گا اور صرف سیاسی تعلق باقی رہ جائے گا۔ یہ صورتحال ساری مملکت کے لیے خطرناک ہوگی۔ ۲۶

بابائے اردو مولوی عبدالحق اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ قومی زبان کے بغیر قوم کا شیرازہ مستحکم نہیں ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام کوششیں پاکستان کے تمام صوبوں میں لسانی وحدت کے لیے صرف کیں۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے مختلف رسالوں کا بھی اجراء کیا گیا۔ جن میں قومی زبان جس کا دلی میں "ہماری زبان" کے نام سے مہینے میں دو دفعہ اجرا ہوتا تھا۔ یکم جون ۱۹۴۸ء سے قومی زبان کے نام سے ہفت روزہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔ جس میں علمی و ادبی سرگرمیوں اور انجمن کی خبروں کے علاوہ عام دلچسپی کی چیزیں اور علمی و ادبی مضامین بھی شائع کیے جانے لگے تھے اور معیاری نظم و نثر کے نمونے مستقل عنوانات کے تحت شائع کیے جاتے تھے۔ اس ہفت روزہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سندھی زبان کا ایک صفحہ بھی شائع ہوتا تھا۔ جس کا مقصد سندھی داں طبقے میں فصیح اردو کی تعلیم و ترویج اور دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں یگانگت پیدا کرنا تھا۔ ۲۷

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے قیام کے سلسلے میں اردو کی ترویج اور فروغ کی غرض سے دو نہایت ہی اہم اور موقر جرائد شائع کیے۔ ان میں ایک سہ ماہی "اردو" اور دوسرا سہ ماہی "معاشیات" ہیں۔ سہ ماہی جریدہ "اردو" تقسیم ملک سے قبل ۱۹۲۱ء سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا تھا لیکن تقسیم ہند کی وجہ سے وہ ڈیڑھ سال تک موقوف رہا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں اعلیٰ پائے کے علمی، ادبی، لسانی اور تحقیقی مقالات شائع ہوتے تھے۔ ۲۸

سہ ماہی "معاشیات" کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا۔ جس میں پاکستان اور تمام دنیا کے معاشی مسائل پر نہایت پر مغز اور سیر حاصل مقالات شائع ہوتے تھے۔ ۲۹؎ اپریل ۱۹۵۱ء میں "تاریخ اور سیاسیات" کے موضوع پر پہلا شمارہ کا اجراء ہوا جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا جریدہ تھا۔ ۳۰؎ لیکن ۱۹۵۴ء میں یہ خسارے کے باعث بند ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کو انگریزی کی جگہ سرکاری زبان قرار دینے کی جو سب سے بڑی توجیح پیش کی جاتی تھی کہ اردو میں دفتری امور اور سرکاری کاروائیوں کے لیے اصول موجود نہیں ہیں۔ بابائے اردو نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے "مجلس سائنس" قائم کی۔ جس کا مقصد اصطلاحات میں انجمن کو مشورہ دینا تھا اور اردو میں سائنسی مضامین کو منتقل کرنا تھا۔ ۳۱؎ اس کے تحت پہلا رسالہ جنوری ۱۹۵۲ء میں نکلا اور ۱۹۵۵ء کے وسط میں بند کر دیا گیا۔ اس کی وجہ لوگوں میں اردو زبان میں سائنسی مضامین سے عدم دلچسپی تھی۔ ۳۲؎

انجمن ترقی اردو نے پاکستان میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے اور اسے سرکاری اور قومی زبان کا درجہ دینے کے لیے علمی و فنی اصطلاحات سازی کی جانب سب سے پہلے توجہ دی۔ علمی و فنی اصطلاحات سازی کے کام کا آغاز قیام پاکستان سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان اصطلاحات میں مزید کام اور مختلف علوم وفنون کے مصلحات جمع کر کے اسے چھپوانے کی غرض سے کام شروع کر دیا۔ اس غرض سے مولوی عبدالحق نے علمی و فنی اصطلاحات اور ان کے اصول اور طریق کار کے بارے میں اردو اور انگریزی میں دو رسالے لکھوائے اور یہ انجمن کی جانب سے شائع کیے گئے۔ انجمن کے اس گراں قدر علمی کام سے جن سرکاری محکموں نے فائدہ اٹھایا ان میں اسٹیٹ بینک، محکمہ میکانیات، اردو اکیڈمی پنجاب، محکمہ جنگلات اور محکمہ انجینئرنگ، محکمہ رفاہ عامہ حکومت پاکستان شامل ہیں۔ ۳۳؎

انجمن نے سرکاری دفاتر میں اردو کے فروغ کے لیے دفتری اصطلاحات کی تیاری میں حصہ لیا اور انگریزی اصطلاحات اور اردو مترادفات وضع کر کے ان دفاتر کو بھیجیں۔ ان دفاتر میں دفتر نظامت کراچی، مجلس دستور ساز، وزارت داخلہ، محکمہ ہوابازی، محکمہ ریلوے، محکمہ مردم شماری، طیران گاہ، محکمہ امداد باہمی و بازارات، محکمہ رفاہ عامہ، محکمہ پولیس، بینکس اور تجارتی ادارے۔ ان دفتری اصطلاحات کے علاوہ بعض اداروں کے لیے دفتری قواعد و

ضوابط اور فارم وغیرہ کا اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا۔[۳۴]

انجمن ترقی اردو پاکستان کے اس ابتدائی دور میں ایک کتب خانے اور دارالمطالعے کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ جس کا افتتاح ۱۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کیا۔ کتب خانے کی از سر نو تنظیم میں بابائے اردو کی ذاتی کوششوں کا بڑا عمل دخل تھا۔ انہوں نے ریاست حیدرآباد (دکن) سے نو ہزار اردو کتابیں خریدیں اور اس ذخیرے کو پاکستان منتقل کیا۔ اس کے علاوہ دلّی، لاہور، بھوپال، حیدرآباد اور دوسرے مقامات کے سفر میں انھوں نے قلمی نادر کتب اور دوسرے نوادر مثلاً خطاطی اور اعلیٰ خوش نویسی کے نمونے، قدیم تصویریں، پرانے خطوط وغیرہ بڑی تلاش وجستجو کے بعد جمع کیے جو کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۵۰ء تک بابائے اردو کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے انجمن کے کتب خانے میں تقریباً پندرہ ہزار کتابیں جمع ہو چکی تھیں جو تقریباً ایک سو موضوعات پر مشتمل تھیں۔[۳۵]

قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کے فروغ کے لیے انجمن کی جانب سے ملک گیر کانفرنسوں[۳۶] کا انعقاد بھی کیا گیا تاکہ اردو کی ترویج واشاعت کی جا سکے۔ ان کانفرنسوں کا مقصد اردو زبان کو اس کا حق دلوانے اور صحیح معنوں میں اسے عملی زبان بنانے کی تدابیر پر غور وفکر کرنا تھا۔ انجمن نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۱ء تک لاتعداد کتب شائع کیں۔ جن میں اردو، انگریزی مصطلحات، ادب، فلسفہ، سائنس، تاریخ، تحقیق وتنقید کے علاوہ دیگر موضوعات کا احاطہ ہوتا ہے۔[۳۷]

انجمن کی تحریک پر آج پاکستان میں اردو زبان وادب کی ترقی اور اردو زبان کے نفاذ کے لیے متعدد اہم ادارے سرگرم عمل ہیں۔ اردو کی بقاء، فروغ اور نفاذ کے سبھی پہلو جو انجمن کے پیش نظر رہے، اب متعدد ادارے اس نصب العین کے لیے کام کر رہے ہیں۔ انجمن نے قدیم اردو ادب کی تلاش، اس کی محققانہ تدوین اور اشاعت سے اردو زبان کی بے لوث خدمت کی۔ اردو قواعد اور لغات پر بنیادی کام کیا۔ فلکیات، جغرافیہ، عمرانیات، طبیعیات، کیمیا، بینکاری کی علمی اصطلاحات شائع کیں۔ فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ اردو کی لسانی تاریخ پر کام ہوا۔ عالمی ادب، علاقائی ادب اور جملہ علوم وفنون کے تراجم انجمن کا عظیم کارنامہ ہے۔ متعدد جلدوں میں "قاموس الکتب" کی ترتیب واشاعت انجمن کا ایک اور عظیم کارنامہ ہے۔ تنقید، تاریخ، عمرانیات،

جدید سائنس وفلسفہ، معاشیات، تعلیم، مذہب، قانون اور ادبیات عالیہ کے سلسلے میں انجمن کی تصنیفات، تالیفات نے اردو زبان کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔[۳۸] انجمن کا کتب خانہ خاص تیس ہزار کتابوں، چالیس ہزار رسائل اور تین ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے۔ مخطوطات کو حفاظت کی غرض سے مستقل طور پر نیشنل میوزیم آف پاکستان میں امانتاً رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن یہ مخطوطات انجمن کی ملکیت ہیں۔[۳۹] یہ کتب خانہ تحقیقی مقاصد کے لیے ہے۔ کتب خانہ عام میں بائیس ہزار کتابیں ہیں۔ انجمن کی معیاری مطبوعات کی تعداد تقریباً پانچ سو ستر سے اوپر ہے۔

مقتدرہ قومی زبان:

مقتدرہ قومی زبان دستور پاکستان کی دفعہ نمبر ۲۵۱(ا) کے تحت کہ "پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور آئین کے یوم نفاذ سے پندرہ برس کے اندر اس کے دفتری اور دیگر مقاصد میں استعمال کے انتظامات کیے جائیں گے۔" ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو حکومت پاکستان کابینہ ڈویژن کی قرارداد نمبر ۵ ۲۷/سی ایف ۷۹/ کے تحت نفاذ اردو کی ضروری تیاری کے لیے وجود میں آیا۔ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے۔ اس ادارے کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی کہ قومی زبان کے نفاذ کے لیے حکومت کو سفارشات پیش کرنے اور ساتھ ہی قومی زبان اردو کو انگریزی کی جگہ لینے کے لیے تیار کرے۔

مقتدرہ قومی زبان کے فرائض کار حسب ذیل ہیں:[۴۰]

۱۔ اردو کی ترقی کے سلسلے میں وزیراعظم کو سفارشات پیش کرنا اور ضروری اقدامات کرنا

۲۔ سرکاری دفتروں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں میں زیر ملازمت افراد کی تربیت کے لیے اردو کو بطور دفتری زبان متعارف کرانا

۳۔ اردو کے تمام ترقیاتی اداروں کے مابین ارتباط پیدا کرنا

۴۔ مقابلے کے امتحانوں کے لیے اردو اختیار کرنے میں سہولت پیدا کرنا

۵۔ قومی زبان کی ترقی کے لیے وزیراعظم کی تفویض کردہ تمام ذمہ داریاں نبھانا

۶۔ پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے فروغ اردو کے وسائل اور ذرائع پر غور اور ضروری اقدامات کرنا

مقتدرہ کی ہیئت حاکمہ (بورڈ آف گورنرز) انیس اراکین پر مشتمل ہے۔ ان اراکین میں صدر نشین اور معتمد بھی شامل ہیں۔ یہ ادارے کی سب سے اعلیٰ مجلس ہے۔ جو اس کی حکمت عملی کے تعین، جائزہ، پروگرام اور عمومی رہنمائی کی ذمہ دار ہے۔ ہیئت حاکمہ کے لیے ممبران کا انتخاب تقریباً تین سال کے لیے ہوتا ہے۔ اس میں غیر سرکاری اراکین کی تعداد دس ہوتی ہے۔ جن کا انتخاب ملک کے تمام صوبوں کے ممتاز اہل علم اور دانشور شخصیات میں سے کیا جاتا ہے۔ موجودہ ہیئت حاکمہ میں جن غیر سرکاری اراکین کو نامزد کیا گیا ہے ان میں ڈاکٹر عبدالرزاق صابر، جناب طاہر محمد خان، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، محترمہ کشور ناہید، ڈاکٹر انور نسیم کے نام شامل ہیں۔[۱۴]

سرکاری ارکان (نمائندگان) بلحاظ عہدہ کابینہ ڈویژن، وزارت مالیات کے نمائندے، وزارت تعلیم، وزارت اطلاعات ونشریات، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، فیڈرل پبلک سروس کمیشن اور نیشنل بک کونسل کے نمائندے شامل ہیں۔ مقتدرہ کے صدر نشین اور معتمد بالترتیب ہیئت حاکمہ کے صدر اور معتمد بھی ہیں۔

مقتدرہ قومی زبان کابینہ ڈویژن کے تحت ایک خود مختار ادارہ ہے۔ نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان حکومت کو سفارشات پیش کرنے کے علاوہ دارالترجمہ، دار اللغات، دارالاشاعت کے شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ یہ شعبہ جات اردو میں قواعد وضوابط اور قوانین کے ترجمے، لغات کی ترتیب و تدوین اور علم اصطلاحات سازی میں جدید تحقیق کو سامنے لانے، جامعاتی سطح پر طلبہ کے لیے اہم موضوعات پر درسی اور معاون درسی کتب کی تیاری اور قومی زبان کے فروغ اور اس سے متعلق مطالعاتی مواد کی تصنیف وتالیف کے سلسلے میں سرگرم عمل ہیں۔[۴۲] نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان نے ۱۹۸۱ء اور ۲۰۰۵ء میں درج ذیل سفارشات حکومت پاکستان کو پیش کیں:

۱۔ اردو کو بطور دفتری وکاروباری زبان بنانا

۲۔ اردو بطور ذریعہ تعلیم

۳۔ مقابلے کے امتحانات میں اردو

مقتدرہ کے سامنے نفاذ اردو کا پہلا اور بنیادی مرحلہ دفتروں میں اردو کا رواج تھا۔ اس مقصد کے لیے

دفتری نظام کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے مقتدرہ نے بیک وقت کئی منصوبوں پر کام کیا۔ جس کے تحت دفتری نظام کے بنیادی صیغے ٹائپ کاری اور افسران وعملہ کی ذہنی اور ماہرانہ تربیت کو سرفہرست رکھا گیا۔۴۳ اس کے لیے کئی اقدامات کیے گئے، جن میں دفتری و سرکاری دستاویزات کے تراجم، دفتری اردو کے موضوع پر لغات اور دیگر تربیتی مواد کی تیاری، تربیتی مواقع کی فراہمی، نظم ونسق کے موضوع پر مواد اور جائزے نیز قدیم دستاویزات کا مطالعہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس ضمن میں تقریباً ستر ہزار صفحات پر مشتمل سرکاری دستاویزات کا ترجمہ مکمل کیا گیا۔ اس میں حکومت کے مختلف ڈویژنوں، محکموں اور وزارتوں کے علاوہ نیم سرکاری اداروں کی دستاویزات اور کتابیں نیز اواینڈ ایم ڈویژن کی شائع کردہ انتظامی و مالیاتی قواعد وضوابط کے ترجمے بھی شامل ہیں۔

مقتدرہ نے دفتری لغات کی تیاری میں خصوصی دلچسپی لی اور مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب کی ۳۵ ہزار اصطلاحات پر نظر ثانی کی۔ اس لغت کی اشاعت "دفتری اصطلاحات ومحاورات" کے نام سے حکومت پنجاب نے کی۔ اس کے علاوہ متعدد لغات مقتدرہ سے شائع کی گئیں جن میں مختصر اصطلاحات دفتری، دفتری ترکیبات و محاورات، فقرات کی لغت اور اصطلاحات حسابداری ومحاسبی، دفتری اصطلاحات اور سفارت کاری کی اصطلاحات شامل ہیں۔ دفتری امور میں سب سے اہم مرحلہ مراسلات کا ہوتا ہے۔ مقتدرہ نے اس سلسلے میں مختلف اصولوں، نمونوں اور ضروریات پر مشتمل نو جلدیں مرتب کیں۔ علاوہ ازیں مختصر نویسی اور ٹائپ کاری کی درسی کتابیں بھی شائع کی گئیں۔ دفتری اردو ورکشاپ کا ایک مکمل سیٹ بھی شائع ہوا۔ مقتدرہ نے نہ صرف اردو زبان میں دفتری مواد کی اشاعت کی بلکہ اہل کاروں اور افسروں کی دفتری اردو میں تربیت بھی کی۔ اس کام میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی خدمات بھی حاصل کی گئیں اور دونوں اداروں کے اشتراک سے دفتری امور کے نصاب کی تیاری کی گئی، کابینہ ڈویژن کے تعاون سے متعدد افراد کو اردو مختصر نویسی، ٹائپ کاری کی تربیت دی گئی۔

مقتدرہ قومی زبان نے نفاذ وترویج اردو کے مختلف موضوعات پر ایک سو اٹھائیس سے زیادہ پمفلٹ کی اشاعت کی۔ مقتدرہ کا ایک عظیم کارنامہ دفتری اردو کے جدید اسلوب کے ساتھ ساتھ سابقہ ادوار میں اردو کے نفاذ اور اس کے نمونوں کے جائزے بھی تیار کرانا اور شائع کرنا ہے۔ اس سے ایک مقصد تو تاریخی تسلسل کو قائم رکھنا ہے اور دوسرا اس تاریخی مواد سے آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے میں دشواری نہ ہو۔۴۴

عدالتوں میں نفاذ اردو

مقتدرہ قومی زبان کا ایک بڑا کارنامہ عدالتی سطح پر اردو کے نفاذ کے لیے لغات کی تیاری، قوانین کے تراجم، قانونی کتابوں کی فہرستیں، قدیم نمونوں کا جائزہ اور فیصلہ نویسی، دستاویزات نویسی کے موضوعات پر کتابیں مرتب کرنا اور شائع کرنا ہے۔ اس سلسلے میں مقتدرہ نے حسب ذیل امور پر کام کیا:

قانونی لغات کی تیاری:

مقتدرہ قومی زبان نے عدالتی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے تین جلدوں پر مشتمل کشاف قانونی اصطلاحات اور دو جلدوں پر مشتمل کشاف اصطلاحات قانونی (اسلامی) شائع کیں۔ علاوہ ازیں ماضی سے رشتہ استوار رکھتے ہوئے اور مستقبل کی ضرورت کے پیش نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اصطلاحات پر مبنی قدیم "اصطلاحات عدلیہ و مالگزاری" اور "قدیم مستعمل قانونی اصطلاحات" بھی شائع کی گئیں۔ مقتدرہ کی ایک بڑی کاوش وزارت انصاف کے تعاون سے ایسے قوانین کے تراجم کی اشاعت کرنا ہے جو اردو میں معیاری صورت میں موجود نہ تھے۔

مقتدرہ نے عدالتوں کو اردو کے ذخیرے سے مالا مال کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس ضمن میں قدیم قانونی لغات کے علاوہ دستاویزات پنجاب کی روشنی میں "اردو کے قدیم عدالتی نمونے" شائع کیے جا چکے ہیں۔ عہد حاضر کے حوالے سے، مقتدرہ نے اردو میں فیصلہ نویسی کی تربیت و سہولت کے لیے "اردو میں عدالتی فیصلہ نویسی اور منتخب عدالتی فیصلے" نیز "شرعی عدالت میں اردو کی ترویج" وغیرہ جیسی مطبوعات طبع کیں۔ ان میں اُردو میں فیصلہ نویسی کے طریقوں اور اصولوں کو پیش کیا گیا اور ایسے فیصلے بھی شامل کیے گئے جو اعلیٰ عدالتوں نے اُردو زبان میں لکھے۔ اُردو زبان میں وثیقہ، دستاویزات اور عرائض لکھنے کے لئے ایسی کتب کو منظر عام پر لایا گیا کہ جن میں "قانونی دستاویزات نویسی" اور "جدید عرائض نویسی" کے نمونے پیش کیے گئے۔ ان میں جدید انداز، سادہ اور رواں انداز تحریر کا انتخاب کیا گیا تا کہ عدالتوں میں وکیلوں، منشیوں، وثیقہ نویسوں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کے لیے بھی رہنما کتب مہیا ہو سکیں۔[۴۵]

اُردو بطور ذریعہ تعلیم اور نصابی کتب:

تعلیمی اداروں میں اُردو بطور ذریعہ تعلیم کے لئے مقتدرہ نے بنیادی کام کیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف موضوعات پر اُردو میں کتابوں کی فہرستیں اور کتابیات کی تیاری، مختلف موضوعات پر لغات واصطلاحات کی تیاری، ذریعہ تعلیم وتدریس کے مسائل، نیز سائنسی وسماجی علوم کے لئے اعلیٰ سطح کی معیاری کتب کی تیاری اور اشاعت شامل ہیں۔ ایک اندازکے مطابق اُردو میں اب تک تین لاکھ کے قریب ذخیرہ اصطلاحات تیار کیا جاچکا ہے۔ جو کسی زبان کی سائنسی وعلمی امور کی انجام دہی کے لئے کافی ہیں۔

اُردو زبان کے فروغ کے لئے اُردو میں نصابی ودرسی کتب کی تیاری کا کام ۱۹۸۶ء میں شعبہ درسیات میں جاری ہے۔ اس وسیع کام کو ٹھوس بنیادوں پر انجام دینے کے لئے ۱۹۸۸ء میں ایک جامع منصوبہ بندی کے تحت ایم اے / ایم ایس سی کی سطح پر دس جامعاتی شعبہ جات کے ایک سو منصوبے شروع ہوئے۔ جن میں سے اب تک پچھتر کتابی صورت میں سامنے آچکے ہیں۔ ان دس شعبہ جات میں طبعیات، کیمیا، حیوانیات، نباتیات، ارضیات، ابلاغیات، بشریات، جغرافیہ، سیاسیات، اور لائبریری سائنس شامل ہیں۔ علاوہ ازیں، تدریس زبان، تدریس اُردو، فلسفہ، نفسیات، عسکریات، بیمہ کاری، علم التعلیم اور طب پر بھی درسی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ملک کے نامور مصنفین اور سائنس دان اساتذہ کی یہ تصانیف نہ صرف اُردو زبان میں اولیت کا درجہ رکھتی ہیں بلکہ ان سے اُردو کے علمی ولسانی ذخیرے میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ [۴۶]

علم ترجمہ اور اصطلاحیات:

مقتدرہ نے ترجمہ کے موضوع پر دو سیمینار منعقد کرنے کے علاوہ اصول وتکنیک ترجمہ اور کتابیات تراجم کے متعدد منصوبوں پر کام کیا۔ ترجمہ کے فن کو فروغ دینے کے لئے "اصول ترجمہ" کا ایک کورس بھی وضع کیا گیا ہے جسے پاکستانی جامعات میں بھی متعارف کروایا جائیگا اور اس کی تدریس کا اہتمام مقتدرہ میں بھی کیا جائیگا۔ اس سلسلے میں اصول وتکنیک، ترجمہ اور کتابیات ترجمہ کے موضوع پر تینتیس مطبوعات پیش کی گئی ہیں۔ مقتدرہ نے دنیا کی عظیم علمی کتب کے اُردو تراجم کی داغ بیل ڈالی تاکہ ان سے نہ صرف اُردو میں نئے علمی اسالیب شامل ہوں بلکہ

عالمی دانش کے اس ورثے کو بھی قومی زبان میں فراہم کرنے کے مواقع میسر ہوں۔ اس کی ابتداء ایسے دس بارہ تراجم سے کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ عظیم کتب کے علمی مطالعے پر مبنی ایک تحقیقی مقالہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ مقتدرہ کی اس سلسلے میں یہ کوشش ہے کہ تقریباً سو تراجم شائع کیے جائیں۔ جس میں پچاس تیاری کے مراحل میں ہیں اور ایک سو پچیس اشاعت پذیر ہیں۔ ۴۷ے

تکنیکی خدمات:

مقتدرہ نے اُردو ٹائپ مشین کا معیاری تختہ تیار کیا ہے جس کو واحد کلیدی تختہ کے طور پر حکومتِ پاکستان منظور کر چکی ہے۔ اسی کلیدی تختے کی بنیاد پر ٹی۔ آئی۔ پی (ہزارہ) نے دستی سفری ٹائپ مشین تیار کیں جو بازار میں دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد نجی اداروں / کمپنیوں نے بھی یہ مشین تیار کی ہیں۔ مقتدرہ نے برقیاتی کلیدی تختہ بھی تیار کیا جس کی بنیاد پر ٹی آئی پی نے اُردو تار گھر کے لئے مشین اور آئی بی ایم نے برقیاتی ٹائپ مشین وغیرہ تیار کی ہے۔ علاوہ ازیں اُردو کمپیوٹر اور لفظ کار (ورڈ پروسیسر) بھی کئی کمپنیوں نے تیار کئے ہیں جو بازار میں دستیاب ہیں اور تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں۔

اُردو کمپیوٹر (ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر) کی تیاری کے سلسلے میں مقتدرہ نے بعض بین الاقوامی کمپنیوں کو مشاورتی خدمات فراہم کی ہیں۔ مقتدرہ نے ان مسائل پر کتب اور پمفلٹ بھی شائع کئے ہیں۔ ۴۸ے

اخبارِ اُردو:

مقتدرہ قومی زبان کے شعبہ تعلقات عامہ کی طرف سے مقتدرہ کی رپورٹیں، اہلِ علم کے خیالات، اُردو کے فروغ سے متعلق، اہم تجاویز، مضامین اور تبصرے شائع کرنے کے لئے "اخبارِ اُردو" ہر ماہ شائع کر کے اہل علم اور اُردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس میں اُردو کمپیوٹر، بیرونی ممالک میں اُردو، اُردو اصطلاحات سازی، اُردو اور علاقائی زبانوں کے ثقافتی و لسانی روابط، اُردو میں سائنس اور دیگر کئی اہم موضوعات پر خصوصی شمارے شائع کئے گئے ہیں۔ ۴۹ے

کتب خانہ:

مقتدرہ میں اُردو کے تحقیقی کام انجام دینے کے لئے بیس ہزار کتب و رسائل پر مشتمل ایک کتب خانہ موجود ہے۔ جس سے محققین استفادہ کر رہے ہیں۔ یہ کتب خانہ زبان و ادب کے علاوہ حوالہ جاتی مآخذوں، کتابیات، اصول ترجمہ، اور اصطلاحات کی کتب کے لحاظ سے منفرد ہے۔ ان کتب میں اُردو، انگریزی، ہندی، فارسی، عربی، پنجابی، سندھی، اور بلوچی زبانوں کی ایک لسانی، ذولسانی اور کثیر اللسان لغات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم اور نایاب کتب کی عکسی نقول نیز برٹش لائبریری لندن سے قدیم قلمی نسخوں کی چند مائیکرو فلمیں بھی حاصل کر کے رکھی گئی ہیں۔ علمی اشاعتی اداروں کے ساتھ ساتھ تبادلہ کتب و جرائد بھی عمل میں آتا ہے اور بعض اہلِ علم سے نادر ذخیرہ کتب کا حصول بھی جاری ہے۔[۵۰]

دیگر اداروں سے تعاون و اشتراک:

مقتدرہ زبان اسلام آباد نے دیگر اداروں کے ساتھ تعاون و اشتراک کر کے اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، سیکریٹریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد، ترقی خواتین ڈویژن اسلام آباد، وزارتِ اطلاعات اسلام آباد اور دفتر محاسب اعلیٰ پاکستان کے ساتھ دفتری تربیت کے سلسلے میں رابطہ، اشتراک اور تعاون کیا جا رہا ہے۔ اُردو کے دیگر اداروں مثلاً بہاء الدین ذکریا یونیورسٹی ملتان، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، اُردو سائنس بورڈ لاہور، جامعہ پنجاب لاہور، اُردو اکیڈمی لاہور، جامعہ کراچی اور پشتو اکیڈمی پشاور کے ساتھ مختلف منصوبوں میں اشتراک کے تحت متعدد کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ نیشنل ڈیٹا بیس آرگنائزیشن اسلام آباد، وفاقی وزارتِ تعلیم اسلام آباد، اے جی پی آر اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، نیشنل بک کونسل اسلام آباد، قومی ادارہ برائے تاریخ و ثقافت اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی اسلام آباد، بلدیہ عظمیٰ کراچی، بلدیہ وسطی کراچی، ادارہ ثقافت پاکستان اسلام آباد، سی ڈی اے اسلام آباد کے ساتھ تعاون و اشتراک ہے۔[۵۱]

مقتدرہ کی سفارشات نفاذ اُردو بطور دفتری زبان:

اُردو زبان کو سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں کیبنٹ کمیٹی کا اجلاس یکم فروری ۲۰۰۷ء کو ہوا۔ جس میں ڈاکٹر محمد وصی ظفر وزیرِ قانون و انصاف، جناب محمد علی درانی وزیر اطلاعات و نشریات، محترمہ زبیدہ جلال، وزیرِ سماجی بہبود و خصوصی تعلیم، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن چیرمین HEC نے شرکت کی۔ اس کمیٹی نے یہ سفارشات پیش کیں۔

۱۔ حکومت، افواج اور دیگر محکموں کی سرکاری تقریبات میں اُردو کو بطور ذریعہ ابلاغ استعمال کیا جائے۔

۲۔ وفاقی اور صوبائی پبلک سروس کمیشنوں کے امتحانات میں اُردو کو لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے۔

۳۔ نفاذ اردو کے لئے اوقات کا لائحہ عمل تیار کر کے کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے۔

۴۔ اُردو کو اختیار کرنے کے عمل کو تیز تر کیا جائے۔

۵۔ مرکز فضیلت برائے اُردو اطلاعیات (وفاقی اُردو یونیورسٹی الحاق کے حوالے سے) HEC سے رقوم کے حصول کے لئے ترقیاتی منصوبہ تیار کیا جائے۔۵۲

اُردو ڈکشنری بورڈ:

اُردو ڈکشنری بورڈ (سابق ترقی اُردو بورڈ) ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا، اس کا قیام وزارتِ تعلیمات، حکومت پاکستان کی ایک قرارداد مورخہ ۱۴ جون ۱۹۵۸ء کے ذریعے عمل میں آیا۔ جس کے مطابق یہ ادارہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری (کلاں) کی نہج پر اُردو کی ایک جامع لغت کی تدوین کے علاوہ اُردو کی ترقی کے سلسلے میں وہ ضروری کام بھی انجام دے گا جو حکومت پاکستان اسے تفویض کرے۔ حکومتِ پاکستان کی ۲۷ مارچ ۱۹۸۲ء کی قرارداد کے ذریعے بورڈ کا نام ترقی اُردو بورڈ سے تبدیل کر کے اُردو ڈکشنری بورڈ کر دیا گیا۔ اس قرارداد میں مزید ذمہ داریاں بورڈ کو تفویض کی گئیں اور یہ کہا گیا کہ:

الف۔ ترقی اُردو بورڈ کا نام تبدیل کر کے اُردو لغت بورڈ رکھ دیا گیا ہے۔

ب۔ اُردو لغت بورڈ کے فرائض حسبِ ذیل ہوں گے۔

۱۔ آکسفورڈ ڈکشنری (کلاں) کے معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لسانیاتی اصولوں کے مطابق ایک جامع

لغت اُردو کی تدوین، موجودہ کام ان ہی خطوط پر جاری رہے گا۔ جو اس مقصد کے لئے متعین کئے گئے تھے۔

۲۔ بورڈ عظیم تر اُردو لغت کے ایک مختصر مدونہ ایڈیشن کی تیاری واشاعت کے علاوہ دوسری ایسی علمی لغتوں کو تیار اور شائع کرے جو اس کے اصلی فرائض سے متعلق ہوں گی۔

۳۔ بورڈ دوسرے ایسے فرائض انجام دے گا جو وقتاً فوقتاً اس کے سپرد کیے جائیں گے۔

بورڈ "اردو لغت" کی اب تک اکیس جلدیں تیار کر چکا ہے اور بائیسویں جلد پر کام کیا جارہا ہے۔ اُردو لغت کا یہ منصوبہ تینتیس جلدوں میں مکمل ہو جائیگا۔ آخری جلد اشاریہ، مآخذ کی فہرست اور دوسری ضروری معلومات پر مشتمل ہوگی۔ اس کی تکمیل کے ساتھ ہی نئے منصوبوں پر کام کیا جائیگا۔

اُردو ڈکشنری بورڈ مجلسِ اعلیٰ، مجلسِ انتظامی اور عملہ ادارت پر مشتمل ہے۔ دفتری عملہ اور شعبہ طباعت اس کے علاوہ ہے۔ مجلسِ اعلیٰ، علمی مجلس تھی اور مجلسِ نظما کی قائم مقام تھی۔ اس مجلس کے اعزازی ارکان پاکستان کے مختلف شہروں سے ان کی علمی لیاقت اور تجربہ کی بنیاد پر منتخب کیے جاتے تھے۔ اب سرکاری درجہ مل جانے کے بعد مجلسِ اعلیٰ ختم کر دی گئی ہے۔ مجلسِ اعلیٰ کے ارکان ملک کے نامور صاحبان علم تھے۔ جن میں قابلِ ذکر نام ڈاکٹر مولوی عبدالحق، علامہ نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محمد شہید اللہ، جناب جوش ملیح آبادی، پروفیسر حمید احمد خان، جناب مجنون گورکھ پوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر محمد طاہر فاروقی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، جناب شان الحق حقی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر آفتاب احمد، ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، جناب ممتاز حسن (سی ایس پی)، جناب ہادی حسین (سی ایس پی ومصنف)، جناب محمد اظفر (سی ایس پی)، ڈاکٹر جمیل جالبی (ستارہ امتیاز)، ڈاکٹر جمیل الدین عالی (ہلال امتیاز)، پروفیسر کرار حسین، جناب شریف الحسن، جناب محمد سلیم الرحمٰن، جناب محمد احسن خان، جناب وارث سرہندی، جناب حفیظ ہوشیار پوری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، جناب نسیم امروہوی، جناب ہاشمی فرید آبادی، پروفیسر وقار عظیم، جناب انوار الحق جیلانی، جناب سراج احمد علوی، ڈاکٹر سہیل بخاری، جناب محمد رفیق خاور، جناب عبدالخلیق نقوی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، ڈاکٹر عبدالقیوم اعوان، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر قاضی محمد مرتضیٰ اور ڈاکٹر سید شاہ علی وغیرہ ہیں۔

اس وقت بورڈ کی مدیرِ اعلیٰ محترمہ فرحت فاطمہ رضوی صاحبہ ہیں۔ مدیر جناب لیاقت علی عاصم ہیں۔ نائب مدیران تین ہیں محترمہ یاسمین ظفر، جناب حسین مجتبیٰ زیدی اور جناب عقیل احمد صدیقی ہیں۔ معاون مدیران میں جناب شاہد درانی، محترمہ نجم السحر اور محترمہ نزہت سیما ارشاد صاحبہ شامل ہیں۔

اُردو ڈکشنری بورڈ میں اُردو لغت کے جس منصوبے پر تاریخی اصولوں پر کام ہو رہا ہے یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد عظیم منصوبہ ہے۔ جس کی مثال دنیا کی صرف دو زبانوں میں ملتی ہے۔ ایک آکسفرڈ انگلش ڈکشنری جس کی ستر برس میں تیرہ جلدیں شائع ہوئی تھیں اور دوسری مثال جرمن اکیڈمی آف سائنس ان برلن اور انسٹیٹیوٹ گوئن گن کے زیرِ نگرانی جرمن زبان میں سولہ جلدوں پر مشتمل (بتیس حصّوں میں) ۱۹۶۱ء میں یہ کام انجام پایا جب کہ اُردو ڈکشنری بورڈ نے تقریباً پچاس برس میں اکیس جلدیں شائع کیں۔ اس کام کے لئے تین تاریخی دور قائم کئے گئے۔ پہلا دور ولی دکنی پر ختم ہوتا ہے۔ (ابتداء تا ۱۷۰۰)، دوسرا دور ولی سے غالب تک (۱۷۰۰ تا ۱۸۵۷ء) اور تیسرا دور غالب اور اس کے ہم عصروں کے بعد سے آج تک کے مصنفین شامل ہیں (۱۸۵۷ء تا حال)۔ مستعمل الفاظ کے علاوہ متروک الفاظ کو جو کم از کم دو کتابوں میں استعمال ہوئے ہوں لغت میں شامل کیا گیا ہے۔ ابتداء سے موجودہ دور تک ہر لفظ کے معنوی ارتقاء کو واضح کیا گیا ہے۔ ہر لفظ کے اصلی مآخذ اور اس کے مفہوم کے ہر پہلو کی وضاحت کی گئی ہے۔ جدید الفاظ کو اس میں شامل کیا گیا ہے۔ ہر لفظ کے صحیح تلفظ اور اس کی تذکیر و تانیث کی نشاندہی کی گئی ہے اور قواعد میں اس کی حیثیت کی تصریح کی گئی ہے۔ الفاظ کے علاوہ ان کے تحت الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، اور کہاوتوں کا اندراج بھی کیا گیا ہے۔ بورڈ نے اُردو لغت کے منصوبہ کے ساتھ ساتھ ابتداء اُردو کی ترقی اور ترویج کے لئے بھی کچھ کام انجام دیئے مثلاً اردو ٹائپ رائٹر کے لئے "کی بورڈ" کی تیاری، ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامی اسکیم اور اُردو ٹائپ کا فروغ وغیرہ۔ اُردو لغت کے اس بڑے منصوبے کے ساتھ بورڈ نے وقتاً فوقتاً کچھ کتابیں بھی شائع کیں۔ مستقبل میں اُردو ڈکشنری بورڈ پوکٹ لغت، روزمرہ محاورات، نظرِ ثانی اور اضافی شدہ ایڈیشن اور مختلف علوم و فنون کی اشاعت پر کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔[۵۳]

بورڈ کے رفقائے علمی کے تصرف میں ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری ہے۔ جس میں اُردو ادب کا کامل ذخیرہ، اُردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور دیگر زبانوں کی مختلف لغات کے علاوہ کتب استناد اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں موجود ہیں۔ جب بورڈ نے کام کا آغاز کیا تھا تو اس وقت بورڈ کے پاس ایک کتاب بھی نہیں تھی، لیکن اب یہاں ایک نادر خزانہ موجود ہے جس میں تقریباً پندرہ ہزار پانچ سو پچاس نادر کتابیں موجود ہیں۔ جو بورڈ نے اپنے محدود وسائل سے کام لیکر رفتہ رفتہ بڑی تلاش اور کوشش سے حاصل کی ہیں، اس میں بعض نایاب کتب اور قلمی نسخوں کے مائیکروفلم بھی شامل ہیں جو انڈیا آفس لائبریری (لندن میوزیم) سے حاصل کر کے اس دور میں فوٹو پرنٹ بنوائے گئے تھے جبکہ فوٹو اسٹیٹ بھی متعارف نہیں ہوا تھا۔

اُردو لغت کی ۲۳ جلدوں میں اُردو ڈکشنری بورڈ کے اس منصوبہ کی تکمیل ایک سعادت ہے نہ صرف پاکستان اور پاکستانی قوم کے لئے بلکہ پوری اُردو دنیا کے لئے اس کی بدولت اُردو کو دیگر زبانوں پر ایک فوقیت اور اعزاز حاصل رہا ہے جو دنیا کی صرف دو زبانوں انگریزی اور جرمن کو حاصل رہا ہے۔ پاکستان کی طرف سے اُردو دنیا کے لئے بیسویں صدی کے اختتام پر اور اکیسویں صدی کے داخلے کے لئے اس اعزاز سے بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ سر سید احمد خان اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی طرح دیگر زعمائے ملت کی تکمیل بھی ہے۔

شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ: جامعہ کراچی

جامعہ کراچی میں شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ۱۹۵۷ء میں قائم کیا گیا۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ علوم و فنون کی اعلیٰ سطح پر قومی زبان اُردو میں تحقیق و تدریس کا اہتمام کرنے کے لئے کسی پاکستانی یونیورسٹی میں قائم ہونے والا پہلا ادارہ اور تمام دوسرے اسی نوعیت کے اداروں کا پیش رو ہے۔ اس شعبہ نے قومی زبان کے ذریعے علم کی خدمت کی۔ ان روایات کا راست امین ہے جو نواب شمس الامراء دہلی کالج اور سابق ریاست حیدر آباد دکن کی جامعہ عثمانیہ نے قائم کی تھیں۔ ۵۴

اُردو زبان کو قیام پاکستان کے بعد سے ہی بالعموم تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد ملک کے نظم و نسق اور کاروبار میں اُردو کے جائز مقام کے لئے یہ احساس پیدا ہوا کہ جب جدید سائنسی علوم و فنون کے دقیق مفاہیم اور مطالب کو آسانی سے ادا کیا جا سکے۔ وضع اصطلاحات کے لئے جامعہ عثمانیہ میں جتنا کام ہو چکا تھا اس پر نظرِ ثانی اور علوم میں نئی نئی دریافتوں کے پیشِ نظر اس کو آگے بڑھانا ضروری ہو گیا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ کسی جامعہ کی زیرِ نگرانی وہاں کی آزاد علمی فضاء میں ایک ادارہ قائم کیا جائے جو اُردو زبان میں تحقیق و تدریس کے وسائل مہیا کر سکے۔ ۵۵

سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی اس کے قیام کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

"جامعہ کراچی نے اُردو کی اہمیت و ضرورت کی پیشِ نظر ۱۹۵۷ء میں شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ قائم کیا تھا تا کہ عصری علوم اور جدید اصطلاحات کے تراجم کا ایک ایسا گراں قدر ذخیرہ مہیا کر دیا جائے جو اُردو زبان کے بحثیت قومی زبان، نفاذ کے لئے سنگِ اساس کا کام دے اور جدیدیت سے مرعوب اس ذہنیت کو ختم کر دے کہ اُردو، انگریزی کی متبادل نہیں ہو سکتی" ۵۶

میجر آفتاب حسن، اُردو کالج کے سابق پرنسپل کی تجویز پر چونکہ یہ شعبہ قائم کیا گیا تھا اس لئے اس کے اعزازی ناظم ہوئے۔ اس ادارے کے مندرجہ ذیل تین اغراض و مقاصد متعین ہوئے۔

۱۔ عام علمی فرہنگوں کا ترجمہ اور "اردو انگریزی لغت" اور "اُردو لغت" کی تالیف اس مقصد کے لئے مختلف عنوانات کے تحت درسی اسباق پر مشتمل" یک موضوعہ "رسائل کی اشاعت کا خصوصی اہتمام کرنا، تا کہ بعد میں ان رسائل کو مختلف ابواب کے تحت جمع کر کے ایک درسی کتاب کی شکل دی جا سکے۔

۲۔ اُردو کی ادبیات عالیہ کا انگریزی اور دیگر بیرونی زبانوں میں حسبِ ضرورت ترجمہ کرانا اور بیرونی زبانوں کے شہ پارہ کو اُردو میں منتقل کرنا۔

۳۔ عصری علوم اور سائنسی علوم کے تراجم کے سلسلے میں "جامعہ عثمانیہ" حیدرآباد دکن سے شائع شدہ تمام کتب کی ترامیم و اضافہ اور نظر ثانی کے بعد اشاعت کا خصوصی اہتمام کرنا تا کہ کاروان اُردو تیز گام ہو سکے۔ ۵۷

شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کے ابتدائی برسوں میں زیادہ پیش رفت نہیں ہو سکی ۱۹۶۰ء-۱۹۶۱ء میں شعبہ کی تنظیم نو کی گئی جس سے کام کی رفتار تیز ہوئی۔ شعبہ نے اپنے قیام کے بعد پنج سالہ منصوبہ پر کام شروع کیا۔ اس منصوبے کا تذکرہ نصیب اختر نے کچھ یوں کیا ہے۔

"اس ادارے نے اپنے پنج سالہ منصوبے میں تمام مضامین سے متعلق فن اصطلاحات کے اُردو مترادفات پر مشتمل فرہنگ، مختلف مضامین کی نصابی کتب کا اُردو ترجمہ اور غیر ملکی زبانوں کے کلاسیکی ادب کا اُردو زبان میں اور اُردو کلاسیکی ادب کا دوسری زبانوں میں ترجمہ شامل کیا تھا۔ اس وقت چونکہ بہت کم رقم اس ادارہ کے لئے مختص کی گئی تھی اس لئے صرف فنی اصطلاحات کو اُردو زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ اس کے لئے فنی اصطلاحات کی دس کمیٹیاں بنائی گئیں۔ جن میں سے نو نے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اس سال کے دوران تقریباً چار ہزار اُردو اصطلاحات مرتب کی گئیں۔" ۵۸

شعبہ نے با قاعدہ کتابوں کی اشاعت کے لئے کمیٹیاں تشکیل دیں جن کا کام ترجمہ کے لئے کتابوں کا انتخاب کرنا تھا۔ یہ کمیٹیاں با قاعدہ ۱۹۷۳ء تک قائم رہیں۔ تقریباً تیرہ چودہ کمیٹیاں اس مقصد کے لئے کام کرتی تھیں۔ ہر کمیٹی مختلف علوم وفنون مثلاً تاریخ و سیاست و عمرانیات، معاشیات و تجارت، ارضیات، طبیعات، شماریات، حیوانیات، کیمیا و صنائع کیمیا، علم الادویہ، علم کتب خانہ، حیاتی کیمیا، فلسفہ، نفسیات، جغرافیہ، ریاضیات، نباتیات، خوردحیاتیات طب بشمول فعلیات، قانون، فن تدریس وغیرہ پر مشتمل تھی اور ہر کمیٹی میں متعلقہ شعبہ کے ماہرین شامل ہوتے تھے لیکن کمیٹیاں ختم ہو جانے کے بعد شعبہ نے خود کتابیں چھاپنا شروع کر دیں جو مستند ادباء کی تھیں۔ ۵۹

شعبہ تصنیف وتالیف اپنے آغاز سے اب تک مختلف موضوعات پر تقریباً ایک سو پچیس کتابیں شائع کر چکا ہے۔ عصری علوم پر "سلسلہ درسیہ" کے تحت اساتذہ کے خطبات (لیکچرز) مختلف تحقیقی علمی و تدریسی موضوعات پر شائع کئے۔

"سلسلہ درسیہ" کا آغاز شعبہ کا ایک اہم کام ہے۔ ایک درس پارہ (لیکچر) ایک درسی کتاب کا عنوان ہوتا

ہے۔ ہر درس پارہ علیحدہ علیحدہ سائیکلو سٹائیل ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ ۶۴-۱۹۶۳ء کے تعلیمی سال میں بی اے، بی ایس سی کی سطح تک اُردو کو لازمی ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔ طلبہ کی درسی ضرورت کے پیشِ نظر شعبے نے درسی اور حوالہ جاتی کتابوں کے علاوہ درس پارے فراہم کرنے کا آغاز کر دیا تھا لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر یونیورسٹی اپنے فیصلے پر عملدرآمد نہ کر سکی۔ لیکن شعبے کا کام بدستور جاری رہا اور سینکڑوں درس پارے اب تک سائیکلوسٹائل ہو چکے ہیں۔۶۰

اکتوبر ۲۰۰۲ء سے شعبہ اُردو تصنیف و تالیف و ترجمہ میں تنقیدی نشت کا آغاز ہوا۔ اس کا مقصد علمی و ادبی کتابوں کا تنقیدی تجزیہ و تبصرہ کرنا تھا۔ ہر ہفتے چار گھنٹے جاری رہنے والی ان نشستوں میں تقریباً دو سو سے زائد کتب پر تنقیدی تبصرہ ہو چکا ہے۔ نشست میں انگریزی، اُردو اور فارسی زبانوں کی اہم کتابوں پر تبصرے اور تجزیے ہوتے ہیں۔۶۱

اصطلاحات سازی کے سلسلے میں شعبہ کا یہ طریقہ کار رہا کہ دہلی کالج سے آج تک مختلف اداروں نے جو کام کیا ہے اس کو جمع کیا جائے، متعلقہ علوم اور زبان کے ماہرین کی مدد سے ان کو پرکھا جائے، جو اُردو، اصطلاحیں صحیح اور کارآمد ہوں ان کو برقرار رکھا جائے اور علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ جو اصطلاحیں سامنے آ رہی ہیں ان کے اُردو مترادفات وضع ہوتے رہیں۔ یہ کام منظم طور پر یہ انجام دینے کے لئے ہر علم یا فن یا چند متعلقہ علوم کے لئے الگ الگ مجالس اصطلاحات قائم کی گئیں تھیں۔ ہر مجلس ماہرین علم و فن اور ماہر زبان پر مشتمل ہوتی۔ ان مجالس کی منظور شدہ اصطلاحیں شعبے کے مجلّہ "جریدہ" میں شائع ہوتی رہیں۔ بیشتر مجالس نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے اور شعبے کے پاس مختلف علوم و فنون کی ڈیڑھ لاکھ اصطلاحیں جمع ہو چکی ہیں۔ جریدے میں اشاعت کے علاوہ کئی مضامین کی اصطلاحات کی فرہنگیں شائع کی جا چکی ہیں۔۶۲

اصطلاحات کی فرہنگوں میں انگریزی اصطلاحات کے اُردو مترادفات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ شعبے نے باقاعدہ لغات مرتب کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ لغات میں اصطلاحات کے ساتھ ان کی وضاحت و تشریح بھی ہوتی ہے۔۶۳ شعبہ سے جریدہ کی تقریباً سینتیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ نے درسی اور حوالہ جاتی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ ان کتابوں میں طلباء کی

سہولت کے لئے جو اُردو اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس کا انگریزی مترادف پاورقی میں درج کر دیا جاتا ہے اور کتاب کے آخر میں یہ اصطلاحات بالعموم ایک فہرست کی صورت میں یکجا کر دی جاتی ہیں۔ ۶۴ شعبہ نے نصابی کتب کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ نصابی کتب کی اشاعت کے پہلے مرحلے پر شعبہ میں مالی وسائل کی کمی اور درسی ضروریات کی مقدم اہمیت کی وجہ سے ادبیات عالیہ کے سلسلہ میں زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی صرف سیاسیات و عمرانیات پر چند کتابوں کے ترجمے شائع کئے جا سکے جن میں ابن الربیع کی تصنیف "سلوک المالک فی تدبیر الممالک" روسو کی کتاب "سوشل کنٹریکٹ"، میکیاولی کی "پرنس" اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی "علماء میدان سیاست میں" وغیرہ شامل ہیں۔

شعبہ اپنے آئندہ منصوبوں پر تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف ہے اور اُردو زبان کے فروغ کے لئے کمر بستہ ہے۔

اُردو سائنس بورڈ، لاہور:

مرکزی اُردو بورڈ، لاہور قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں وفاقی وزیر تعلیم نے ۲۴ مئی ۱۹۶۲ء کو قائم کیا۔ اس بورڈ کو مرکزی وزارت تعلیمات نے ایک قرارداد کے ذریعے قائم کیا۔ اس کی رو سے بورڈ کا رہنما اصول قومی قدروں کو فروغ دینا اور اُردو زبان کو اس مقام تک پہنچانا جہاں وہ درس و تدریس کی اونچی سطحوں کے لئے بھی ذریعہ تعلیم بن سکے۔ ۶۵

بورڈ کا نظم و نسق ایک مجلس انتظامیہ کے سپرد ہے جسے حکومت پاکستان تین سال کے لئے نامزد کرتی ہے۔ بورڈ کی پہلی مجلس انتظامیہ (۲۴ مئی ۱۹۶۲ء) انیس ارکان پر مشتمل تھی۔ جس میں تین مدیر اور ایک ڈائریکٹر شامل تھا۔ صدر مملکت پاکستان بورڈ کے سرپرست تھے اور ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمان بورڈ کے چیرمین، کرنل مجید ملک بورڈ کے پہلے ڈائریکٹر تھے ۶۶ ڈائریکٹر کو مجلس نظما اور انتظامی کمیٹی کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔ مرکزی اُردو بورڈ تین بڑے مقاصد کے تحت قائم کی گئی:

۱۔ اُردو زبان کو بنیادی توسیع اور ترقی دینا تا کہ لکھنے پڑھنے کے اعتبار سے یہ پاکستان کی قومی زبان بن سکے۔

۲۔ اُردو کی ان کمیوں کو دور کرنا جو بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی کے دائرے میں پائی جاتی ہیں کہ یہ زبان اعلیٰ تعلیم وتدریس کا ذریعہ بن سکے۔

۳۔ اُردو کی ترقی کے لئے کام کرنے والے اداروں سے رابطہ پیدا کر کے ان کے ساتھ تقسیم کار کے اصول پر اشتراک عمل کرنا۔[۶۷]

اُردو کے متعدد ترقیاتی ادارے ایک ہی نصب العین کے تحت کام کر رہے تھے چنانچہ ان کی حدود متعین کرنے کے لئے اور اقدامات کئے گئے تا کہ اُردو کے فروغ کے لئے بہتر طریقے سے کام کیا جا سکے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مرکزی اُردو بورڈ کے نام کی تبدیلی تھی چنانچہ ۱۹۸۲ء میں اس کا نام "اُردو سائنس بورڈ" رکھ دیا گیا۔ اس طرح اس کا دائرہ کار بھی متعین ہو گیا۔ اردو سائنس بورڈ نے متعین مقاصد کے حصول کے لئے عملی اقدامات کے کچھ طریقے اختیار کئے اور ان پر عملدرآمد کیا۔

۱۔ مقامی زبانوں کے ایسے الفاظ، محاورات، ضرب الامثال کی فہرستیں جمع کرنا جو آسانی سے درسیات، ریڈیو نشریات، فلمی مکالمات اور دوسرے ممکن طریقوں سے اُردو میں رائج کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی ترویج پہلے تحقیق و تفتیش کی ضرورت پڑے گی۔

۲۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے حوالے سے اُردو کی دو زبانی لغتوں کی ترتیب و تالیف کرنا۔

۳۔ علاقائی زبانوں اور اُردو کے درمیان مشترک الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کی فہرستیں مرتب اور شائع کرنا۔

۴۔ بچوں اور نو آموزوں کے لئے دو زبانی کتابچوں کے سلسلوں کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کرنا۔ ان کتابچوں میں مقامی زبانوں کا ترجمہ اور اُردو متن بالکل پاس پاس شائع کئے جائیں گے تا کہ ان لوگوں کو اُردو کی استعداد بڑھانے میں مدد ملے جو اس پر عبور نہیں رکھتے، اور ساتھ میں اُردو جاننے والوں کو مقامی زبانیں سمجھنے میں سہولت ہو۔

۵۔ آسان اُردو میں بچوں اور نو آموز لوگوں کے لئے مختلف موضوعات پر مناسب مطالعاتی مواد کی اشاعت میں مدد دینا۔ جس میں بچوں کا انسائیکلوپیڈیا اور معلوماتی کتابیں وغیرہ شامل ہوں گی۔ نو آموزوں کی ضروریات

کی حد تک اُردو ادب میں جو "عظیم خلا" ہے وہ اس کام سے پورا ہو جائے گا۔

۶۔ اُردو ادب کے موجودہ ذخیرہ کا اندازہ کرنا تا کہ انسانی، معاشرتی اور طبعی علوم جیسے میدانوں میں تعلیم کے مختلف درجوں کی ضروریات کا پتہ چل سکے۔

۷۔ اُردو ادب کی کمی کو دور کرنے کے لئے ایک ایسا تدریجی منصوبہ تیار کرنا جس پر اُردو کی ترقی کی خاطر کام کرنے والے دوسرے اداروں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے عمل کیا جا سکے۔

۸۔ اُردو میں ٹائپ کی طباعت کو تمام مقاصد کے لئے مقبول بنانے اور اس ضمن میں اُردو ٹائپ مشینوں اور ٹائپ کے نمونوں کو مستند بنانے میں مدد دینا۔

۹۔ عام قارئین اور اعلیٰ تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اُردو میں سائنس کی مختلف شاخوں پر بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ساتھ حوالے کی کتابیں، لغتیں، کتابیات، انسائیکلو پیڈیا وغیرہ شائع کرنا۔۶۸

بورڈ اب تک ڈھائی سو سے تین سو کتب کی اشاعت کر چکا ہے جن میں بیشتر سائنس اور فنی موضوعات پر ہیں۔ کچھ لغات اور حوالے کی کتب ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی اور تاریخی کتب بھی چھاپی گئی ہیں۔ بورڈ نے فرہنگ اصطلاحات سازی پر وقیع کام کیا۔ اس سلسلے میں بورڈ نے اپنی روداد کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"اس وقت اُردو بورڈ نے ایک بہت بڑا کام اپنے ذمے لے رکھا ہے اور وہ "فرہنگ اصطلاحات" کی تدوین اور اشاعت کا ہے۔ یہ کتاب سائنسی، تکنیکی اور غیر سائنسی علوم کی اصطلاحات اور ان کے اُردو مترادفات کا مخزن ہے۔ اس میں کوئی ڈیڑھ لاکھ کے قریب اصطلاحات جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کی تدوین میں متعلقہ مضامین کے "تجربہ کار پروفیسروں" کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ فرہنگ کی پہلی جلد مکمل ہو چکی ہے اور وزارتِ تعلیم کو استناد اصطلاحات کے سلسلے میں مزید کارروائی کے لئے بھیج دی گئی ہے"۔۶۹

اُردو سائنس بورڈ کی ایک قومی خدمت اُردو ٹائپ رائٹر کے لیے معیاری کلیدی تختے اور اُردو مختصر نویسی کی ترتیب ہے۔

اُردو زبان پاکستان کی بین الصوبائی زبان ہے۔ اس دعویٰ کو بورڈ نے سائنسی معیار پر پرکھا۔ تربیت یافتہ نوجوان ملک کے چاروں صوبوں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ٹیپ ریکارڈر لے کر گھومے اور اُردو زبان

کے ایسے نمونے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے جو دیہات اور قصبات میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی گفتگو میں آنے والے ذخیرہ الفاظ کی تدریجی فرہنگیں تیار کی گئیں۔ ۷۰؎ جن کی مدد سے معمولی پڑھے لکھے لوگوں اور تعلیمِ بالغاں کے لئے نصابی کتب تیار کی گئیں۔

بورڈ کا اپنا ایک کتب خانہ بھی ہے۔ جس میں حوالے کی کتب، اُردو کی نئی اور پرانی لغات اور سائنسی کتب رکھی گئی ہیں جن میں اضافہ کیا جاتا رہتا ہے۔

مجلس ترقی ادب، لاہور:

مجلس ترقی ادب کو محکمہ تعلیم پنجاب نے ۱۹۵۰ء میں قائم کیا۔ ابتداء میں اس کا نام "مجلسِ ترجمہ" تھا۔ اس کا دائرہ کار بھی محدود تھا کہ مشرق و مغرب کی بلند پایہ علمی کتابیں منتخب کر کے ان کے ترجمے کرائے اور انھیں شائع کرے۔ ۱۹۵۸ء میں حکومت مغربی پاکستان نے مجلس ترجمہ کی تشکیل نو کی اور اس کا نام "مجلس ترقی ادب لاہور" تجویز کیا۔ مجلس کے اغراض و مقاصد کا نئے سرے سے تعین ہوا۔ جو حسب ذیل قرار پائے۔ ۷۱؎

۱۔ کلاسیکی ادب شائع کرنے کا مناسب اہتمام

۲۔ بلند پایہ ادب کی اشاعت

۳۔ غیر زبانوں کی معیاری کتب کا ترجمہ کرا کے شائع کرنا

۴۔ ہر سال بہترین ادبی مطبوعات کے مصنفین کو انعام دینا

۵۔ رسائل کے بہترین مطبوعہ مضامین اور منظومات پر انعام دینا

مجلس پہلے تین مقاصد کے حصول کے لئے بڑی سرگرمی سے کام کرتی رہی۔ جبکہ انعامات کا سلسلہ مختصر عرصے کے بعد بند کر دیا گیا۔ مجلس نے اُردو ادب کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ کلاسیکی ادب کی ترتیب و تدوین کے لئے مجلس نے فورٹ ولیم کالج اور انجمن ترقی اُردو کی اصطلاحات سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ مزید اصطلاحات بھی کیں۔ ترتیب اور املا کے اصول اور علامات کا تعین کیا گیا۔ بلند پایہ ادب کی اشاعت اور دوسری زبانوں کے معیاری کتب کے ترجموں کے علاوہ عام فہم علمی کتابوں کے ترجمے بھی شائع کئے گئے۔ ترجمے

میں لفظی ترجمے کے بجائے اس بات کی کوشش کی گئی کہ مفہوم کو رواں زبان میں بیان کیا جائے۔

مجلس نے جو کتابیں شائع کیں وہ سب موضوع کی اہمیت، تحقیق وتصنیف، کے معیار اور ترتیب وحواشی کی خوبیوں کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔مجلس نے اُردو ادب کے علاوہ تقریباً ہر موضوع پر کتابیں شائع کیں۔جن میں سیاست، تعلیم، فلسفہ، سائنس، ادب، تنقید، ڈرامہ، سوانح، تاریخ، معاشیات، سفر نامہ، اخلاقیات، قواعد، نفسیات اور مذہب جیسے موضوعات شامل ہیں۔۲؎

مجلس ترقی ادب کا ایک اہم کارنامہ وہ کتابیں جو متروک ہو چکی ہیں ان کی دوبارہ اشاعت ہے تاکہ اہلِ ذوق کی تسکین ہو سکے۔ان میں سر سید احمد خان کے مقالات جو تقریباً سولہ جلدوں میں ہیں، شائع کیے گئے ہیں اس کے علاوہ مکتوبات سر سید، خطبات سر سید اور سر سید کا سفر نامہ پنجاب شامل ہیں۔مجلس نے حافظ محمود شیرانی کے مقالات آٹھ جلدوں میں اور مولوی محمد شفیع کے مقالات پانچ جلدوں میں شائع کیے۔یہ تاریخی سرمایہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔مجلس نے انیسویں صدی کے دوسرے مصنفین کے شاہکار بھی شائع کیے ہیں۔اساتذہ کے دیوان اور کلیات مرتب کر کے، مفید مقدموں کے ساتھ اہتمام سے شائع کیے۔فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تصانیف روایتی اہتمام سے شائع کی گئیں۔اس اعتبار سے مجلس نے اپنے مقاصد کو کماحقہ پورا کرنے کی سعی کی۔

مجلس ترقی ادب کو اس کے قیام کے بعد ایک لاکھ روپے امداد ملتی تھی جو محکمہ تعلیم مغربی پاکستان کی تشکیلِ نو کے بعد بڑھا دی گئی۔اب اس ادارے کی حیثیت سرکاری ہے اور یہ محکمہ اطلاعات حکومت پنجاب کی تحویل میں ہے۔۳؎

اکادمی ادبیات پاکستان:

وزارت تعلیم حکومت نے ۷ جولائی ۱۹۷۶ء کو اسلام آباد میں اکادمی ادبیات پاکستان کے نام سے ایک خود مختار ادارے کو قائم کیا۔اپریل ۱۹۷۸ء میں اس کے اغراض و مقاصد طے ہوئے۔مجلس نظما کا قیام عمل میں آیا اور مجلس رفقائے اساسی کی تشکیل ہوئی۔اکادمی ادبیات پاکستان کا خاص مقصد ملک میں ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور انھیں فروغ دینا ہے۔۴؎ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔۵؎

ا۔ ادب کے میدان میں موضوعات تحقیق سے متعلق ترجیحات کا تعین کرنا اور اس ضمن میں تحقیقی منصوبوں پر کام کرنا۔

ب۔ ملک کے مختلف علمی، ادبی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے کام کی قدر و قیمت کا تعین کرنا، ان کے نئے منصوبوں کی جانچ پڑتال کرنا اور ان کے لئے مالی اعانت جاری کرنا۔

ج۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان بہتر قومی ہم آہنگی اور فکری مفاہمت کو فروغ دینے کے لئے شعبہ ترجمہ قائم کرنا جو قومی اور علاقائی زبانوں کی منتخب تصانیف کو علاقائی اور قومی زبانوں میں منتقل کرے گا۔

د۔ قومی اور علاقائی زبانوں میں حوالے کی معیاری کتابوں (لغات قاموس وغیرہ) کی تیاری اور نگرانی کرنا۔

ہ۔ قومی اور علاقائی زبانوں پر کام کی آسانی کے لئے لسانیاتی تجربہ گاہ، کتب خانہ اور ایک دستاویزی مرکز قائم کرنا۔

و۔ قومی اور علاقائی زبانوں میں نظریہ پاکستان سے ہم آہنگی، تخلیقی تحریروں کو فروغ دینے کے لئے مناسب اقدامات کرنا۔

ز۔ غیر ملکی قارئین کو پاکستانی ادبیات سے متعارف کرانے کے لئے مناسب اقدامات کرنا۔

ک اُردو میں ایک معیاری، علمی اور ادبی رسالے کا اجراء۔

ل علم و ادب سے متعلق جملہ امور کے لئے مستند با اختیار مجلسِ شوریٰ کا قیام۔

م مختلف علمی اور ادبی انعامات و امتیازات کے لئے موزوں افراد کو نامزد کرنا یا نامزدگی کی تجویز پیش کرنا۔

ن علم و ادب سے متعلق بین الاقوامی اجتماعات میں پاکستان کی نمائندگی کرنا یا اس باب میں حکومت کو مشورے دینا۔

ح علم و ادب سے متعلق ممتاز شخصیتوں کی خدمات کا قومی سطح پر اعتراف کرنا اور ان کے تحقیقی کاموں کو شائع کرنا جو قومی اہمیت کے حامل ہیں۔

ط محدود مالی وسائل رکھنے والے ادیبوں کی مالی اعانت کرنا اور اہلِ قلم کے مفادات کی نگہداشت کرنا۔

ی ملک میں طباعت اور اشاعت کی صفت کو فروغ دینے کے لئے مناسب اقدامات تجویز کرنا۔۶ ے

اکادمی ادبیات پاکستان کے موجودہ صدر نشین ڈاکٹر افتخار عارف ہیں۔اکادمی میں ۱۸ ارکان پر مشتمل ایک مطبوعات کمیٹی اور ۱۷ ارکان پر مشتمل ایک اعانتی کمیٹی قائم ہے۔ڈاکٹر افتخار عارف دونوں کمیٹیوں کے چیر مین ہیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی اصل شہرت اہلِ قلم کانفرنسوں کی وجہ سے ہوئی گو کہ اس کے مقاصد میں اس کا واضح تذکرہ موجود نہیں ہے لیکن اکادمی نے متعدد اہلِ قلم کانفرنس منعقد کیں جو مجموعی اعتبار سے بہت مفید ثابت ہوئیں۔اکادمی نے اپنے متعین کردہ مقاصد کے تحت متعدد اہم کتابوں کا ترجمہ کیا جس میں مرزا قلیچ بیگ کے سندھی ناول کا اردو ترجمہ، خوشحال خان کے دستار نامہ کا اُردو ترجمہ اور پنجابی شاعری کا انتخاب منظوم اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع کئے گئے۔اس ادارے نے پاکستانی ادیبوں کے درمیان مفاہمت کے لئے پاکستانی اہلِ قلم کی ایک ڈائریکٹری شائع کی۔لیکن اس میں بہت سے اہلِ قلم کے نام شامل نہیں ہو سکے۔اسی لئے اکادمی نے پاکستانی اہلِ قلم کا تعارف نامہ Who is who شائع کیا۔

اکادمی نے اپنے مقاصد کے تحت ایک خبر نامہ "اکادمی" ماہنامہ جاری کیا۔آٹھ صفحات پر مشتمل یہ پرچہ اپنے مواد اور طباعت کے نقطہ نظر سے منفرد معیار کا حامل ہے۔اکادمی ادبیات پاکستان اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں ہے اور اُردو ادب کی ترقی و فروغ میں اس کی کارگزاریاں نہایت اہم اور مفید ہیں۔

اقبال اکادمی پاکستان:

اقبال اکادمی ۱۹۵۱ء میں کراچی میں قائم کی گئی پھر یہ لاہور میں میکلوڈ روڈ کے اس مکان میں جہاں علامہ اقبال مقیم رہے، منتقل ہوگئی۔اپنے قیام کے وقت یہ ایک نیم سرکاری ادارہ تھا۔اب یہ سرکاری ادارہ ہے۔
اقبال اکادمی کے جو اغراض و مقاصد متعین کئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔۷ ے
ا۔ علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے پیغامات ملک کے گوشے گوشے میں پھیلائے جائیں۔

۲۔ تحقیقی کام کے لئے وظیفے دیکر ریسرچ سکالر مقرر کئے جائیں۔

۳۔ علامہ اقبال کے متعلق گرانقدر تحقیقی کارناموں پر اہلِ قلم اور مصنفوں کو انعامات اور عطیات دیئے جائیں۔

۴۔ اقبال کی شاعری اور افکار کے مختلف پہلوؤں کو کتابوں، رسالوں اور پمفلٹ کے ذریعے عام کیا جائے۔

۵۔ اکادمی کی جانب سے علامہ اقبال پر معیاری کتابوں کے مصنفین کو معقول معاوضے دیئے جائیں اور ان کی کتابیں شائع کرائی جائیں۔

۶۔ لیکچروں، مباحثوں، گفتگوؤں اور دارالمطالعہ کے علاوہ کانفرنسوں کے ذریعے ان مقاصد کو پورا کیا جائے۔

۷۔ اندرون و بیرونِ ملک علمی و ثقافتی کانفرنسوں میں اکادمی کے نمائندے شریک ہو کر علامہ کے پیغامات کو فروغ دینے اور عام کرنے کی کوشش کریں۔

۸۔ اقبالیات پر کام کرنے والے اقبال کے پیغام کی توسیع کرنے والے ادیبوں کو اعزازی ممبر شپ کا مستحق قرار دیا جائے۔

۹۔ ایسے ادارے کے ساتھ تعاون کیا جائے جو علامہ کے کام کو عام کرنے میں قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہوں۔

اقبال اکادمی کی مطبوعات زیادہ تر اُردو میں ہیں۔ اُردو کے علاوہ، انگریزی، فارسی، عربی، پشتو، بنگالی، سندھی، ترکی، گجراتی، کشمیری، پنجابی، اور بلوچی زبانوں میں لکھی اور شائع کی گئیں ہیں۔ اکادمی کی تصنیفات علمی اور تحقیقی اعتبار سے نمایاں اہمیت کی حامل ہیں اور ان کے مصنفین معروف اور ممتاز صاحبان علم ہیں۔

اکادمی سے سہ ماہی جریدہ "اقبال ریویو" باقاعدگی سے شائع کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لئے وقف ہے اور اس میں علوم و فنون کے ان تمام شعبوں کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے۔ جس سے اقبال کو دلچسپی تھی مثلاً اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہب، زبان، ادب اور فنون لطیفہ وغیرہ۔۸ے

اقبال اکادمی میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا ہے، اس کتب خانے میں دس ہزار سے زائد چیدہ اور معیاری کتب موجود ہیں جو خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ کتب خانے میں اقبال کے فن اور فلسفے پر مطبوعہ کتابوں کا

قومی زبان کو ترجیح دی ہے۔ یونیورسٹی چار سطحوں پر بنیادی کام سرانجام دے رہی ہے۔

۱۔ اردو مختصر نویسی اور ٹائپ کاری کے تربیتی مراکز ملک کے ہر اہم شہر میں موجود ہیں جنھیں یونیورسٹی چلا رہی ہے۔ اردو ٹائپ اور مختصر نویسی کے چار کورسز کا انعقاد کیا گیا ہے۔ جس میں اردو شارٹ ہینڈ کے ابتدائی اور اعلیٰ درجے اور اردو ٹائپ کے ابتدائی اور اعلیٰ درجے شامل ہیں۔

۲۔ دفاتر میں اردو کے نفاذ کے لیے یونیورسٹی نے دفتروں کے موجودہ ملازمین اور امیدواروں کے لیے کورس کا آغاز کیا ہے۔ اعلیٰ ثانوی درجے کے طلبہ بھی نصف حاصل کے اس کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ کورس کے نو درسی یونٹ ہیں جن میں دفتر اور اس کی اقسام، دفتری نظام، دفتری اسلوب، دفتری مراسلت، متفرق مراسلت، مسل اور مسل داری، خلاصہ نگاری اور دفتری معاملات میں اس کا استعمال رو داد نویسی شامل ہیں۔

۳۔ وفاقی حکومت کے بنیادی سکیل ۱۷ اور اعلیٰ افسران کے لیے دفتری اردو کی تربیت کا منصوبہ کابینہ ڈویژن، اسٹبلشمنٹ ڈویژن اور یونیورسٹی کے باہمی تعاون سے چل رہا ہے۔ اس کا دورانیہ تین ماہ کا ہوتا ہے۔ تربیت کے لیے ہر وزارت اپنے افسروں کو نامزد کرتی ہے اور یونیورسٹی ان کو دفتری اردو میں اپنے مخصوص فاصلاتی نظام کے تحت تربیت دیتی ہے۔

۴۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور مقتدرہ قومی زبان کے باہمی اشتراک و تعاون سے ادارہ ثقافت پاکستان کے ملازمین کے لیے دفتری اردو کی ورکشاپ منعقد کی۔ دوسرے اداروں کے لیے بھی اس طرح کی ورکشاپوں کے سلسلے میں یونیورسٹی مقتدرہ سے تعاون کر رہی ہے۔ اس طرح مختلف مقامات پر اردو ٹائپ کاری اور زود نویسی کے تربیتی کورسوں کے سلسلے میں یونیورسٹی مقتدرہ سے پورا تعاون کر رہی ہے۔۸۱؎

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی فاصلاتی نظام تدریس کے ذریعے ملک بھر میں مختلف علوم و فنون کی اشاعت میں مصروف ہے۔ اہل پاکستان جو باقاعدہ تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے سے معذور ہیں وہ یونیورسٹی کی خدمات سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یونیورسٹی نے اپنے طلباء کے لئے جو نصاب مرتب کیا ہے وہ منفرد حیثیت کا حامل ہے۔۸۲؎

علاوہ فرانسیسی اور جرمن زبان میں بھی شائع کیا گیا۔لائیڈن انسائیکلو پیڈیا مغربی علم وفضل کی پیداوار ہے اور ان لوگوں کے لیے لکھا گیا جو مغرب کی علمی روایات کے تنقیدی اصولوں کو قبول کر چکے ہیں۔۸۷؎ اس لیے اس میں مغربی نظریات کی جھلک ایک قدرتی امر تھا۔اس بناء پر یہ لائحہ عمل طے پایا کہ ترجمہ کرتے وقت جہاں جہاں کوئی بیان تاریخی واقعات اور اسلامی احساسات کے خلاف نظر آئے اس کو علمی اور تحقیقی اساس پر تبدیل کر دیا جائے۔۸۸؎ یہی خیال اسلامی تصورات کے مضامین کے بارے میں تھا۔اس کے علاوہ یہ بھی طے کیا گیا کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں ان مقالات کا اضافہ کیا جائے جو انگریزی انسائیکلو پیڈیا میں موجود نہیں ہیں۔اور اس کو دائرہ معارف اسلامیہ کے تکملہ جات کی صورت میں پیش کیا جائے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (لائیڈن) چار جلدوں اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے جبکہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی ۲۶ جلدیں مکمل ہو چکی ہیں اور اب مزید مقالات کی کمی محسوس کرتے ہوئے اس کا تکملہ دو جلدوں میں شائع کیا جا چکا ہے۔۸۹؎ شعبے نے ایک جلد میں سیرت خیر الانام کی تدوین بھی کی ہے۔۹۰؎ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اشاریہ کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور اس کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے جو لائیڈن کے انسائیکلو پیڈیا میں بہر حال ایک بہت بڑی کمی ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کو ان امتیازی خصائص کی بنا پر فوقیت حاصل ہے۔

۱۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 'اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ۳۷۷۹ عنوانات اور مقالات پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر مقالہ بذات خود کئی مقالات پر حاوی ہے۔تکملہ کے عنوانات اور موضوعات اس کے علاوہ ہیں۔

۲۔ انگریزی، عربی اور ترکی ایڈیشنوں کے مقابلے میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں قابل قدر اضافہ اور معتد بہ اور مفید علمی و تاریخی ترجیحات بڑی نمایاں ہیں۔

۳۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں بہت سے ایسے جدید مقالات شامل کیے گئے ہیں جو لائیڈن انسائیکلو پیڈیا میں موجود نہیں ہیں۔یہ جدید مقالات مشرق و مغرب کے اہل علم سے خاص طور پر لکھوائے گئے ہیں۔

۴۔ اسلام کی اہم شخصیات، مسلمانوں کے عقائد اور تصورات سے متعلق مقالات یا تو نئے لکھوائے گئے ہیں یا

ترجمہ شدہ مقالات کو بڑی حد تک بدل دیا گیا ہے، خاص طور پر آنحضرتؐ اور دیگر اکابرین امت پر مشہور محققین اور نامور فضلا اور ارکان ادارہ کے تعاون سے نئے مقالات تیار کیے گئے ہیں۔

۵۔ انگریزی متن کی وہ تمام عبارتیں جو ہمارے مخصوص ذوق اور تاریخی روایات سے متصادم تھیں، بدل دی گئی ہیں۔

۶۔ برصغیر، پاک و ہند کی نامور شخصیات، نیز ان ممالک سے متعلق تاریخی، جغرافیائی، لسانی اور ادبی موضوعات کا معتد بہ اضافہ کیا گیا ہے۔ خالص پاکستانی موضوعات بھی، جو انگریزی متن میں موجود نہیں ہیں، کافی تعداد میں شامل کیے گئے ہیں۔

۷۔ اسلامی زبانوں اور پاکستانی زبانوں کے ادب پر بڑے معلوماتی مقالات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۸۔ ترکی موضوعات کے بارے میں ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے بہت سے اہم مقالات براہ راست ترجمہ کر کے شامل کیے گئے ہیں۔ اس طرح عربی متن سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۹۔ معاصر اسلامی ممالک سے متعلق مقامات پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے، کیونکہ پاکستان کے زاویہ نگاہ سے بین الملی اتحاد کے لیے یہ ضروری امر ہے۔

۱۰۔ اسلام، قرآن، حدیث، اور فقہ پر سیر حاصل مقالات کے علاوہ قرآن مجید کی ہر سورت پر ایک مستقل مقالہ شامل کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کی ذات گرامی پر ایک خصوصی مجموعہ (سیرت خیر الانامؐ) مرتب کیا گیا ہے۔ اسی طرح نامور صحابہ کرام اور ائمہ عظام پر الگ الگ مقالات تحریر کیے گئے ہیں۔

۱۱۔ اسلامی حدود اور تعزیرات پر بھی بڑے وقیع اور مستند مقالات شامل کتاب ہیں۔

۱۲۔ مقالہ فن کے تحت مسلمانوں کے جملہ فنون پر معلومات یکجا فراہم کر دی گئی ہیں۔

۱۳۔ مقالہ علم اور مقالہ قرآن کے تحت مسلمانوں کے اکثر و بیشتر علوم پر الگ الگ مقالات جمع کر دیے گئے ہیں۔[91]

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی ہیئت حاکمہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود (صدر مجلس)، پرو وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، لاہور [بلحاظ عہدہ]، پروفیسر شیخ امتیاز شیخ، جسٹس (ر) سردار محمد اقبال، محمد حسین داؤد، معتمد

مالیات، معتمد تعلیم، ڈاکٹر محمد اکرم چودھری، ڈاکٹر محمد نعیم، ڈین کلیہ سائنس (پنجاب یونیورسٹی لاہور)، کرنل محمد مسعود الحق، محمد جمیل بھٹی اور ڈاکٹر محمود الحسن عارف (سیکریٹری) پر مشتمل ہے۔ ادارے کی تنظیم سنڈیکیٹ پنجاب یونیورسٹی پر مشتمل ہے۔[۹۲]

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ اس کی تکمیل وطباعت میں ملک کی نہایت مقتدر شخصیات اور نامور اہل علم وفضل نے حصہ لیا۔ جن میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد وحید مرزا، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید امجد الطاف، ڈاکٹر محمود الحسن عارف شامل ہیں۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ مقتدر شخصیات اور نامور اہل علم وفضل کی وجہ سے کامیابی سے اپنے مقصد سے عہدہ برآ ہوسکا۔ اس کی اب تک ۲۶ جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ ادارے کے آئندہ منصوبوں میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ کا مختصر تعارف اور دیگر کوائف ومتفرقات، مخففات اور اعراب، اشخاص کے باعتبار حروف تہجی، مطالب عامہ اور جغرافیائی اعلام، کتابوں کے نام جو متن میں اساسی طور پر آئے ہیں، بنیادی مآخذ ومصادر، مقالہ نگاروں، ترجمہ کرنے والوں، نظر ثانی کرنے والوں اور دیگر معاونین کے نام (باعتبار حروف تہجی) شامل ہیں۔ تکملہ جلد سوم پر ادارہ کام شروع کر چکا ہے۔[۹۳] اس کے علاوہ قرآن دائرہ معارف کی تدوین پر بھی ابتدائی کام شروع ہو چکا ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب رہا اور اس میں ممتاز اہل علم کی تبحر علمی اور وسعت نظر دونوں موجود ہیں۔

وفاقی اردو کالج (آرٹس اور سائنس):

قیام پاکستان کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ۱۹۴۹ء میں جامعہ عثمانیہ کی طرز پر اردو کالج کی بنیاد رکھی جس کو وہ یونیورسٹی کے درجے تک لے جانا چاہتے تھے۔ یہ کالج اپنے پس منظر میں دہلی کالج اور جامعہ عثمانیہ کی روایت کی امین اور اس کی توسیع ہے۔[۹۴] بابائے اردو کے نزدیک اس درس گاہ کے قیام کا مقصد دو قومی نظریہ کے فروغ اور استحکام کے علاوہ قومی زبان میں سائنسی وعمرانی علوم کی اعلیٰ تدریس وتحقیق بھی تھا تاکہ تمام علاقوں کے باشندوں میں اعلیٰ تعلیم کے ذریعے قومی یک جہتی کا شعور بیدار ہو اور یہ درس گاہ آئندہ قائم ہونے والی درس گاہوں

کے لیے نمونہ بنے۔95

انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے اردو کالج کا قیام ایک تاریخ ساز واقعہ تھا کیونکہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا کالج تھا۔ جس میں ذریعہ تعلیم اردو تھی۔ اس کالج کے قیام پر اکابرین ملت نے بڑے جوش اور گرم جوشی کا اظہار کیا تھا جس میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح چودھری خلیق الزماں اور علامہ شبیر احمد عثمانی شامل تھے۔

اردو کالج کے پہلے صدر بابائے اردو مولوی عبدالحق اور پہلے معتمد اعزازی سید تقی الدین تھے۔ اس کا الحاق پہلے سندھ یونیورسٹی کے ساتھ ہوا اور اس کے بعد جامعہ کراچی سے الحاق رہا۔ ۱۳ نومبر ۲۰۰۲ء کو اسے یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس سلسلے میں سابق وزیر تعلیم اور سائنس و ٹیکنالوجی اور چیئرمین تعلیمی کمیشن ڈاکٹر عطاء الرحمٰن اور انجمن نے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی اور ان کے رفقاء کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔96 ابتدا میں یہ کالج انجمن ترقی اردو کی عمارت میں قائم ہوا۔ چنانچہ طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اور کالج کی قومی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے صدر ایوب خان کے عہد میں ادارہ ترقیات کراچی سے شاہراہ جامعہ پر ۱۱۲۰ ایکٹر اراضی کالج کو دی گئی جہاں اب کالج کا شعبہ سائنس کی عمارت موجود ہے جبکہ فنون، تجارت اور قانون پر مشتمل گورنمنٹ اردو کالج بنا دیا گیا جو بدستور بابائے اردو روڈ پر واقع ہے۔ جنھیں اب اردو یونیورسٹی کے دو شعبہ جات آرٹس اور سائنس کی حیثیت حاصل ہے۔ وفاقی اردو یونیورسٹی کے شعبہ فنون، شعبہ تجارت، شعبہ سائنس اور شعبہ قانون قائم ہیں۔ یونیورسٹی کو کالج میں سب سے پہلے ایل ایل ایم کا آغاز کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔ اس کا نصاب لندن یونیورسٹی کے ایل ایل ایم کے نصاب سے زیادہ بہتر اور جامع ہے۔97

اسی طرح تجارت کے مضمون کی اردو میں تدریس کالج نے سب سے پہلے شروع کی۔ کالج کو سائنس کی اردو میں تدریس کا امتیاز بھی حاصل ہے اور تقریباً تمام سائنسی مضامین کی تدریس یہاں پر اردو میں ہوتی ہے۔ اردو کالج کی اہمیت کے مدِنظر وفاقی حکومت نے ۱۹۷۵ء میں اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس کے دو حصے سائنس اور آرٹس جدا جدا نیم خودمختار اداروں کی شکل میں دو خودمختار بورڈ آف گورنرز کے تحت کام کرنے لگے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔98

اردو کالج کے سوا کراچی کے سارے کالجوں میں تعلیمی زبان انگریزی ہے لیکن چھپن کالجوں میں تعلیم پانے

والے ۹۸ فیصد طلبہ اپنے امتحانی پرچوں کے جواب اردو میں تحریر کرتے ہیں۔ سائنس اور تجارت کے شعبوں میں بھی ایسے طلباء کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ یہ رجحان اردو کالج اور اس کے مقاصد کی کامیابی کا ثبوت ہے۔[۹۹]

اردو کالج کا شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ شعبے نے طلباء کی ضرورت کے پیش نظر متعدد علمی مجلّے جاری کیے۔ جس میں برگ گل نے برصغیر میں ایک نیا معیار قائم کیا اور اسے تمام کالجوں کے لیے مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔[۱۰۰] اس مجلّے نے اپنے خاص نمبروں (سرسید نمبر، بابائے اردو نمبر، تعلیمی نمبر، مجاہد نمبر اور ایوب خان نمبر) کی اشاعت کی وجہ سے ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں معیاری نام و مقام حاصل کیا۔ اس میں سرسید نمبر اس معیار کا حامل قرار دیا گیا کہ یونیورسٹی کے ایم اے (اردو) کے طلبہ کے نصاب میں اس کے مطالعہ کی سفارش کی گئی جبکہ تعلیمی پالیسی نمبر، قائداعظم نمبر اور اقبال نمبر جامعہ کراچی کے ایم اے اور ایم ایڈ کے نصاب میں شامل ہیں۔[۱۰۱]

وفاقی اردو کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیئے جانے کے بعد موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر قیصر ہیں۔ اس طرح بابائے اردو کا خواب ایک صدی بعد شرمندہ تعبیر ہوا۔ اب اردو داں طبقے میں یہ احساس تقویت پا رہا ہے کہ آئندہ چند برسوں میں اردو کی قومی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر اس کو قومی زبان کا درجہ دے کر عملی طور پر اس کا نفاذ کر دیا جائے گا۔

ماحصل

ماحصل

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا۔ اس کی بنیاد اسلامی نظریہ ملت پر قائم کی گئی جو مغربی طرز کی جغرافیائی، نسلی اور لسانی وحدت کے جواب میں مسلمانان برصغیر کی قومی بقا کی سب سے بڑی ضمانت تھا۔ یہ نظریہ ملت سیاسی اصطلاح میں اسلام کا وہ نظریہ قومیت ہے، جس میں عقیدۂ آخرت کی یگانگت اور ذہن و فکر کی ہم آہنگی کو ان تمام دیگر عناصر پر فوقیت حاصل ہے جن پر مغربی قومیت کی بنیادیں استوار ہیں۔ اس لیے جب برصغیر، پاک و ہند میں مسلمانان ہند کے ملی نقطۂ نظر کا ٹکراؤ متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور سے ہوا تو مسلم قومی تشخص کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا اور دو قومی نظریہ نے جنم لیا کیونکہ تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور معاشی عوامل سے یہ ثابت تھا کہ ہندو اور مسلمان ہر اعتبار سے دو جداگانہ قومیں ہیں اور محض جغرافیائی وحدت کی بنیاد پر ان کی علیحدہ شناخت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں گہرے اختلاف کی بنیادی وجہ اسلام اور ہندومت کا ایک دوسرے سے قطعی جداگانہ معاشرتی اور تہذیبی نظام ہے۔[۱]

ہندوستان کی تاریخ میں مسلم علماء کا کردار تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مغلیہ دور حکومت میں بھی اسلام کو بھگتی تحریک کے اثر و نفوذ سے بچانے کے لئے اور اسلام کے مکمل فکری نظام اور ترقی یافتہ تہذیبی روایات کے لئے مختلف تحریکات سامنے آئیں تھیں۔ جس میں اکبر کے دور حکومت میں شعائر اسلامی سے متصادم احکامات کے نفاذ کے خلاف سب سے پہلی اور موثر آواز حضرت مجدد الف ثانی کی تھی۔ مجدد الف ثانی نے شریعت اسلامیہ کے نفاذ پر زور دیا اور اکبر کی کوششوں کو باطل قرار دیا۔ جن کا مقصد ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بنانا تھا۔ اکبر نے پہلی بار مرکز مذہب کے بجائے ریاست اور دیگر علاقائی و لسانی عوامل کو قرار دیا۔[۲] اکبر سیکولر ریاست کے جوش میں یہ فراموش کر گیا کہ قومیت کی تعمیر ایک طویل اور تدریجی مرحلہ ہے، اس کے ماسوا اسلام ہر ملک اور ہر دور میں مسلمانوں کی قومیت کا اساس رہا ہے۔[۳] چنانچہ یہ پہلا مرحلہ تھا کہ مجدد الف ثانی نے متحدہ ہندوستانی قومیت کی تعمیر کی اس بے جا کاوش کے خلاف آواز بلند کی اور جداگانہ مسلم طرز فکر کی بھرپور نمائندگی کی اور اسلام کو مسلمانوں کے قومی تشخص کی اساس کے طور پر دیگر قوموں کے مقابلہ پر پیش کیا۔ درحقیقت ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ معاشی و

اقتصادی اشتراک سطحی تھا اصل بنیادی اختلافات شدید نوعیت کے تھے۔ چنانچہ ان بنیادی اختلافات کو ایک وحدت میں جذب کرنے کے لئے بھگتی تحریک کا نظریہ پیش کیا گیا۔ اس تحریک کے ذریعے مسلمانوں کی ملی انفرادیت اور تہذیبی علامات کو ہندو سماج میں جذب کرنے کی سازش کی گئی۔ صوفیائے کرام، مشائخ اور علماء وقت کی طرف سے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے ایسی تحریکیں جنم لیتی رہیں جو ایک غیر مسلم سماج میں علیحدہ مسلم تشخص کا تحفظ کرسکتی تھیں۔ اورنگ عالمگیر کے بعد جب مسلم معاشرہ تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہوا اور مختلف تخریبی طاقتیں مسلمانوں کے استحصال کے لئے سرگرم ہوگئیں۔ تو اس عہد میں شاہ ولی اللہی تحریک سامنے آئی۔ اس تحریک کا محرک احساس یہی تھا کہ ہندو سماج میں مسلم معاشرت کی انفرادیت برقرار رہنی چاہیے۔ ولی اللہی تحریک سے ایک نہ ختم ہونے والا اصلاحی تحریکات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں سید احمد شہید کی تحریک جہاد ہے۔ اس تحریک کا سب سے بڑا عنصر مذہب کی بقا تھا۔ جس سے مسلمانانِ ہند کی جداگانہ قومیت کا اظہار سب سے پہلے ہوا، مسلم قومیت کا شعوری احساس بیدار ہوا اور انھیں بحیثیت مسلمان اپنے تشخص کی بقاء کے مسئلے سے آگاہ کیا۔ اس تحریک کو پروان چڑھانے میں اردو زبان نے ذرائع ابلاغ کا بنیادی کردار ادا کیا۔ اردو زبان میں اصلاحی کتب لکھی گئیں۔ قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ اردو زبان کو دامن اسلام کے بنیادی عقائد اور اصل روح پر مبنی لٹریچر سے مالا مال کیا گیا۔

مذہبی تحریکات تحریک آزادی کا نقطہ آغاز تھیں۔ اسکے بعد اردو لٹریچر سے سیاسی اور قومی احساس اجاگر کرنے کا کام لیا گیا۔ اس عہد میں جو کتابیں قومی اور سیاسی مسائل پر لکھی گئیں۔ ان میں سے اکثر کتابوں میں مسلمانوں کے ملی اور قومی مسائل کے حل کے لئے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کے حصول کو ناگزیر قرار دیا گیا اور اس تحریک کو جسے بعد میں تحریک پاکستان کہا گیا، کی بھرپور تائید کی گئی۔ ان کتابوں میں مفصل بحث ملک کی تقسیم میں مختلف امور کی اہمیت کے حوالے سے بھی تھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندو مسلم تعلقات کے نئے دور کا آغاز ہوا، جس کی نوعیت معاندانہ تھی۔ ہندو، انگریزی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے سبب اور جمہوری نظام فکر کے مطابق اکثریت میں ہونے کی وجہ سے خود کو ہندوستان کا اصل حکمران تصور کرنے لگے تھے اور مسلمانوں کو اقلیت کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس ذہنی تفاخر

کا سب سے پہلا حریفانہ اظہار اردو زبان پر ہوا، جسے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر معتوب کیا گیا اور اس کے رسم الخط کو قرآنی رسم الخط کہہ کر تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاریخ کے اوراق کو اگر پلٹا جائے تو اردو زبان کو مسلم عہد کی یادگار تو کہا جا سکتا ہے مگر اس کی ترقی و ترویج میں باہمی اتحاد اور یکجہتی کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوؤں نے اسلامی دور اقتدار میں زبان ہی کی بدولت مملکت کے کاروبار میں اپنا اثر ورسوخ بڑھایا۔ بھگتی تحریک، ہندو قدیم شعراء اور صوفیاء کے کلام میں اس کی ابتدائی جھلک موجود ہے۔ جسے زمانہ نے مختلف نام دیے۔ ہندی، ہندوی، ریختہ، دکنی، ہندوستانی، اردو وغیرہ۔ زبان کے یہ تمام سوتے ایک ہی چشمے سے نکلے تھے وہ آریائی زبان تھی۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں جب انگریز اپنی استعماری ذہنیت کی بدولت ہندوستان کے اہم صوبوں پر قابض ہو گئے اور اسی ذہنیت کے تحت نصف صدی تک سیاسی اور فوجی سطح پر حکومت کی بنیادیں مستحکم کی جاتی رہیں۔ اس سے مغرب میں اقتصادی ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں لیکن اس کے منفی اثرات ہندوستان پر گہرے نقوش ثبت کر گئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا معاشی و اقتصادی استحصال کے ساتھ ساتھ ان کی زبان جو ان کا تہذیبی، ثقافتی اور عملی ورثہ تھی۔ اس میں اختلاف کی بنیاد ڈال دی گئی اور فورٹ ولیم کالج (۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء) نے اس میں اساسی کردار ادا کیا۔ اس کالج کی جڑیں مدراس کے فورٹ سینٹ جارج کالج میں پیوست تھیں جسے مدراس کے گورنر مسٹر جوزف کلکٹ (Joseph Collect) نے ۱۷۷۱ء میں اس مقصد کے تحت قائم کیا کہ کمپنی کے ملازمین جو انگلینڈ سے ہندوستان آتے ہیں، انہیں ہندوستان کی زبان اور تہذیب و تمدن سے واقف کرایا جائے۔[۲۹] انیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ ہندوستان میں سیاسی تبدیلیاں تیزی کے ساتھ رونما ہو رہی تھیں۔ کالج کا نام تبدیل کر کے فورٹ ولیم کالج کر دیا گیا اور کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔ اس کالج کا افتتاح ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو ہوا جو اپنے اندر ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کے تنزل کی پوری ایک داستان سموئے ہوئے ہے۔ ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو ٹیپو سلطان پر انگریزوں کی فتح کو پورا ایک سال ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے سیاسی استحکام نے ان کے مقاصد میں بھی تبدیلی کی اور اس کالج کے ذریعے اردو زبان اور خود ساختہ ہندی زبان کو فروغ دیا گیا۔ ویلزلی (Wellesley) نے ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کے نوٹس (اور ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کی عرضداشت) میں کالج کے آئین و قوانین کے تحت درج کیا تھا کہ:

"چونکہ مشیت ایزدی نے پسند فرمایا ہے کہ ہندوستان میں برطانیہ عظمیٰ کے مشیروں اور فوجوں کو مسلسل خوشحالی اور شان وشوکت عطا فرمائے اور چونکہ متعدد جنگوں میں مسلسل فتوحات اور باانصاف عقلمندانہ ومعتدل پالیسی کے تحت ہندوستان اور دکن کے وسیع علاقے برطانیہ عظمیٰ کے قلمرو میں شامل ہوگئے ہیں اور عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت وقت کے ساتھ ساتھ ایک طاقتور سلطنت کی بنیاد پڑ چکی ہے اس لیے متعدد آباد اور زرخیز صوبوں اور مختلف قوموں کو دیکھتے ہوئے جو اپنے مذہبی رسوم، زبان، طور طریقوں اور عادات واطوار میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور علی الترتیب عجیب وغریب رسوم، فلسفے اور قواعد کے ذریعے حکومت کیے جانے کی عادی رہی ہیں۔ اور (چونکہ) برطانوی قوم کی مقدس ڈیوٹی، سچا مفاد، عزت اور پالیسی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی عمدہ حکومت قائم کرنے کے لیے موثر انتظام کیا جائے۔"۵

انگریزوں نے اس کالج کے ذریعے ملکی نظم ونسق پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی غرض سے دو زبانوں اردو اور دیوناگری ہندی کی ترقی کے لیے کام کیا۔ ان زبانوں میں ادب تخلیق ومرتب کیا گیا۔ گو کہ یہ اقدامات بظاہر زبان کے فروغ کے لیے تھے مگر اس کے مضمرات انیسویں صدی کے اواخر میں رونما ہونا شروع ہوگئے تھے۔ انگریزوں نے اپنی مخصوص حکمت عملی کے تحت فارسی زبان کی ۱۸۳۵ء میں سرکاری حیثیت ختم کردی۔ گو کہ یہ اقدام بظاہر معمولی سا تھا، اس تبدیلی کا کوئی ردعمل ہندوستانیوں کی طرف سے بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے سامنے نہیں آیا۔ لیکن اس کے نتائج دوررس تھے۔ فارسی زبان کی مرکزیت کو جو نقصان پہنچایا گیا اس سے مسلمانوں کا تہذیبی و ثقافتی، لسانی اور علمی وادبی رشتہ ان کی تاریخ سے منقطع کردیا گیا۔ فارسی زبان جوامت مسلمہ میں ایک ثقافتی، تہذیبی وتاریخی، علمی وادبی تعلق جوڑے ہوئی تھی، ان جڑوں کو اکھاڑ پھینکا گیا۔

۱۸۳۵ء میں اردو زبان کو سرکاری اور علمی زبان کا درجہ مختصر عرصے کے لیے دیا گیا اور جب ایک طبقہ اس زبان پر تفوق قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا تو یکدم انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ پوری ایک نسل اس فیصلے کا شکار ہوگئی۔ انگریزی زبان کو ہندوستان میں سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ دینے والا لارڈ میکالے تھا۔ اس بات کو تقریباً پونے دوسو برس گزر چکے ہیں اور اس کے اثرات آج بھی ہمیں پسماندہ بنائے ہوئے ہیں۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ اردو زبان کے استعمال سے وہ ہندوستان میں اپنی استعماری طاقت کو اپنی خواہش کے مطابق استعمال نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ایک کمیٹی لارڈ میکالے کی سربراہی میں تشکیل دی گئی۔ کیونکہ لارڈ میکالے نہ صرف تعلیمی کمیٹی کا صدر تھا، بلکہ گورنر جنرل کی کونسل کا رکن بھی تھا۔ اس نے اپنی مشہور یادداشت مورخہ ۲ فروری ۱۸۳۵ء کونسل کے آگے رکھی، جس کی رو سے ایک قطعی تعلیمی پالیسی متعین ہوگئی اور یہ تجویز پیش کی کہ:

"جب تک ہم انگریزی کو ذریعہ تعلیم اور دفتری زبان کے طور پر استعمال نہیں کریں گے۔ اس وقت تک ہم اپنے مطلوبہ استعماری مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔"[۶]

انگریزوں کی طویل المیعاد مفاداتی اور سیاسی پالیسی کو لارڈ میکالے کے الفاظ نے سنگ میل کی حیثیت دی۔

"ہمیں ایسے کارندے اور آدمیوں کی ضرورت ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں لیکن جو اپنے طور طریقوں، اپنی سوچ، اپنے اخلاق اور نقطہ نظر اور آراء کے اعتبار سے انگریز ہوں، اسی وقت انگریزی حکومت صحیح معنوں میں کامیابی کا منہ دیکھ سکتی ہے۔"[۷]

انگریزوں کی فورٹ ولیم کالج کے ذریعے اردو اور ہندی زبان کے فروغ کے نتیجے میں انیسویں عیسوی صدی کے ربع آخر میں اردو ہندی تنازع ابھر کر سامنے آیا۔ اردو کے خلاف انجمنیں قائم کی گئیں، قراردادیں پاس ہوئیں اور دیوناگری رسم الخط کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔[۸] اس کا واضح اظہار ۱۸۶۷ء میں بنارس کے سربرآوردہ

ہندوؤں کی جانب سے کیا گیا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں رواج دیا جائے۔ اس پر سرسید احمد خان جو ہندو مسلم اتحاد کے داعی اور ہندوستانیوں کی اجتماعی ترقی کے لیے ہر لمحہ کوشاں رہتے تھے، ان ہندوؤں سے متنفر ہو گئے اور اپنی دور اندیش نگاہوں سے اس حقیقت کو پالیا کہ زمانے کی رفتار اس اختلاف کو مزید وسعت دے گی۔ یہیں سے دوقومی نظریہ، قوم، قومیت، متحدہ قومیت، مسلم قومیت اور ہندو قومیت کے موضوعات اور مسائل پر مباحث کا آغاز ہوا۔ اس پس منظر میں دوقومی نظریہ کے اولین داعی سرسید احمد خان تھے اور اس دعوت کا اولین محرک اردو ہندی زبانوں کا تنازعہ تھا۔9

ہندوؤں کے اس رویے نے آگے چل کر ہندی اردو تنازع (۱۸۶۷ء) کی صورت میں ہندو مسلم سیاست میں اتنی اہمیت اختیار کر لی کہ ہندی زبان ہندوؤں کے لیے اور اردو مسلمانوں کے لیے ایک طاقتور قومی نشان بن گئی۔10 سرسید احمد خان نے نظریہ قومیت کو ہر سطح پر اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ وہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد انتخابی اور نیابتی اداروں اور پارلیمانی جمہوریت کے مسئلہ پر اپنی مسلسل تقریر و تحریر میں ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ قومیں ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے تاریخی اور عمرانی اصولوں کے مطابق متحدہ قومیت کے نظریہ سے اختلاف کیا۔11

"ہندوستان فی نفسہ ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں، ان ملکوں میں جہاں آبادی ایک قوم اور ایک مذہب سے مرکب ہوتی ہے۔ یہ قاعدہ بلاشبہ سب سے عمدہ ہے لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے... مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں اور جہاں مذہبی اختلافات اب بھی زور و شور پر ہیں... الیکشن کے خاص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے محض تمدنی خیالات کی بہ نسبت بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔"12

سرسید احمد خان نے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد مسلمانوں کے ملی شعور کو بیدار کرنے کے لیے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸٦ء میں قائم کی اور واضح کیا کہ اس خطے میں مخصوص معروضی حالات کے سبب دونوں قوموں کے سیاسی واقتصادی مفادات بالکل مختلف اور متضاد ہیں، ان کی ترجیحات اکثر جگہ باہم متصادم ہیں۔ سرسید احمد خان نے جدید تصورات کے مطابق تاریخی مذہبی، تہذیبی اور اقتصادی تناظر میں برصغیر کے مسلمانوں کو جداگانہ قوم قرار دے کر ان کے ملی تشخص کو سیاسی وسماجی پیش رفت پر ترجیح دی۔ اس طرح دوقومیت کے نظریہ کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

دوقومی نظریہ کی ترویج واشاعت کے لیے ہندوستان میں موجود مختلف اداروں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ نظریہ کے فروغ کے لیے سیاسی جماعتوں اور اس کے تحت سیاسی نظریات نے اپنے اداروں کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ جس میں صحافت کو تفوق حاصل رہا۔ سرسید احمد خان نے اردو صحافت کو اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اردو صحافت گواہ ہے کہ ہندوستان میں موجود سیاسی کشمکش کے باعث اہم تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ابتداً انگریزوں کی باقاعدہ عملداری قائم ہو جانے کے بعد اردو صحافت کا انداز خوشامدانہ تھا لیکن انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تحریک آزادی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ اب سیاست کا کام حکومت وقت سے محض معمولی رعایتیں اور ان کے روبرو عرضداشتیں پیش کرنے تک محدود نہیں رہا تھا۔ اس کا اثر اردو اخبارات پر بھی پڑا۔ تیزی کے ساتھ جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان کی عکاسی کے لیے نئے اخبارات کا اجرا ہوا اور پرانے اخبارات کی پالیسی اس تمام عرصے میں جارحانہ اور مدافعانہ رہی۔ سیاست کی طرح صحافت بھی مختلف راہوں پر گامزن تھی۔ اردو اخبارات علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک سلسلہ قومی اخبارات کا تھا، جو قومی امنگوں کے حامی اور ترجمان تھے۔ دوسرا جو علیحدہ مسلم قومیت کے نظریہ کا ہمنوا تھا اور تیسرا اینگلو انڈین اخبارات کا تھا جو سرکار کی حمایت کرتے تھے اور جنہیں اس صحافت کے عوض سرکاری سرپرستی حاصل رہتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندو صحافت نے علیحدگی کی سیاست کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس میں فرقہ پرست عناصر نے قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کی مخالفت میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ امر مسلمانوں کی نفسیاتی اور ذہنی وفکری سطح کو بدلنے پر منتج ہوا اور مسلمان ہر اس چیز کو پسند کرنے لگے، جس کی ہندو مخالفت کرتے

تھے۔ اردو اخبارات نے ہندوستان کی سیاسیات میں قومی اور ملی شعور بیدار کرنے میں بیسویں صدی عیسوی میں ایک طویل جدوجہد کی اور حکومتی پابندیوں کے باوجود اپنے موقف کو مقبول بنانے اور نظریہ کی ترویج میں مصروف رہے۔ اس طرح دوقومی نظریہ کے فروغ کے لیے اردو اخبارات نے ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کی۔ جو بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور مسلمان ایک علیحدہ مملکت کے حصول میں کامیاب ہوگئے۔

تحریک آزادی میں دوقومی نظریہ کی ترویج میں دوسرا اہم کردار اردو شاعری کا تھا۔ مسلم قومیت کے ایقان کو راسخ کرنے کے لیے مولانا الطاف حسین حالی کی بے مثال نظمیں "شکوہ ہند" اور "مسدس مدوجذر اسلام"، مولانا شبلی نعمانی کی "مثنوی صبح امید" اور "قومی مسدس" اور علامہ اقبال کی لازوال نظمیں "خضر راہ"، "طلوع اسلام"، "شکوہ"، "جواب شکوہ" وغیرہ وجود میں آئیں۔ اردو شعراء نے مسلم امت میں آزادی وطن کی نئی لہر پھونکی اور انہیں عملیت کی دعوت دی۔ اردو شعراء نے نظریہ قومیت کی اپنے ذہنی وفکری رجحان کے مطابق تشریح کی اور ملّی نظریے کو فروغ دیا۔ مسلم نظریہ قومیت کو سرحدی حدود و قیود سے ماورا قرار دیا اور اس کی بنیاد ہندوستانی مسلم تشخص کی زبان اردو اور اسلام پر رکھی۔ بیسویں صدی میں علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے پان اسلام ازم کی تحریک کو تقویت پہنچائی اور ہندوستان میں اسلامی نظریہ قومیت کو فروغ دیا "چین وعرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا"، کہنے والے اقبال مسلم نظریہ ملّی اور پان اسلام ازم کی حقیقتوں کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی سے نجات کے لیے وطن کا حصول ناگزیر سمجھنے لگے اور بالآخر انہوں نے تصور پاکستان پیش کردیا۔ وطنیت کے نئے تصور نے جنم لیا۔ شعراء نے اپنی اردو شاعری کے ذریعے غلامانہ رویے کی مذمت کی اور آزادی کے حصول میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان [۱۳]

تحریک آزادی کے دوران تیسرا اہم کردار نثر کا تھا۔ لوگوں کے ذہنی وفکری میلان اور سیاسی تبدیلیوں کے پیش نظر لٹریچر مرتب کیا گیا۔ اس لٹریچر سے اسلامی تشخص کے احساس نے تقویت پائی اور متحدہ قومیت کے مضمرات کو اس کے تمام حقائق کے ساتھ واضح کیا گیا۔ اس عہد کے اہم موضوعات "اسلام اور قومیت"، "متحدہ قومیت" اور "مسئلہ قومیت" تھے۔ اردو لٹریچر کے ذریعے علیحدہ مسلم قومی تشخص کے خدوخال کو ابھارنے کے لیے اقتدار کے حصول کو ناگزیر قرار دیا گیا اور اس امر کو ضروری قرار دیا گیا کہ اسلامی قومیت کے تقاضوں کا اسلامی نظام کے مطابق

عملی نفاذ اس وقت ہی ممکن ہے کہ جب مسلمانوں کے پاس اقتدار ہو۔ اسلامی حکومت کا قیام مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے۔

ہندوستان میں باضابطہ جمہوری نظام برطانوی عہد حکومت میں متعارف کروایا گیا اور فرقہ وارانہ اختلافات کو یکدم فراموش کر دیا گیا۔ متحدہ ہندوستان کبھی بھی مغربی جمہوری نظام کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ سیاسی اختلافات کے ساتھ ساتھ یہاں مذہبی اختلافات بھی شدید تھے اور جنھیں کسی صورت میں متحدہ قومیت کی تشریحات کے ذریعے ختم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوقومی نظریہ نے سیاسی نظریہ کا روپ اس وقت دھارا جب ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت ۱۹۳۷ء میں انتخابات منعقد ہوئے اور کانگریس مسلم لیگ کے مقابلے میں واضح کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں کانگریس کو گیارہ میں سے سات صوبوں میں حکومت تشکیل دینے کا موقع ملا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستانیوں کو اقتدار میں باضابطہ شریک کیا گیا۔ اس موقع پر متحدہ قومیت کے تحت جو اقدامات کئے گئے۔ اس میں مسلمانوں کے جداگانہ تشخص اور مذہبی اختلاف کو نظر انداز کیا گیا۔ ہندی زبان کو سرکاری درجہ دیا گیا۔ تعلیمی اصلاح کی آڑ میں ان کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو تباہ کیا گیا۔ مدارس میں بچوں کو "بندے ماترم" کا ترانہ پڑھنے پر مجبور کیا گیا۔ اس ترانے میں درگا، لکشمی اور سرسوتی دیویوں کو ماں کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ ترانہ خالص ہندو قومی تحریک کا نمائندہ ہے۔ کانگریسی پرچم کو قومی پرچم قرار دیا گیا۔ گویا متحدہ قومیت کی تعریف کو حقیقت کا روپ دینے کی ناکام عملی کوشش کی گئی۔ اس تمام سیاسی صورتحال میں اس احساس نے تقویت پائی کہ اقتدار کا حصول ناگزیر ہے ورنہ مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کو ہندو اکثریت میں جمہوریت کے نام پر مدغم کر دیا جائے گا، بعد ازاں جیسا کہ سکھوں کے ساتھ ہوا۔ اسی احساس نے مسلمانوں کو اس اقدام پر مجبور کیا کہ وہ مستقبل کے لئے اپنا لائحہ عمل طے کریں اور نصب العین متعین کریں۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور پیش کی گئی۔ اس قرارداد کو مقبول بنانے میں ہندو صحافت نے اہم کردار ادا کیا اور اسے قرارداد پاکستان کا نام دیا، جو بعد میں ہندوستانی مسلمانوں کا اجتماعی نصب العین قرار پایا۔ جداگانہ علیحدہ مملکت کے حصول کے لئے کتب لکھی گئیں، شعراء نے اپنی شاعری سے علیحدہ وطنیت کو عام کیا اور یہ قرارداد عوامی امنگوں کی ترجمان بن گئی۔ اس عہد میں مسلمانوں کا قومی نصب العین پاکستان کا حصول تجویز کیا گیا۔ جبکہ صحافت بھی دو حصوں میں منقسم ہوگئی، ایک گروہ نے پاکستان کے

حصول کو ہی ہندوستان میں فرقہ وارانہ اختلافات کا حل قرار دیا اور دوسرا گروہ ہندوستان کو متحد رکھنے کے حق میں تھا۔علمائے دیو بند نے بھی دو مختلف نظریوں کے تحت تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ایک جو پاکستان کے حق میں تھے اور دوسرا گروہ متحدہ قومیت پر یقین رکھتا تھا۔

اردو زبان کی جدوجہد میں کامیابی حاصل ہوئی اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا جس کو نئے انتظامی خدوخال کے نفاذ میں بڑی محنت وعزم کے تحت کام کرنا پڑا۔ان مشکلات میں سب سے بڑا مسئلہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ذہنی اور لسانی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ ۱۹۴۷ء۔۱۹۵۸ء تک کا عہد دستور سازی کے لئے سازگار دور تھا لیکن نوزائیدہ مملکت کے اندر ذہنی اور لسانی خلفشار کو پروان چڑھایا گیا۔اس میں نمایاں کردار مدرسہ کلکتہ کا تھا۔آمرانہ طرز فکر ملکی سالمیت کے درپے رہی۔مدرسہ کلکتہ نے مشرقی پاکستان میں اضطراب کی کیفیت پیدا کی اور بنگلہ اور اردو زبان کا سوال پوری شدومد کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا۔اس تنازع کو ختم کرنے کے لئے قائداعظم نے ڈھاکہ میں طلبہ سے خطاب کیا اور لسانی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ سازشی عناصر کو بے نقاب کیا۔لیکن یہ ذہنی وفکری بے اطمینانی اپنی جگہ موجود رہی جس کے نتیجے میں ۱۹۵۶ء میں ملک کے پہلے دستور میں دو زبانوں اردو اور بنگلہ کو قومی زبانوں کا درجہ دیا گیا اور قومیت کی تشکیل کی نفی کی گئی۔مگر اب مسائل کی نوعیت سیاسی ہوگئی تھی اور ایک نیا مطالبہ مشرقی پاکستان کی جانب سے پیش کیا گیا کہ اکثریت کی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔یہ ناممکن تھا لیکن تخریبی عناصر اس فکر کے پس پردہ کام کررہے تھے۔اسی عرصے میں اردو کو سرکاری اور قومی زبان کا درجہ دینے کیلئے انجمن ترقی اردو سرگرم عمل ہوگئی اور اردو کے فروغ کے لئے مختلف تعلیمی کانفرنسوں کا انعقاد کیا گیا جس میں حکومت کو اردو کے نفاذ کے لئے تجاویز پیش کی گئیں اور عملی اقدام کا آغاز بھی کر دیا گیا۔

۱۹۵۸ء میں ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔جنرل ایوب خان نے دستور کو ختم کر دیا اس دور میں سرکاری زبان کا مسئلہ ہنوز موجود رہا لیکن ملک کو دو بڑی وحدتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔یہ کوشش دراصل مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان پر امکانی سیاسی تفوق ختم کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ ایوبی دور حکومت میں گو کہ سرکاری زبان کا مسئلہ آئینی سطح پر موجود رہا مگر اس دور میں اردو زبان کے فروغ کے لئے

مختلف کمیشن تعلیمی صورتحال کے جائزے کے لئے قائم کئے گئے۔ دو بورڈز کا قیام عمل میں آیا، ایک کا کام اردو کو ترقی دینا اور لغات تیار کرنا تھا اور دوسرے کا کام بنگلہ زبان کو وسعت دینا تھا۔ اس سے حکومت کا مقصد یہ تھا کہ زبان کے اندر اصطلاحات کو وسعت دے کر علمی و سائنسی زبان بنایا اور اردو کو سرکاری سطح پر نافذ کیا جا سکے۔ ۱۵ زبان کو قومی حیثیت دینے کے ساتھ ساتھ لسانی اور امکانی فاصلے کم کرنے کی کوششیں کی گئیں، جو بے سود ثابت ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں احساس محرومی نے بنگلہ تحریک کو علیحدگی پسند تحریک میں تبدیل کر دیا تھا۔ اردو بنگلہ ۱۴ کے درمیان اختلاف کے نتیجے میں انگریزی کو تحفظ حاصل رہا اور قومی و سرکاری زبان کا مسئلہ محض چند تعلیمی کمیٹیوں کی سفارشات اور اداروں کے قیام سے آگے نہ بڑھ سکا۔

۱۹۶۹ء میں بحالی جمہوریت کے نتیجے میں ایوب خان کا دور حکومت اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ ملک کو دوسرے مارشل لاء کے دور سے گزرنا پڑا۔ یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لی۔ اس دور میں اردو زبان کو سرکاری درجہ دینے کی بھرپور کوشش کی گئی لیکن انگریزی نظام تعلیم کو برقرار رکھا گیا۔ ایئر مارشل نور خان کی سربراہی میں تعلیمی کمیشن تشکیل دیا گیا۔ لیکن انگریزی زدہ طبقے نے صوبائی زبانوں کے مسئلے کی آڑ میں اپنا منفی کردار ادا کیا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا اور ایک نئی اسلامی مملکت بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی میں ایک اہم عنصر زبان کا تھا۔ مشرقی بنگال میں اردو کے خلاف ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد جو تخم ریزی کی گئی تھی۔ اس پر حکومت باوجود سنجیدہ کوششوں کے ناکام رہی۔

۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک کا دور پاکستان کے جغرافیائی حدود کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس عہد میں گو کہ پاکستان دولخت ہو گیا لیکن پاکستان کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں اردو کے ادارے اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا پہلا مظہر آئین پاکستان ۱۶ء۱۹۷۳ کا آرٹیکل (۱)۲۵۱ ہے جو یہ کہتا ہے کہ:

۱۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور یوم آغاز سے پندرہ برس کے اندر اندر اس کو سرکاری و دیگر اغراض کے لیے استعمال کرنے کے انتظامات کیے جائیں گے۔

۲۔ شق (۱) کے تابع، انگریزی زبان اس وقت تک سرکاری اغراض کے لیے استعمال کی جا سکے گی، جب تک اس کے اردو سے تبدیل کرنے کے انتظامات نہ ہو جائیں۔

۳۔ قومی زبان کی حیثیت کو متاثر کیے بغیر، کوئی صوبائی اسمبلی قانون کے ذریعے قومی زبان کے علاوہ کسی صوبائی زبان کی تعلیم، ترقی اور اس کے استعمال کے اقدامات تجویز کر سکے گی۔

صدر ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں اعلیٰ ترین جامعاتی اور تحقیقی سطح پر قومی زبان اردو ذریعہ تعلیم و تحقیق کا رواج ہوا۔ صوبائی سطح پر بھی اردو کو اس کی جزئیات کے ساتھ نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس کے نتیجے میں ۱۹۷۲ء میں سندھ میں لسانی فسادات ہوئے جو ذوالفقار علی بھٹو کے حسن تدبر سے حل ہو گئے لیکن اس مرحلے پر اردو کو سندھی کے تابع کرنے کا پروپیگنڈہ کیا گیا جو اردو کے خلاف ایک گہری سازش تھی۔

۱۹۷۷ء میں ملک ایک بار پھر بحران کا شکار ہوا اور ابھی ملک جمہوری تقاضوں سے پوری طرح روشناس بھی نہ ہوا تھا کہ اسے تیسرے مارشل لاء کے عبوری دور سے گزرنا پڑا، جو ۱۹۸۸ء تک قائم رہا۔ جنرل ضیاء الحق صدر مملکت کی حیثیت سے کرسی صدارت پر متمکن ہوئے۔ اس عہد میں گو کہ انگریزی نظام تعلیم پر آنچ نہ آنے دی گئی لیکن اردو کی اہمیت و افادیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مقتدرہ قومی زبان کا قیام عمل میں آیا۔ اسکولوں میں اردو کو بالکل ابتدائی درجے سے ذریعہ تعلیم کا درجہ دیا گیا۔ اردو کانفرنسز کا انعقاد کیا گیا جس میں بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح اور شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے جشن ولادت پر کانفرنسز کرنے کے ایک سلسلے کا آغاز کیا گیا۔ اردو کو بانی پاکستان نے قومی تشخص کا پہلا عنصر قرار دیا تھا۔

اس عہد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے کی پہلی سیڑھی فراہم کی گئی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو میں اعلیٰ فنی و سائنسی اقامتی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں صدر جنرل ضیاء الحق نے اردو سائنس کالج کے معائنہ کے موقع پر ان کالجوں میں جامعاتی سطح پر اردو میں اعلیٰ تدریس کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کالجوں نے اردو تدریس کو اعلیٰ سطح پر ایک کامیاب ادارہ ثابت کیا۔ لیکن صدر ضیاء الحق کی حکومت ۱۹۸۸ء میں ختم ہو گئی اور کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

۱۹۸۸ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا ان کے عہد میں کالج کے اساتذہ کے ایک پر جوش گروہ نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خواب کی تعبیر کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ان اساتذہ کی جدوجہد کی داستان بہت طویل ہے۔ انجمن ترقی اردو اور اردو نواز مختلف شخصیات اس مقصد کے حصول کے لئے

مختلف اوقات میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے اخبارات ورسائل میں اس مطالبے کو شد و مد کے ساتھ دوہراتے رہے۔ مگر اس پورے عرصے میں کوئی باضابطہ منظّم حکمت عملی وضع نہیں کی گئی۔ حصول مقصد کے لئے ایسی اجتماعی حکمت عملی کا سراغ نہیں ملتا۔ اردو کالج کے پہلے اور آخری پوسٹ گریجویٹ جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر ایک یادگاری مجلّہ کالج سے شائع ہوا۔

اس مجلّہ میں دو یادداشتوں کو بھی پیش کیا گیا ہے جو سندھ کے گورنر حکیم محمد سعید اور بیرسٹر کمال اظفر کو دونوں کالجوں کے پرنسپلوں اور اس تحریک کے سرگرم اساتذہ اور ممتاز افراد کے ایک وفد نے ممتاز دانشور پروفیسر کرار حسین کی قیادت میں پیش کیں۔ ان قراردادوں کے نتیجے میں اردو یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ حکومتی ایوانوں میں زیر بحث رہا اور سندھ کے وزیر اعلیٰ سید عبداللہ شاہ اور عوامی حکومت کے دیگر ارکان کی طرف سے اس قرارداد کی متفقہ حمایت کی گئی، جو قومی زبان سے ان کی محبت کا مظہر ہے لیکن سرکاری سطح پر اردو زبان کا مسئلہ اداروں کے قیام سے آگے نہ بڑھ سکا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت کے دونوں ادوار (۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء) میں انگریزی کے فروغ کے لیے کام کیا گیا اور اسے ابتدائی درجے سے نافذ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ پاکستانی تہذیب وتمدن اور تاریخ کو نظر انداز کیا گیا۔ انگریزی زبان کو عوامی سطح پر رواج دینے کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں لیکن لوگوں کی ذہنی وفکری سطح کو احساس کمتری میں مبتلا کر گئیں۔ عوام دو طبقات میں تقسیم ہو گئے۔ انگریزی داں طبقہ اعلیٰ ملازمتوں کے حصول میں کامیاب رہا اور اردو داں طبقہ بہترین صلاحیتوں کے باوجود حکومتی حکمت عملی کے نتیجے میں ناانصافی کا شکار رہا۔ دوہرے نظام تعلیم نے پاکستانی نونہالوں کی ذہنی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔

۱۹۹۹ء میں جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کو برطرف کر کے اقتدار سنبھالا۔ جنرل پرویز مشرف کے دور کا ایک اہم کارنامہ ۱۳ نومبر ۲۰۰۲ء کو وفاقی اردو یونیورسٹی کا قیام ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے وزیر تعلیم و سائنسی امور پروفیسر ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کی سفارش پر ایک آرڈیننس کے ذریعے دونوں کالجوں کو ملا کر وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنسز اور ٹیکنالوجی کا درجہ دے دیا۔

اس تمام پس منظر میں اردو کے فروغ و ترقی اور اس میں جدید علوم وفنون اور دفتروں میں نفاذ کے سلسلے میں مختلف ادارے وجود میں لائے گئے۔ جن میں سے بیشتر کو حکومتی سرپرستی حاصل رہی۔ اس میں پہلا اور بنیادی ادارہ انجمن ترقی اردو پاکستان تھا۔ اس ادارے کے قیام سے بعد میں قائم ہونے والے اداروں کو تقویت حاصل ہوئی۔ اردو لغت بورڈ، مجلس دفتری زبان، اردو سائنس بورڈ اور مقتدرہ قومی زبان وغیرہ وغیرہ نے ایک وسیع ذخیرہ اردو لغات، اصطلاحات (دفتری، تاریخی، سیاسی، سائنسی) معروف تاریخی و سائنسی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وسیع ذخیرہ کے باوجود اس سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ جامعات اعلیٰ تدریسی سطح پر اردو کے نفاذ کیلئے جامعات ہی میں شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کا قیام عمل میں لائیں تاکہ طلباء کی تعلیمی ضرورتوں کو کماحقہ پورا کیا جاسکے۔ اردو کے فروغ کے لئے ترقیاتی ادارے پورے پاکستان میں قائم کئے گئے۔ جس کے نتیجے میں اردو کو ہر صوبے میں خصوصی اہمیت اور بین الصوبائی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

اردو زبان کا نفاذ جزوی طور پر تعلیمی و دفتری اداروں میں ہو گیا ہے۔ اسے عوامی حیثیت حاصل ہے لیکن یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اردو زبان اعلیٰ ملازمتوں کے لئے ضروری نہیں ہے۔ دوہرے تعلیمی نظام اور حکومتی پالیسی سے ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے بجائے ترقی پذیر ممالک کی صف میں ہنوز کھڑا ہے۔ ذہین طلبہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو ملک کی ترقی میں استعمال کرنے سے قاصر ہیں جبکہ انگریزی زبان کو باقاعدہ ایک تجارتی صنعت کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ جو متوسط طبقے کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے۔ قومی زبان کے مسئلے نے دو طبقات کو جنم دیا ہے جس سے ملکی حالت بہتری کی جانب گامزن ہونے کے بجائے دگرگوں ہے۔

موضوع پر مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کی تفصیلات و جزئیات کے لئے علیحدہ تحقیقی کوششوں کی ضرورت ہے تاکہ ان رکاوٹوں کے اسباب و جوہ کا گہرائی سے تجزیہ سامنے لایا جائے کیونکہ ان رکاوٹوں کو قومی سطح پر سوچنے اور حکمت عملی تیار کئے بغیر قومی زبان کو صحیح معنوں میں قومی تشخص کا آئینہ کہا جاسکتا ہے، نہ ہی قومی امور کو راہ راست پر لایا جاسکتا ہے۔ اس کی اولین رکاوٹ نفاذ کی راہ میں صوبوں کے سیاسی تحفظات ہیں جن کو دور کیے بغیر قومی اتحاد و یکجہتی اور مملکت کا استحکام ممکن نہیں ہوسکتا۔

مغرب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں کی ترقی کا بنیادی سبب اپنی زبانوں کو اہمیت دینا ہے کیونکہ ان ممالک میں علوم وفنون کو اپنی زبانوں میں استعمال کیا گیا اور انگریزی زبان کو اہمیت نہیں دی گئی تاہم انگریزی زبان نے لنگوا فرینکا کے طور پر اپنی انفرادیت تسلیم کروائی اور اس طرح انگریزی زبان سے فرانسیسی زبان کے الفاظ نکال کر اسے یورپ کی شناخت بنا دیا گیا۔ اس میں علمی صلاحیت پیدا کی جس کی وجہ سے تجارت، اعلیٰ تعلیم، ذرائع ابلاغ اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں عالمی سطح پر انگریزی کے تفوق کو تسلیم کر لیا گیا۔ پاکستان بھی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوسکتا ہے اگر اردو زبان کا قومی و سرکاری سطح پر نفاذ ہو جائے۔ تعلیم طبقاتی تقسیم سے بالاتر ہو کر تمام طبقات کو مساویانہ طور پر فراہم کی جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسا نظام تعلیم وضع کیا جائے جس میں اردو کو اوّلیت دی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل سفارشات پیش کی جا سکتی ہیں؛

۱۔ علاقائی کلچر اور زبانوں کو اردو سے قریب لانے کی کوششیں تیز تر کرنی چاہیے ہیں اور اس کے لیے علاقائی ادبیات وثقافتی اظہار کے اردو میں تراجم کیے جائیں۔

۲۔ صرف مرکزی سائنس بورڈ، مقتدرہ قومی زبان، اردو ڈکشنری بورڈ یا جو تا حال ادارے قائم ہیں وہ ناکافی ہیں۔ اس لیے جامعات کی سطح پر زبانوں کے کلیے الگ قائم کیے جائیں اور اردو کو کلیدی زبان کی حیثیت دی جائے۔

۳۔ تمام عصر حاضر کے علوم وفنون کے تراجم کیے جائیں۔

۴۔ اردو کے نافذ کرنے کا عمل پارلیمان میں پیش کیا جائے تا کہ ہر پاکستانی اس کے نفاذ میں شریک ہو سکے۔

۵۔ ذرائع ابلاغ کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ اردو کے فروغ میں ہر سطح پر اپنی شراکت کا تعین کریں۔

۶۔ اشتہاراتی کمپنیاں مصنوعات کی اشتہار سازی میں اردو زبان کی ساخت کا خاص خیال رکھیں۔

۷۔ حکومت پاکستان کو بھارت سے سبق سیکھنا چاہیے کہ کس طرح دیوناگری رسم الخط کو پورے بھارت میں نافذ کر دیا گیا جب کہ اردو کے حوالے سے عوام میں آمادگی پائی جاتی ہے۔

۸۔ کوئی بھی تجویز یا سفارش ارباب اختیار کی توجہ کے بغیر عملی شکل اختیار نہیں کر سکتی لہٰذا فی الفور اردو کو انگریزی کا متبادل قرار دینے کے لیے پارلیمنٹ میں قرارداد پیش کی جائے۔

۹۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں موجود اردو زبان کے نفاذ کا متعین عرصہ ۱۹۸۸ء میں پورا ہو چکا ہے لہٰذا اردو زبان کو فوری طور پر سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

۱۰۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے تمام امتحانات اردو زبان میں بھی لیے جائیں۔

۱۱۔ ذہانت کسی کی میراث نہیں ہوتی پاکستانی عوام کو زبان کی تفریق کے بغیر حقوق دیے جائیں اور پاکستان کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنے دیا جائے۔

۱۲۔ اعلیٰ تعلیم میں سب سے بڑی رکاوٹ زبان ہے ہمیں کھلے دل سے تسلیم کر لینا چاہیے کہ نہ ہمیں ان ۶۱ برسوں میں انگریزی آئی اور نہ اردو لہٰذا جلد از جلد اردو کو اپنایا جائے تا کہ یہاں بھی بڑے لوگ پیدا ہو سکیں اس بات کا چرچا بند کیا جائے کہ اردو اس قابل نہیں ہے کیونکہ تاریخ سے یہ ثابت ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

۱۳۔ یکساں نظام تعلیم رائج کیا جائے۔ اردو کی تنگ دامنی کو اب دور کیا جا چکا ہے اور وفاقی اردو یونیورسٹی میں اعلیٰ تدریس کے تمام شعبہ جات میں فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں جو اس بات کا بعین ثبوت ہیں کہ اردو زبان قومی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

۱۴۔ قانونی نظام کو اردو میں مکمل طور پر منتقل کر کے عوام کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ عوام اپنے حقوق و فرائض سے بخوبی آگاہ ہو سکیں اس طرح معاشرے سے جرائم کا انسداد ہوگا اور جمہوری نظام کو تقویت ملے گی۔

حوالہ جات

حرف اوّل

حوالہ جات:

۱۔ گریرسن کی رائے ہے کہ اڑھائی ہزار سال قبل مسیح آریہ لوگ ایران کے شمال مغربی علاقے میدیا میں آکر آباد ہوئے۔ کتنی صدیوں کے بعد کچھ تو وہاں سے نکل کر ہند میں چلے آئے اور ان کی زبان قدیم آریائی سے الگ ہو کر ہند آریائی بن کر آئی۔ (ورما، سدھیشور، آریائی زبانیں، لاہور؛ مکتبہ معین الادب، نومبر ۱۹۶۰ء ص ۳۳)

۲۔ وید، آرین لوگوں کے وہ خیالات ہیں جو ہندوستان کی زرخیز زمین میں آکر آباد ہوئے وہ اپنے خیالات اپنے ساتھ لائے تھے لیکن ان کی ترقی اور تکمیل ہندوستان میں ہوئی۔ خیالات کا یہی سرچشمہ تھا جس سے ایران میں اوستا نکلی۔ ویدوں کی زبان اور اوستا کی زبان میں حیرت انگیز مماثلت ہے اور یہ بات کہی گئی ہے کہ اوستا کی زبان ویدک سے اس سے زیادہ قریب ہے جتنی ویدک قدیم سنسکرت سے۔ میکس ملر نے رگ وید کی متعلق کہا ہے کہ "یہ پہلی بات ہے جو آرین انسان کی زبان سے نکلی" (نہرو، جواہر لال، تلاش ہند، لاہور؛ ادارہ تخلیقات ۲۰۰۴ء، ص ۹۳)

۳۔ داسیو دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے اور اس علاقے میں آباد تھے جس پر آریا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ داسیو نے اپنے مکانات اور جانوروں کی حفاظت کے لئے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن جب ان کے پور اور درگ (انکے شہر اور قلعے) تباہ ہو گئے اور انکی قوت مقاومت نے بالکل جواب دے دیا تو انھوں نے آریوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دئے اور غلام بن گئے۔ جنھیں بعد میں سماج میں شودر کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا (ترپاٹھی، رما شنکر، تاریخ قدیم ہندوستان، ترجمہ سید سخی حسن نقوی، کراچی؛ سٹی بک پوائنٹ ۲۰۰۵ء، ص ۳۷)

۴۔ آریوں کی مسلسل لڑائیوں، سیاسی ماحول اور زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے نتیجے میں معاشرہ چار ذاتوں میں منقسم ہوگیا۔ اس طرح وہ لوگ جو مقدس کتابوں کا علم رکھتے تھے، قربانیوں میں پروہت کے فرائض انجام دیتے تھے اور تحفے تحائف قبول کر لیتے تھے، برہمن کہلاتے تھے۔ جو لوگ جنگ کرتے، زمینوں پر قبضہ رکھتے اور سیاسی طاقت استعمال کرتے۔ انہیں چھتری (کشاتریہ) کہا گیا۔ عوام، تجارت، پیشہ ور لوگ، زراعت کرنے والے اور کاریگروں کو ویش کا نام دیا گیا۔ شودر سے نیچ کام متعلق کر دیئے گئے۔ (ترپاٹھی، رما شنکر، تاریخ قدیم ہندوستان، ترجمہ سید سخی حسن نقوی، کراچی؛ سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۵ء، ص ۵۱)

۵۔ Toynbee, Arnold, J., A Study of History, New York; Oxford University Press, 1962, p.149

۶۔ سورۃ آل عمران آیت ۱۰۴ میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ:

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔"

۷۔ مسلم حملہ آوروں کے ہندوستان میں داخلے کے وقت شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ مغربی ہندی کی بولیاں کھڑی، ہریانی، برج، بندیلی، قنوجی دوآبہ، گنگ وجمن میں رائج تھیں۔ (فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۴۴)

۸۔ والمیکی رامائن کے سندر کانڈ میں یہ ذکر آیا ہے کہ برہمن یا دو جاتی لوگ سنسکرت بولتے تھے۔ یاسک اور صرف ونحو کے ماہر پانِنی نے غیر مذہبی رسوم کی سنسکرت کو بھاشا کہا جاتا ہے (جو بولی جاتی ہے) کا تیاین

نے مشرقی اور شمالی گفتگو کے طریقوں کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہا بھارت کی تصنیف کے زمانے میں بلکہ پانِنی کے زمانہ تک ہندو سماج ایک بالکل کھلا ہوا سماج تھا اور برہمن اور غیر برہمن ایک مشترک زبان استعمال کرتے تھے ورنہ ترسیل اور میل جول ناممکن ہو جاتا۔ لیکن منو کی ایسی قانون سازی کے بعد کہ شودروں اور عورتوں کو سنسکرت نہیں سیکھنا چاہیے۔ سماج نے آہستہ آہستہ ایک دوسری خصوصیت اختیار کر لی اور ہرش وردھن (نویں صدی) کے زمانہ تک جبکہ سنسکرت بہت پیچیدہ اور مزین ہو گئی تھی اور دوسری ملکی زبانیں ترقی پا رہی تھیں تو سنسکرت بتدریج "چند منتخب" افراد کی زبان ہو کر رہ گئی۔ (فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۱۴۸۔۱۴۶)

۹۔ مہا تما بدھ اور مہا بیر نے اپنی تعلیمات کو مقبول عام بنانے کے لئے اردھ ماگدھی اور پالی میں پیش کیا ہے۔ (فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۱۴۵)

۱۰۔ اردو کی باقاعدہ تحریر و انشاء کا آغاز دکن سے ہوا۔ دکن ہی میں اردو نے چودھویں صدی کے لگ بھگ نظم اور نثر کے لئے ایک معیاری زبان کا درجہ پایا۔ دکن اور گجرات میں "دکنی" کے نام سے دہلی کی زبان کو قلمبند کیا گیا۔ (فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۴۵)۔

۱۱۔ ڈاکٹر چٹرجی گجری کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "دکنی کا نام گجری، اسکی اصلیت اور مشابہت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے گوجر جنھوں نے پنجاب کے شہروں کو گجرات اور گجرانوالہ کا نام دیا۔ شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ ہجرت کر کے دکن گئے تو انھوں نے اپنے نام اور بولی کو کچھ دن

کے لئے زندہ رکھا۔ (فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۴۶)

۱۲۔ آزاد، حسین محمد، آب حیات، لکھنؤ؛ اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء، ص ۴

۱۳۔ ندوی، سلیمان سید، نقوش سلیمانی، سندھ؛ اردو اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ص ۶

۱۴۔ حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، مولوی عبدالحق، حکیم شمس اللہ قادری اور کسی حد تک پروفیسر عبدالقادر سہروردی اردو کا ماخذ پنجابی کو مانتے تھے۔ (فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۴۴)

۱۵۔ فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۴۴

۱۶۔ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اسکے لفظی معنی "خیمہ" یا چھاؤنی (لشکر گاہ) کے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال شہنشاہ اکبر کے زمانے کے سکوں پر پایا جاتا ہے۔ اکبر سے پہلے امیر علاؤالدین جوینی کی "تاریخ جہاں کشا" اور فضل اللہ کی جامع التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خان اور اسکی اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے خیموں کو اردو کہا کرتے تھے۔ چنگیز خان کے فرزند جوجی خان کے زمانے میں، اسکے نائب اور امراء جب کسی مہم پر مستقر سے روانہ ہوتے تھے تو زریں خیموں میں قیام کرتے تھے جس کے باعث ان کی لشکر گاہیں اردوئے مطلا (Golden hord) کہلاتی تھیں۔ (فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۴۳)۔

۱۷۔ سترھویں صدی عیسوی میں درباری زبان اردوئے معلّٰی کہلانے لگے۔ جب مغل بادشاہوں نے فارسی کے مقابلے میں اردو کی سرپرستی کی اور خود بھی اس میں لکھنے پڑھنے لگے تو رفتہ رفتہ اردو زبان کے لئے اس طویل ترکیب زبان اردوئے معلّٰی کے بجائے صرف لفظ "اردو" باقی رہ گیا۔ (فضل الرحمٰن، پروفیسر، مدیر اعلیٰ، اردو انسائیکلوپیڈیا، جلد اول، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اردو، ۱۹۹۶ء ص ۴۳)

۱۸۔ بان، گستاؤلی، ڈاکٹر، تمدن ہند، ترجمہ سید علی بلگرامی، کراچی؛ بک لینڈ، ۱۹۶۲ء، ص ۳۴۳۔

۱۹۔ مولوی عبدالحق کے مطابق ہندوستانی قواعد ولغت پر پہلی کتاب اندازاً ۱۷۱۵ء میں یورپین مصنف جان شیوا کیٹلر نے لکھی۔ جسکی اشاعت ڈیوڈمل نے ۱۷۴۳ء میں کی۔ یہ کتاب لاطینی زبان میں لکھی گئی۔ اردو زبان کی عبارتیں رومن حروف میں ہیں البتہ حروف کی پٹیوں میں ہندوستانی الفاظ بعینہ لکھے ہیں اور ان الفاظ کا املا ڈچ زبان کے طریقے پر ہے۔ (کوثر، اے۔ ایچ، اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کا حصہ، کراچی؛ لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷)

۲۰۔ کوثر، اے۔ ایچ، اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کا حصہ، کراچی؛ لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷)

۲۱۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے انگریزی ہندوستانی لغت، (A Dictionary, English and Hindostani) جس کا پہلا حصہ ۱۷۸۶ء اور دوسرا ۱۷۹۰ء میں شائع ہوا (کوثر، اے ایچ، اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کا حصہ، کراچی؛ لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۴ء ص ۱۸)

۲۲۔ ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبیتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو چارٹر دیا "اپنی قوم کی غربت کے لئے اور اپنے ابنائے ملک کی دولت کیلئے"۔ الزبیتھ نے اس کمپنی میں بڑی دلچسپی ظاہر کی اور اس کے سرمائے میں اپنی طرف سے

اضافہ کیا۔ جو کمپنی اس طرح میدان میں آئی وہ اس زمانہ کے سوداگرانہ بنیا پن تخلیات کی سچی نمائندہ تھی۔ ہندوستانی تجارت پر اس نے مسلح اور قانونی دونوں طرح کی اجارہ داری قائم کی۔ مسلح سمندری تجارت وسیع سے وسیع پیمانہ پر پھیلنے اور اپنی مدافعت کرنے کے پورے اختیارات کے ساتھ۔ (چند، تارا، ڈاکٹر، تاریخ تحریک آزادی ہند، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی، نئی دہلی؛ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان وزارت ترقی رسائل حکومت ہند، ۱۹۹۸!، ص، ۲۸۷۔۲۸۸)

۲۳۔ ۱۶۴۹ء سے ۱۶۸۹ء تک کمپنی کی تجارت نے بڑی ترقی کی لیکن جوں جوں تجارت ترقی کرتی گئی اور منافع بڑھتا گیا۔ اس کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔ ۱۶۶۱ء کے چارٹر سے کمپنی کو صلح اور جنگ کرنے اور انصاف کرنے کے لئے عدالتیں قائم کرنے کا حق مل گیا۔ گورنمنٹ کے اختیارات سے مسلح ہونے کے بعد کچھ اقتدار اور مملکت کے خواب دیکھنے لگے۔ سر جان چائلڈ جو ۱۶۹۲ء میں بمبئی اور سورت کی کمپنی کی فیکٹری کا صدر ہو گیا۔ اس نے ہندوستان میں سول اور ملٹری طاقت کی ایک سیاسی تنظیم پر زور کیا اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اعادہ کیا کہ اتنی کثیر مقدار میں محاصل پیدا اور حاصل کئے جائیں کہ یقینی طور پر ایک عظیم اور مستحکم بنیاد والی انگریز حکومت ہندوستان میں قائم ہو سکے جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی ہو، چنانچہ وسیع پیمانے پر تیاریاں کی گئیں۔ مسلم جہاز جن پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں، حاصل کئے گئے۔ پیدل افواج کی متعدد کمپنیاں تیار کی گئیں اور ایک باضابطہ پیدل فوج کی کمپنی مع ان کے افسران کے انگلستان سے طلب کی گئی۔ مدراس میں مورچے بنائے گئے اور اسے دیواروں سے گھیر دیا گیا۔ بنگال میں "چٹا گانگ" پر زبردستی قبضہ کر کے اسے مستحکم کرنا تھا۔ ہگلی اور سمندر کے قریب ایک بندرگاہ حاصل کرنا تھا۔ مغربی ساحل پر ہندوستان کی جہاز رانی کو تباہ و برباد کر دینا تھا۔ اور سلطنت مغلیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دینا تھا۔ کمپنی کی اس قسم کی مرکنٹائل پالیسی کے اس طرح کامیاب ہو جانے کے لئے یہ موقع قبل از وقت تھا اور مغل شہنشاہیت بھی اس وقت مضبوط تھی۔ کمپنی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اس پروگرام میں کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ بنگال میں نواب شائستہ خان کی افواج نے انگریزوں کو "ہجیلی" سے جہاں وہ جا کر چھپتے تھے

مار بھگایا اور چٹا گانگ پر ان کو قبضہ نہیں کرنے دیا۔ ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں مغلوں کا ردِ عمل فوری اور شدت آمیز تھا۔ سورت، میسولی پٹم اور وزیگا پٹم کی فیکٹریاں چھین لی گئیں۔ بمبئی "پرسیدی" کے بحرے بیڑے نے حملہ کیا اور پورا جزیرہ بہ استثناء قلعہ قبضہ میں لے لیا۔ انگریز ذلیل ہو گئے اور خود ان کے مورخ "مل" کے قول کے مطابق "ان کو ذلت کی انتہائی پست سطح تک اترنا پڑا"۔ انھوں نے عجز و انکساری کے ساتھ ایک درخواست پیش کہ کہ "ان کے انتہائی مذموم جرائم کو معاف کر دیا جائے"۔ شہنشاہ نے ان کے سفیروں کی التجاؤں کو سنا اور اس پر راضی ہو گئے کہ ۱۶۹۰ء میں ایک نیا فرمان اس شرط پر جاری کیا کہ کمپنی ہندوستانی تاجروں کے کل مطالبات ادا کرے۔ سلطنت کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا معاوضہ دے اور سر جان چائلڈ کو انگلستان واپس بلا لیا جائے۔ ان شرائط کے پورا ہونے پر بمبئی کو خالی کر دیا گیا اور مغربی ساحل اور بنگال میں تجارت کا جو پرمٹ تھا اس کی پھر تجدید کر دی گئی۔ (چند، تارا، ڈاکٹر، تاریخ تحریکِ آزادی ہند، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی، نئی دہلی؛ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان وزارت ترقی رسائل حکومت ہند، ۱۹۹۸ء، ص، ۲۹۴۔۲۹۶)

۲۴۔ سولہویں صدی کے آغاز میں پرتگیز، سترہویں صدی میں ڈچ اور فرانسیسی ہندوستان میں آئے اور انھیں کے پیچھے پیچھے انگریزوں نے بھی سرزمین ہند میں اپنا پہلا قدم رکھا (بریلوی، منشی جگیشور ناتھ بتیاب، انگریزوں کا پہلا قدم، رسالہ زمانہ، کانپور؛ ۱۹۳۹ء، ج ص، ۳۶۹)

۲۵۔ بنگال میں انگریزوں نے با اثر ھندو سیٹھوں اور اہلکاروں اور میر جعفر جیسے غدار مسلمانوں کو ساتھ ملا کر سراج الدولہ (اپریل ۱۷۵۶ء۔۲۲ جون ۱۷۵۷ء) کی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ تیار کیا۔ ۲۲ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی میں انگریزی فوجیں صف آراء ہوئیں اور اگلے روز میر جعفر اور ان کے رفقاء کی غداری کے باعث میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ (اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد چہارم، لاہور؛ دانش گاہ پنجاب، طبع اوّل، ۱۹۶۹ء، ص ۹۳۹)

۲۶۔ بنگال پر انگریزوں کے قبضے کے بعد میر جعفر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی خواہشات کو پورا نہ کر سکا تو اس کو معزول کر کے ۱۷۶۰ء میں انگریزوں نے میر قاسم کو اس کی مسند پر بٹھایا۔ میر قاسم ایک قابلِ حکمراں تھا۔ وہ ملک میں امن و امان اور نظم و نسق کی بحالی کا خواہاں تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ لیکن انگریز اپنے آپ کو ہر قاعدے قانون سے آزاد سمجھتے تھے۔ کمپنی کا ہر ملازم اپنے مال کو محصول سے مستثنیٰ سمجھتا تھا اور اس سے ملک اور مقامی تاجروں کی مالی حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ میر قاسم حتی الامکان لڑائی سے بچنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے مرشد آباد چھوڑ کر مونگیر (منگھیر) کو اپنا مستقر بنالیا۔ آخر اس نے انگریزوں کا محصول معاف کر دیا، لیکن ان کے ساتھ ہی یہ رعایت مقامی تاجروں کو بھی دے دی۔ یہ اقدام ان کی اجارہ داری کے حق میں مہلک تھا، چنانچہ انھوں نے لڑائی چھیڑ دی اور دوبارہ میر جعفر کی نوابی کا اعلان کر دیا۔ (۱۷۶۳ء) میر قاسم بہار سے ہوتا ہوا اودھ پہنچا، جہاں شاہ عالم اور نواب شجاع الدولہ اس کی اعانت پر آمادہ ہو گئے، لیکن مؤخر الذکر نے بے وفائی کی، میر قاسم کو نظر بند کر دیا اور اس کی فوج اور بادشاہ کو لیکر انگریزوں سے لڑنے چلا۔ بکسر کے مقام پر انگریزوں نے اسے شکست دی۔ (۱۷۶۴ء) شاہ عالم انگریزی لشکر میں آ گیا اور بنگال کے تینوں صوبوں کی سند دیوانی ان کے نام لکھ دی۔ جنوری ۱۷۶۵ء میں میر جعفر کی موت کے بعد نجم الدولہ گدی پر بیٹھا، لیکن وہ محض وظیفہ خوار تھا، جس کا حکومت میں کوئی عمل دخل نہ تھا اور بنگال پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ (اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد چہارم، لاہور: دانش گاہ پنجاب، طبع اوّل، ۱۹۶۹ء، ص، ۹۴۰)

۲۷۔ سدید، انور، اُردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۲۔

۲۸۔ بنگال میں قبضے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس بات پر اصرار تھا کہ مالگزاری سے اس کے منافع میں کئی گنا اضافہ ہونا چاہیے اور وارن ہسٹینگز کو بھی اس امر کا احساس تھا کہ اس کو گورنر مقرر کرنے کے پیچھے جو مقاصد کارفرما ہیں، وہ یہی ہیں کہ مالگزاری کی رقوم میں اضافہ ہو۔ وہ خود بھی اس مقصد میں کامیابی کا زبردست

خواہاں تھا کہ کمپنی اور انگلستان میں بیٹھے ہوئے حکام کی نگاہوں میں اپنا وقار بلند کر سکے۔ چنانچہ اس نے مالگزاری کی رقوم میں اضافہ کے لئے مختلف طریقوں کی جانچ پڑتال کے لیے بنگال کے مختلف اضلاع کا دورہ کیا اور رپورٹ مرتب کی اور کہہ دیا کہ اس قدر اہم اور بڑے کام کو خوش اسلوبی اور جلدی سے انجام دینے کی ایک ہی صورت ہے کہ نیلام کے سیدھے سادے طریقے سے پانچ سال کی قلیل مدت کا بندو بست کر دیا جائے اور چنانچہ زمیندار یا مالگزاری وصول کرنے والے موروثی طبقے کے ہاتھ اراضی نیلام کر دی گئی۔ جن زمینداروں کی بولی اوسط سے گری ہوئی تھی، انھیں کچھ معاوضہ دیکر الگ کر دیا اور ان کی زمین دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ (ملک، عبد اللہ، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہدِ آزادی ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء، ص، ۴۰۔۴۱)

۲۹۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دے دی اور میسور کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ (قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر، برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص، ۲۸۱)

۳۰۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقصد برطانیہ کی خوشحالی کے لئے ایک دولت مند علاقے پر قبضہ رکھنا تھا۔ جہاں کی دولت سمیٹ کر وہ اپنے وطن لے جاتے تھے اور جہاں کی صنعت وحرفت کو تیار کر کے وہ برطانوی مال کیلئے ایک مستقل سودمند منڈی قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ڈھاکہ کی ململ اور بنارس کا ریشمی کپڑا جو ایشیاء اور یورپ کی منڈیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ انگریزوں کی اس پالیسی کی بدولت ولایتی کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑے کا مقابلہ نہ کر سکا۔ کاریگر تباہ ہوگئے۔ چھوٹی بڑی تمام صنعتیں اس سے متاثر ہوئیں۔ سر سید لکھتے ہیں کہ "اہلِ حرفہ کا روزگار بہ سبب جاری اور رائج ہونے اشیاءِ تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والا اور دیا سلائی چلانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا" (خان، سر سید احمد، اسباب بغاوتِ ہند، کراچی؛ باب الاسلام پریس، ۱۹۵۷ء ص، ۱۶)

۳۱۔ برطانوی اقتدار سے پہلے تک ہندوستان کی سیاسی وسماجی زندگی جیسی بھی تھی اس میں بہرحال ایک طرح کا ٹھہراؤ اور ایک طرح کی وحدت قائم تھی۔ مختلف فرقوں نے جو اس ملک میں بسنے آئے تھے، رہنے سہنے کا ایک مشترک طریقہ مرتب کرلیا تھا۔ ہر جماعت پورے معاشرے کا ایک اہم فرد تھی۔ سماجی ڈھانچے کے تعمیری پروگرام میں مذہب کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرتا تھا لیکن برطانوی تسلط نے اس وحدت اور اس ڈھانچے کو توڑ دیا۔ لوگ ایک دوسرے سے الگ اور دور ہونے لگے۔ ان کے درمیان مغائرت اور طبقاتی فاصلے پیدا ہونے لگے۔ یہ مغائرت اور دوری دراصل برطانوی حکمرانوں کی اس سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا جو انھوں نے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے اصول کو سامنے رکھ کر اپنایا تھا۔ انگریزوں کی خارجہ حکمتِ عملی کے ایک ذمہ دار رکن سر جان مینرڑ (Sir John Mynard) کا کہنا ہے کہ

> "یہ صحیح ہے کہ برطانوی اقتدار نہ تو قائم ہوسکتا تھا اور نہ آج بھی برقرار رہ سکتا ہے۔ اگر وہ انتشاری میلان جس کا ایک مظہر ہندو مسلم مخالفت ہے، یہاں نہ پایا جاتا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو مسلم عوام کی رقابت کی ابتداء، برطانوی دورِ حکومت سے ہوئی ہے"۔

(فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر، اُردو ہندی تنازع، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۶ء، ص۷۲۔۷۳)

۳۲۔ انگریزوں کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اوّل تو وہ چاہتے تھے کہ ان کے سیویلین شاگرد ایک ایسی زبان سیکھیں جو تمام ہندوستان میں بولی جاتی ہو۔ جیسے فارسی اس وقت ملکی، انتظامی اور سیاسی اغراض کے علاوہ عام طور پر شرفاء و ادباء کی زبان سمجھی جاتی تھی تاکہ وہ نہ صرف اپنے ماتحتوں یا اعلیٰ درجے کے لوگوں سے بلکہ ہر شخص سے گفتگو کرنے کے قابل ہو جائیں۔ دوسرے ہندوستانی زبان اس وقت بہ نسبت اور دیسی زبانوں کے کچھ زیادہ ترقی یافتہ تھی اور جغرافیائی پہلو سے ہندوستان میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ اس زبان میں ایسی نثر پیدا ہو جو ہندوستان میں سرکاری زبان کا کام دے

(یوسف علی، عبد اللہ، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، لاہور؛ دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۳)

۳۳۔ پنڈت کرشن پرشاد کول کے مطابق "اٹھارویں صدی کے آخر میں انگریزی حکومت کی مصلحتوں نے فورٹ ولیم کالج میں پہلے پہل نئی ھندی کی بنیاد اس طرح ڈلوائی کہ للولال جی سے "پریم ساگر" ایسی ھندی زبان میں لکھوائی جس کا تعلق اُردو سے تھا نہ برج بھاشا سے، بلکہ کھڑی بولی اور ہندوستانی سے تھا۔ فرق یوں پیدا کیا گیا کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے داخل کیئے گئے اور یہ قرار دیا گیا کہ جس زبان میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے ہوں وہ اُردو ہے اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ بنیاد تو نئی ہندی کی اس طرح پڑ گئی لیکن بہت عرصے تک یہ پنپی نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس نئی ہندی میں کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں اور جوں جوں ھندو اور مسلمانوں میں قومی اور سیاسی اختلاف بڑھتا گیا، نئی ہندی اسی جوش میں ابھرتی گئی۔ فارسی اور عربی کے وہ الفاظ جو زبان کے روزمرہ میں داخل ہو گئے تھے، نکالے جانے لگے اور ان کی جگہ سنسکرت کے بھاری بھاری الفاظ داخل کیئے جانے لگے۔ (کول، کشن پرشاد، پنڈت، ادبی وقومی تذکرے، علیگڑھ؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۔۱۵)

۳۴۔ انگریزی تسلط کے بعد، بعض اسباب کی بناء پر ہندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی، جس کی بنیاد پر قدیم تہذیب اور قدیم مذہب اور زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کے لئے نئی زبان کی ضرورت داعی ہوئی، کیونکہ قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے۔ اب انھوں نے ان علاقوں میں جہاں ہندی بولیاں رائج تھیں۔ ایک مصنوعی ہندی کو داخل کرنا شروع کیا، اور اُردو کو وہاں سے نکالنا شروع کیا۔ اس چیز نے ہندو مسلم اتحاد میں ہمیشہ کے لئے رخنہ ڈال دیا اور دونوں کا سیاسی نقطہ نظر ایسا بدلہ کہ ہندو مسلمان پھر کبھی کسی مسئلے پر متفق نہ ہو سکے۔ (بریلوی، عبادت ڈاکٹر، خطبات مولوی عبد الحق، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۵۲ء، ص، ۲۴۵)

۳۵۔ البیرونی، ابوریحان، تاریخ ھندوستان، آزاد کشمیر؛ ارشد بک سیلرز، سن ندارد، ص، ۱۱۔۱۲۔

۳۶۔ ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت کا احساس اُردو ہندی تنازع کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا اور وہ خاکہ جو جولائی ۱۹۰۳ء میں سہارنپور کے اجلاس میں محمڈن پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے قیام کے وقت تیار کیا گیا۔ اس کو عملی شکل ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اختتام پر دی گئی۔ اس طرح شملہ ڈیپوٹیشن کی بے مثل کامیابی کے بعد علیگڑھ اور دیگر صوبوں کے مسلم لیڈران نے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے پیشِ نظر آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی۔ وقاالملک کے صدارتی خطبے کی روشنی میں مسلم لیگ نے اپنے تین اہم مقاصد قرار دیئے۔

۱۔ ھندوستان کے مسلمانوں کے درمیان برطانوی حکومت سے وفاداری پیدا کرنا۔

۲۔ ھندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مفادات کا تحفظ کرنا

۳۔ مسلمانوں کے مفادات کو بغیر نقصان پہنچائے ہوئے مسلمان اور دوسرے مذہبی فرقوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنا۔

(Sharif Al-Mujahid 'Muslim League Documents, 1900-1947, Vol. I (1900-1908), Karachi; Quaid-e-Azam Academy, 1990, P. 401)

۳۷۔ احمد، میاں بشیر، اُردو پاکستان کی قومی زبان، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۴۵۔

۳۸۔ جب آریا ہندوستان میں داخل ہوئے تو ایک طویل عرصے تک داسیو (دڑاوروں) کے ساتھ برسرِ پیکار رہے اور داسیوں کو شکست دینے کے بعد اپنی خصوصیات کو برقرار رکھنے کے لئے معاشرے کو چار ذاتوں میں تقسیم کر دیا۔ ان امتیازات کی ابتداء دراصل گورے آریوں اور کالے داسیوں کے "رنگ کے فرق" سے ہوئی۔ لیکن آریاؤں کی مسلسل لڑائیوں، سیاسی ماحول اور زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور مختلف

پیشوں میں مخصوص مہارت حاصل کرنے کے حاصل کرنے کے رجحان کے نتیجہ میں پیشے رفتہ رفتہ موروثی ہوتے چلے گئے۔ اس طرح وہ لوگ جو مقدس کتابوں کا علم رکھتے، قربانیوں (یگیوں) میں پروہت کے فرائض انجام دیتے تھے اور تحفے تحائف قبول کرتے تھے، برہمن کہلانے لگے۔ جو لوگ جنگ کرتے، زمینوں پر قبضہ رکھتے اور سیاسی طاقت کا استعمال کرتے، انھیں چھتری (کشاتریہ) کہا گیا۔ عوام، تجارت پیشہ لوگ، زراعت کرنے والے اور کاریگروں کو ویش کا نام دیا گیا۔ شودھن سے نیچ کام متعلق کر دیئے گئے تھے۔ جیسے جیسے برہمنوں کی مقامی تفریق پسندی اور اثرات بڑھتے گئے۔ ذات پات میں جو لچک پائی جاتی تھی اس میں کمی آنے لگی اور پیشہ میں تبدیلی یا پیشہ کے معاملے میں تلون مزاجی کو ناپسند کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ مختلف ذاتوں میں ہونے والی شادیوں کی اولاد نے جسے ذلیل سمجھا جاتا تھا، علیحدہ گروہوں کی شکل اختیار کر لی۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح کہ جو لوگ اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر کوئی نیا ذریعہ معاش یا پیشہ اختیار کر لیتے وہ بھی ایک علیحدہ گروہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ سماج الگ تھلگ ذاتوں کا ایک ایسا عجیب وغریب مجموعہ بن گیا جو ازروئے قانون نہ آپس میں شادیاں کر سکتا تھا اور نہ ہی ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھا پی سکتا تھا۔ (پاٹھی، رما شنکر، تاریخ قدیم ہندوستان، کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۵ء، ص، ۵۰۔۵۱)

۳۹۔ اسلام کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے، اس نے ان خرابیوں کی جو ہندو سماج میں پیدا ہو گئیں تھی یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات، اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کر دیا۔ اسلام کے اخوت کے نظریہ اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ھندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا، خصوصاً وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حقوق سے محروم تھے۔ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ (نہرو، جواہر لال، تلاش ہند، لاہور: ادارہ تخلیقات: فروری ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۲)

۴۰۔ قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم، پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۰

۴۱۔ عالمگیر کے زمانے سے مغل خاندان میں جانشینی کے لئے خانہ جنگی کی ابتداء ہوئی۔ یہ خانہ جنگیاں بہادر شاہ اوّل، جہاندار شاہ اور فرخ سیر کے زمانے میں ہوئیں۔ اس کے بعد تخت نشینی کے لئے خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہوگیا اور بادشاہ بنانے کا اختیار امراء کے ہاتھ میں آ گیا۔ ان خانہ جنگیوں کے نتیجہ میں ایک نئی صورتحال پیدا ہوئی۔ ہر شہزادے کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ بارسوخ امراء کی حمایت حاصل کر کے تخت و تاج حاصل کرے اس لیے جب کوئی شہزادہ امراء کی مدد سے بادشاہ بنتا تو یہ امراء اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات کا مطالبہ کرتے۔ (علی، مبارک، ڈاکٹر، آخری مغلیہ عہد کا ہندوستان، لاہور؛ فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳)

۴۲۔ ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی لڑائی میں ایک وسیع رقبہ پہلی مرتبہ انگریزوں کے ہاتھ آیا اور چند ہی سال میں بنگال، بہار اور اڑیسہ اور مشرقی ساحل پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ پھر ایک بہت بڑا قدم تقریباً چالیس برس بعد انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا گیا اور وہ دہلی تک جا پہنچے۔ تیسرا اہم اقدام ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی آخری شکست کے بعد اور چوتھا ۱۸۴۹ء میں جب سکھوں سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوا اور برطانوی ہند کا نقشہ مکمل ہوگیا۔ (نہرو، جواہر لال، تلاش ہند، لاہور؛ ادارہ تخلیقات، فروری ۲۰۰۴ء، ص، ۳۸۴)

۴۳۔ قریشی، اشتیاق حسین، جدوجہدِ پاکستان، کراچی؛ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء، ص، ۳۰

۴۴۔ جذبی، معین احسن، حالی کا سیاسی شعور، لاہور؛ آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء، ص، ۳۰

۴۵۔ ہنٹر، ڈبلیو۔ڈبلیو، ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم صادق حسین، لاہور؛ قومی کتب خانہ، ۱۹۵۵ء، ص ۱۹

۴۶۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید، لاہور؛ دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء، ص ۸۲

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ دتاسی، گارساں، مقالات، جلد اوّل، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۶۴ء، ص ۱۷۶

۴۹۔ تفصیل کے لئے دتاسی، گارساں، مقالات، جلد اوّل، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۶۴ء، ص ۱۷۹ تا ۱۸۸

۵۰۔ فارسی رسم الخط کے ذریعے ہندی کے سارے الفاظ لکھے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود ہندولوگوں میں بھی باآسانی یہ رسم الخط رائج ہوگیا۔ میری رائے میں اُردو کو ہر لحاظ سے ہندی پر فضیلت حاصل ہے اور یہی وہ زبان ہے جو انگریزی کے دوش بدوش برطانوی ہند کی سرکاری زبان کہی جاسکتی ہے۔ (دتاسی، گارساں، خطبات، حصہ دوم، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ج ۱۹۷۴ء، ص ۲۴۔۲۵)

۵۱۔ India Census 2001

۵۲۔ Bangladesh Bureau of Statistics, 2004; B Data Sheet updated on 2004.

۵۳۔ Federal Bureau of Statistics; website <www.spat.pak.gov.pk>

۵۴۔ محققہ کو یہ معلومات ڈاکٹر ذوالقرنین احمد المعروف شاداب احسانی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جامعہ کراچی نے بہم پہنچائی ہیں۔

۵۵۔ سورۃ الحجرات آیت ۱۳ میں ارشادِ ربانی ہے کہ:
"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، یقیناً تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، بیشک اللہ علیم و خبیر ہے"

۵۶۔ نیر، طاہرہ ڈاکٹر، اُردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، کراچی؛ انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲

۵۷۔ اقبال، محمد علامہ، کلیاتِ اقبال، ترانہ ہندی، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۸۹ء، ص، ۸۳

۵۸۔ ۱۹۱۶ء میں معاہدہ لکھنؤ، ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک حکومت خود اختیاری کی تحریک میں شانہ بشانہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے کام کیا۔ تحریک خلافت (۱۹۱۹ء) میں مہاتما گاندھی کو مسلمانوں نے اپنا لیڈر چنا۔ مگر ۱۹۲۲ء میں چوری چورا کے واقعہ کے بعد گاندھی نے تحریک خلافت کو اچانک ختم کر دیا۔ جس سے مسلمانوں کے جذبات کو زبردست ٹھیس پہنچی۔ مؤلف

۵۹۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبد الحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۹

-۲۰ Sherwani, Latif Ahmed, Speeches, Writings and Statements of Iqbal, Lahore; Iqbal Academy Pakistan, 2005, Pg.11.

باب اول

حوالہ جات:

۱۔ خورشید، عبد السلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۱؛ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء، ص ۷۱۔۷۸

۲۔ تفصیل کے لئے، خورشید، عبد السلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۸

۳۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۵۹

۴۔ ایضاً

۵۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور اس کے بجائے بھاشا زبان جاری ہو جو دیونا گری میں لکھی جائے۔ (حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، لاہور؛ دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء، ص ۸۲)

۶۔ اُردو ہندی کے تنازع کے بعد سر سید کو اس کا یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش محال ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے مسٹر شیکسپیئر، کمشنر بنارس کے سامنے بھی کیا۔ سید احمد خان کا بیان ہے کہ "انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا

ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے"۔آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشن گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشن گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔ (ایضاً ص ۸۲)

۷۔ خورشید، عبدالسلام ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۰

۸۔ اکرام، شیخ محمد، موج کوثر، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، جون ۲۰۰۳ء، ص ۸۷

۹۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، لاہور؛ دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء، ص ۹۹

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ بحوالہ صابری، تاریخ اُردو صحافت، جلد دوم، ص ۲۸۱؛ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، "صحافت پاکستان و ہند میں"، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۷

۱۲۔ مزید ناموں کیلئے خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۸؛ حجازی، مسکین ڈاکٹر، پاکستان و ہند میں مسلم ثقافت کی مختصر تاریخ، لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۲

۱۳۔ خورشید،عبدالسلام ڈاکٹر،صحافت پاکستان و ہند میں،لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۳۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۱۵۔ مولوی محرّم علی چشتی نے " کوہ نور " کی ادارت میں اپنی صحافت کا آغاز کیا۔ وہ اعلیٰ پائے کے صحافی، وکیل اور مقرر تھے۔ انھوں نے منشی ہرسکھ رائے کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور پنجاب کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اتنے نمایاں ہوئے کہ پنجاب کی قانون ساز کونسل کے رکن منتخب ہوئے (ایضاً ۱۵۱)

۱۶۔ حجازی، مسکین، ڈاکٹر، پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ، لاہور؛سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء،ص ۲۴؛خورشید،عبدالسلام،ڈاکٹر،صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۵۱

۱۷۔ موخرالذکر ایضاً ص ۱۶۲۔۱۶۳

۱۸۔ قریشی،محمد عبداللہ، "مولوی محبوب عالم اور اقبال"،منقول "اقبال ریویو"،کراچی؛ جنوری ۱۹۶۳ء،ص ۲

۱۹۔ خورشید،عبدالسلام،ڈاکٹر،صحافت پاکستان و ہند میں،لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷۳

۲۰۔ حجازی، مسکین، ڈاکٹر، پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ، لاہور؛ سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۹

۲۱۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، کاروان صحافت، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص ۴۹

۲۲۔ ایضاً ص ۵۰

۲۳۔ ایضاً ص ۵۱

۲۴۔ ایضاً ص ۵۲

۲۵۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۶۷

۲۶۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، کاروان صحافت، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص ۸۹

۲۷۔ گل، حسن وقار، مطالعہ حسرت موہانی، کراچی: گلرنگ پبلیکیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۹: مزید تفصیل کے لئے احمر لاری، مولانا حسرت موہانی، حیات و کارنامے، گورکھ پور: ۱۹۷۳ء، ص ۱۸۷

۲۸۔ Indian Annual Register (1922)، جلد اوّل ضمیمہ، ص ۷۰

۲۹۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اُردو کا حصّہ، کراچی: انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۶۸

۳۰۔ مزید تفصیل کے لئے گل، حسن وقار، مطالعہ حسرت موہانی، کراچی؛گلرنگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۷۔۲۳۲

۳۱۔ زمیندار مولوی سراج الدین (۱۱ جنوری ۱۸۵۰ء-۹نومبر ۱۹۰۹ء) نے یکم جون ۱۹۰۳ء کو جاری کیا۔ جسے بعد میں اپنے گاؤں کرم آباد منتقل کر دیا۔ مولوی سراج الدین کے انتقال کے بعد اسے ظفر علی خان نے جاری رکھا۔ ۱۹۱۱ء میں مولانا نے اسے لاہور منتقل کر دیا۔ مولانا ظفر علی خان کوٹ میرٹھ میں ۱۲۵۰ھ کے آخر میں پیدا ہوئے۔ مشن ہائی اسکول وزیرآباد سے مڈل کا امتحان پاس کیا پھر علیگڑھ میں مہندرا کالج پٹیالہ سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ایم اے او کالج علیگڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن میں دارالترجمہ سے منسلک رہے۔ یہاں کے ریاست کے ہوم آفس میں بحیثیت مترجم کام کیا اور اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک ترقی پائی۔ مولانا کو صحافت میں وسیع تجربہ تھا۔ مولانا نے دکن ریویو کی ادارت کی اس کے ساتھ ہی "بمبئے گزٹ"، "ٹائمز آف انڈیا"، "مخزن"، "زمیندار"، "پیسہ اخبار" اور "وطن" میں برابر لکھتے رہے۔ مولانا کو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مہارت تھی۔ انھوں نے متعدد انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے لارڈ کرزن کی کتاب "Gardens of Persia" کا ترجمہ "خیابان فارس" کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ معرکہ مذہب وسائنس، جنگل میں منگل، فسانہ لندن، سیر ظلمات اور اقبال کا لیکچر ملت بیضاء پر عمرانی نظر وغیرہ بھی ان کی مشہور تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں۔ (روزنامہ زمیندار اور تحریک آزادی، (توضیحی اشاریہ)، مرتبہ احمد سعید، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان؛ جون ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۔۱۳

۳۲۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان وہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸۴

۳۳۔ ایضاً ص ۱۸۹

۳۴۔ ایضاً ص ۱۳۵

۳۵۔ عقیل،، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۷۱

۳۶۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۲۱۳

۳۷۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۷۳

۳۸۔ احمد، ملک زادہ منظور، ڈاکٹر، مولانا عبدالکلام آزاد، فکر و فن، لکھنو؛ نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۸ء ص ۱۴۷

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ نگم، دیا نرائن منشی، "زمانہ" کانپور؛ جنوری ۱۹۳۱

۴۱۔ حجازی، مسکین، علی ڈاکٹر، پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ، لاہور؛ سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۸۲

۴۲۔ سید جالب دہلوی ڈاکٹر جمیل جالبی کے نانا تھے۔

۴۳۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء ص ۲۴۸

۴۴۔ ایضاً ص ۲۵۰

۴۵۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۷۶

۴۶۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۲۴۶

۴۷۔ ایضاً ص ۲۴۰؛ مہر، غلام رسول، سرگزشت مجاہدین، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ص ۲۳۶

۴۸۔ ایضاً ص ۲۴۲

۴۹۔ ایضاً ص ۲۳۴؛ مہر، غلام رسول، سرگزشت مجاہدین، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ص ۲۰۴

۵۰۔ ایضاً ص ۲۲۴

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء ص ۲۶۰

۵۳۔ ایضاً ص ۲۴۷

۵۴۔ ایضاً ص ۲۳۴

۵۵۔ ایضاً ص ۲۶۰-۲۵۹

۵۶۔ ایضاً ص ۲۴۷

۵۷۔ ایضاً ص ۲۵۰-۲۴۸

۵۸۔ ایضاً ۲۶۱

۵۹۔ ایضاً

۶۰۔ تفصیل کے لئے خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۲۶۳-۲۶۲

۶۱۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۸۲

۶۲۔ ایضاً ص ۶۸۳

۶۳۔ سید حسن ریاض مسلم لیگ کے ایک ممتاز قائد اور دیرینہ کارکن تھے۔ وہ "منشور" سے پہلے "ہمدرد"، "ہمت اور ہمدم" سے وابستہ رہ چکے تھے۔ ان کی مشہور تصنیف "پاکستان ناگزیر تھا"، تحریکِ پاکستان کے ساتھ

وابستگی اور آپ کی عالمانہ فکر کا مظہر ہے۔ کراچی یونیورسٹی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ کتاب آج بھی شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ سے شائع ہورہی ہے (حجازی، مسکین علی، ڈاکٹر، پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ، لاہور؛ سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳۔

۶۴۔ حجازی، مسکین علی، ڈاکٹر، پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ، لاہور؛ سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳

۶۵۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، کاروان صحافت، کراچی؛ انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۹ء ص ۱۷۲

۶۶۔ خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، مسلم صحافت پاک و ہند میں، کراچی؛ مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء، ص ۲۶۱

۶۷۔ ایضاً ص ۲۶۰

۶۸۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی؛ انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۸۴

۶۹۔ ایضاً ص ۶۸۵

باب دوم
حوالہ جات

۱۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، خطبات مولوی عبدالحق، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱۰

۲۔ ایضاً

۳۔ فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر، اردو قومی یکجہتی اور پاکستان، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷

۴۔ فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر، اردو قومی یکجہتی اور پاکستان، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷ بحوالہ دی پرابلم آف ہندوستانی، الہ آباد؛ ۱۹۴۴ء، ص ۳۲۔۳۴

۵۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، خطبات مولوی عبدالحق، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۴ء، ص ۲۴۵

۶۔ فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر، اردو قومی یکجہتی اور پاکستان، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱

۷۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، خطبات مولوی عبدالحق، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۴، ص ۴۳۴

۸۔ ایضاً

۹۔ سدید، انور، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۶، بحوالہ جے کینڈی، سرسید کے حالات، مترجم جمیل نقوی، برگ گل، سرسید نمبر، ۶۹۔۱۹۶۸ء، ص ۲۰

۱۰۔ سدید، انور، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی؛ انجمن ترقی اردو، پاکستان ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰۱۔۳۰۲

۱۲۔ حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، لاہور؛ دوست ایسوسی ایٹس ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۹

۱۳۔ ایضاً ص ۲۴۳

۱۴۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ذریعہ ملک میں دیسی زبان کی ایک یونیورسٹی کی تحریک کی، اس وقت اردو سرکاری زبان تھی، اس لیے ظاہر تھا کہ دیسی یونیورسٹی کے معنی اردو یونیورسٹی کے تھے، یہ سمجھ کر بعض ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ اگر اردو کی کوئی یونیورسٹی ہے، تو ہندوؤں کے لیے ہندی کا انتظام کیا جائے، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی یونیورسٹی کی تجویز ناکام رہی (ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، لاہور؛ مکتبہ عالیہ ۱۹۴۳ء، ص ۲۷۵)

۱۵۔ سدید، انور، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی؛ انجمن ترقی اردو، پاکستان ۲۰۰۴ء، ص ۳۰۴

۱۶۔ سرسید نے جغرافیائی حدود کو قومیت کی بنیاد تسلیم نہیں کیا بلکہ انھوں نے مذہب کو اس کی بنیاد قرار دیا۔ سرسید کا یہی وہ اصول تھا جو بعد میں ہندوستانی مسلم سیاست میں دو قومی نظریہ کی بنیاد بنا۔ (حسین، مظہر، علیگڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، نئی دلی؛ انجمن ترقی اردو ہند ۲۰۰۲ء، ص ۲۴۱)

۱۷۔ سدید، انور، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی؛ انجمن ترقی اردو، پاکستان ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۵

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ اعجاز، منظر، ڈاکٹر، اقبال اور قومی یکجہتی، نئی دہلی؛ جون ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۸

۲۰۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان وادب اردو، کراچی؛ رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۵۹

۲۱۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جدید شاعری کی جو تحریک انجمن پنجاب کے تحت پیدا کی تو اس میں حب وطن کے جذبے کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی اور مظاہر وطن کی فطری تصویر کشی اس تحریک کی غالب جہت بن گئی۔ (سدید، انور، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۵)؛ اختر سلیم ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، آغاز سے ۲۰۰۰ء تک، لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۴۸؛ سمیع اللہ، ڈاکٹر، انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے، سلطان پور؛ ۱۹۸۸ء ص ۳۸۵؛
Urdu/Hindi: An Artificial Divide, Abdul Jamil Khan, Algora Publishing, New York, p.214

۲۲۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان وادب اردو، کراچی؛ رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۶۵

۲۳۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۳۷۱

۲۴۔ مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤاجداد بلبن کے عہد میں ہندوستان آئے تھے اور شاہی خدمت سے منسلک ہو گئے تھے، ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے، ان کے آباؤاجداد کی جاگیریں زمانہ برد ہو گئیں تھیں۔ حالی نے ابتدائی تعلیم مروجہ نظام کے تحت حاصل کی اور پھر دہلی تشریف لے گئے جہاں اکابر شعراء اور علماء کی صحبت سے فیض پایا جن میں ذوق، غالب، صہبائی اور آزردہ شامل تھے۔ غالب کی آپ نے باقاعدہ شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انجمن پنجاب سے شعری ذوق کو تسکین حاصل ہوئی اور شاعری کی جہت کو مختلف زاویہ ملا۔ حالی کا انتقال ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ہوا۔

۲۵۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان وادب اردو، کراچی؛ رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۶۵۷

۲۶۔ مصطفیٰ، غلام، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء، کراچی؛ شہرزاد، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ جذبی، معین احسن، حالی کا سیاسی شعور، لاہور؛ آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۹۴ بحوالہ کلیات نظم حالی، جلد اوّل، ص ۹۰

۲۹۔ ایضاً حوالہ بالا، ص ۱۱۰

۳۰۔ جذبی، معین احسن، حالی کا سیاسی شعور، لاہور؛ آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۹۷

۳۱۔ حسین، مظہر، علیگڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، نئی دلی؛ انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۲ء، ص ۲۶۴

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۴۲

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۴۳

۳۴۔ جذبی، معین احسن، حالی کا سیاسی شعور، لاہور؛ آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۱۸۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔۱۸۵ بحوالہ مکاتیب حالی ص ۵۴

۳۶۔ سرسید نے مسدس کے نسخے دیکھنے کے بعد ایک جامع تبصرہ تحریر کیا ہے۔ تفصیل متن کے لیے دیکھئے علیگڑھ میگزین جنوری ۱۹۳۹ء

۳۷۔ مصطفیٰ، غلام، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء، کراچی؛ شہرزاد ۲۰۰۳ء، ص ۳۵

۳۸۔ جذبی، معین احسن، حالی کا سیاسی شعور، لاہور؛ آئینہ ادب ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۱

۳۹۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۳۷۴

۴۰۔ مسدس حالی، ص ۳۹

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۴

۴۲۔ بنکم چندر چیٹر جی کے ناول "آنند مٹھ سے بندے ماترم کا ترانہ لیا گیا تھا۔ اس گیت کے چھ بند ہیں اور اس کے ۳۵ مصرعوں میں سے ۲۸ مصرعے سنسکرت زبان کے ہیں۔ اس ناول کا مضمون ہی مسلمان دشمنی تھا۔ مسلمان اس ترانے کو قبول کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھے۔ چنانچہ یہ ہندو مسلم تنازعے کا باعث بنا۔ اس ترانے میں درگا، لکشمی اور سرسوتی دیویوں کو ماں کہہ کر پکارا گیا تھا۔ یہ سب بول خالص ہندو قومی تحریک کے نمائندے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسکا اعتراف کیا تھا کہ بندے ماترم کے بعض حصے واقعی مسلم آزار ہیں۔ (قریشی، سمیع اللہ، قیام پاکستان کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر، لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۷۸۔۷۹)

۴۳۔ سعید، خالد بن ، 'Pakistan the Formative Phase'، کراچی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء، ص ۵۰۴

۴۴۔ نیّر، طاہرہ، ڈاکٹر، اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۷۸

۴۵۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۳۷۵

۴۶۔ مولانا شبلی نعمانی ۸ مئی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم قدیم طریقے پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ کے قصبے بندول میں حاصل کرنے کے بعد اعظم گڑھ کے عربی مدرسے اور پھر جونپور کے مدرسہ حنفیہ میں عربی، فارسی اور مذہبی علوم کی تعلیم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے بعد اپنے والد کے حکم سے مولانا فاروقی کیفی چڑیا کوٹی کے پاس گئے۔ انھوں نے شبلی کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور ان میں اسلامی علوم کی ایسی بصیرت پیدا کر دی جس کی وجہ سے شبلی کو اپنے تمام معاصر مذہبی علماء پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ شبلی نے لکھنؤ کے مولانا عبدالحیٔ فرنگی محل، مولانا ارشاد حسین مجددی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۳ء میں علیگڑھ سے منسلک ہو گئے اور تقریباً ۱۶ سال بعد اس سے علیحدگی اختیار کی۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ سے منسلک ہو گئے۔ شبلی قدیم و جدید تعلیم کے ہمنوا تھے ۱۹۱۳ء میں اختلافات کی وجہ سے اس سے علیحدگی اختیار کی۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ (انجم، خلیق، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، نئی دلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء، ص ۹)؛ مزید تفصیل کے لیے صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان و ادب اردو، کراچی: رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۷۶۔۵۸۰

۴۷۔ ندوی، سلیمان، حیات شبلی، لاہور؛ مکتبہ عالیہ، ۱۹۴۳ء، ص ۲۲۲

۴۸۔ سدید، انور، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی؛ انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص ۳۲۷

۴۹۔ صدیقی، کمال احمد، ڈاکٹر، شبلی اور سرسید، مرتبہ خلیق انجم، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، نئی دلّی؛ انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء، ص ۲۴

۵۰۔ ندوی، سید سلیمان، کلیات شبلی، کراچی؛ اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۵ء، ص ۳۴

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۵

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۹

۵۳۔ ایضاً، ص ۴۶۔۴۷

۵۴۔ ندوی، سید سلیمان، مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں، کراچی؛ اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۵ء، ص ۲۱

۵۵۔ ندوی، سید سلیمان، کلیات شبلی، کراچی؛ اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۵ء، ص ۵۵

۵۶۔ ایضاً، ص ۵۶

۵۷۔ ایضاً، ص ۶۳

۵۸۔ بدایونی، شمس، ڈاکٹر،شبلی بحثیت اردو شاعر، مرتبہ خلیق انجم،شبلی کی علمی وادبی خدمات، نئی دلّی؛انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۹۶ء، ص ۲۱۱

۵۹۔ ندوی، سید سلیمان، مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں، کراچی؛اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۸۵ء،ص ۲۶۔۲۷

۶۰۔ بدایونی، شمس، ڈاکٹر،شبلی بحثیت اردو شاعر، مرتبہ خلیق انجم،شبلی کی علمی وادبی خدمات، نئی دلّی؛انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۹۶ء، ص ۲۱۸۔۲۱۹

۶۱۔ قریشی، اشتیاق حسین، جدوجہد پاکستان، کراچی؛شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی،۱۹۹۹ء، ص ۴۷

۶۲۔ انصاری، ضیاء الدین، ڈاکٹر،شبلی کے سیاسی افکار، مرتبہ،خلیق انجم،شبلی کی علمی وادبی خدمات، نئی دلّی؛انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۹۶ء،ص ۱۶۷

۶۳۔ ندوی، سید سلیمان، کلیات شبلی، کراچی؛اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۸۵ء،ص ۹۷

۶۴۔ ایضاً، ص۱۰۴

۶۵۔ ایضاً، ص۱۰۵

۶۶۔ ایضاً، ص۱۰۶

۶۷۔ انصاری، ضیاء الدین، ڈاکٹر، شبلی کے سیاسی افکار، مرتبہ، خلیق انجم، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، نئی دلّی؛ انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۹

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۶۹۔ ندوی، سید سلیمان، کلیات شبلی، کراچی؛ اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۸

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۷۱۔ ایضاً، ص ۹۱

۷۲۔ انصاری، ضیاء الدین، ڈاکٹر، شبلی کے سیاسی افکار، مرتبہ، خلیق انجم، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، نئی دلّی؛ انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۶ء، ص ۱۵۸

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۷۴۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان و ادب اردو، کراچی؛ رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۸۷

۷۵۔ حسین، مظہر، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، نئی دلّی؛ انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۲ء، ص ۲۸۳

۷۶۔ مہدی، مظہر، اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات، نو آبادیاتی ہندوستان، ۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۴

۷۷۔ نیر، طاہرہ، ڈاکٹر، اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۸۰

۷۸۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان و ادب اردو، کراچی؛ رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۹۴

۷۹۔ مہدی، مظہر، اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات، نوآبادیاتی ہندوستان، دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۴

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۸۱۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۳۹۰

۸۲۔ نیر، طاہرہ، ڈاکٹر، اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۸۲

۸۳۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید اور ان کے رفقائے کار، علیگڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۱ء، ص ۳۰۰

۸۴۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۳۹۵

۸۵۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان و ادب اردو، کراچی؛ رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۶۴۸۔۶۴۹

۸۶۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، ھندی اردو تنازع، اسلام آباد؛ نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۶ء، ص ۲۶۰

۸۷۔ ریاض، سید حسن، پاکستان ناگزیر تھا، کراچی؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۰

۸۸۔ قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۳۸۲

۸۹۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۴۴۳

۹۰۔ ایضاً، ص ۴۴۶

۹۱۔ ایضاً، ص ۴۴۳

۹۲۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان وادب اردو، کراچی؛ رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۷۰۱

۹۳۔ ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، حسرت موہانی کی شخصی عظمت، کراچی؛ مجلّہ بیاد مولانا حسرت موہانی، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۱۷

۹۴۔ گورکھپوری، مجنون، پروفیسر، آزادی کا شیدائی ۔ حسرت موہانی، کراچی؛ مجلّہ بیاد مولانا حسرت موہانی، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۸

۹۵۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۴۵۴

۹۶۔ ایضاً

۹۷۔ مولانا حسرت موہانی ۱۹۳۸ء میں باقاعدہ مسلم لیگ کے ممبر بن چکے تھے (گورکھپوری، مجنون، پروفیسر، آزادی کا شیدائی - حسرت موہانی، کراچی؛ مجلہ بیاد مولانا حسرت موہانی، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۸)

۹۸۔ تفصیل کے لیے پیرزادہ، شریف الدین، Fondations of Pakistan، جلد دوم، کراچی؛ نیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۰ء، ص ۳۹۰۔۳۹۱

۹۹۔ حسرت موہانی، اردوئے معلیٰ، جنوری ۱۹۴۲ء، نیز تفصیلات کے لیے عبدالشکور، ص ۲۸۔۲۹

۱۰۰۔ خان، مسعود حسین، اردو ادب میں قومی یکجہتی، مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، دہلی؛ اردو اکادمی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۲

۱۰۱۔ اقبال، محمد علامہ، کلیات اقبال، نیا شوالہ، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۹ء، ص ۸۸

۱۰۲۔ اقبال، محمد علامہ، کلیات اقبال، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۹ء، ص ۸۷

۱۰۳۔ ایضاً، ترانہ ہندی، ص ۸۳

۱۰۴۔ اقبال، جاوید، مئے لالہ فام، علامہ اقبال کے مقالات کا مجموعہ، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۳ء، ص ۸۵

۱۰۵۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۷

۱۰۶۔ اقبال، محمد علامہ، کلیات اقبال، وطنیت، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۰

۱۰۷۔ اقبال، جاوید، لیکچر، فکر اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاسیات حاضرہ کا جائزہ، ۲۱ اپریل ۱۹۸۵ء، مرتب، مئے لالہ فام، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۳ء، ص ۱۸

۱۰۸۔ اقبال، محمد علامہ، کلیات اقبال، وطنیت، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۱

۱۰۹۔ اقبال، محمد علامہ، کلیات اقبال، ترانہ ملی، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۹

۱۱۰۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۵

۱۱۱۔ اقبال، جاوید، مئے لالہ فام، علامہ اقبال کے مقالات کا مجموعہ، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۳ء، ص ۹۱۔۹۲

۱۱۲۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۴۰۷

۱۱۳۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، کراچی؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۰

۱۱۴۔ Sherwani 'Latif Ahmed' Speeches, writings and statements of Iqbal, Lahore; Iqbal Academy Pakistan, 2005, p.115

۱۱۵۔ Sherwani 'Latif Ahmed' Speeches, writings and statements of Iqbal, Lahore; Iqbal Academy Pakistan, 2005, p.11

۱۱۶۔ مولانا حسین احمد مدنی (۱۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء تا ۶ دسمبر ۱۹۵۷ء)، کا اصل نام چراغ محمد اور آبائی موضع الداد پور تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۳۰۹ھ میں بارہ برس کی عمر میں دیوبند میں داخل ہوئے۔ صرف سات سال کے عرصہ میں جملہ علوم متداولہ سے فارغ ہو کر مولانا رشید احمد گنگوہی کی بیعت کی۔ ۱۳۱۴ھ میں والد کے ساتھ حجاز ہجرت کی اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ ۱۳۲۶ھ تک مسلسل حجاز میں قیام کیا۔ اس کے بعد دوبارہ ہندوستان تشریف لائے۔ جمیعت الانصار، معتمر الانصار اور دارالعلوم دیوبند کے جلسہ ہائے دستار بندی آپ ہی کی جدوجہد کے رہین منت ہے۔ آپ متحدہ قومیت اور ہندوستان کی مکمل آزادی کے حامی تھے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ آپ نے دسمبر ۱۹۲۳ء کو کناڈا میں جمیعت العلماء ہند کے پانچویں مرکزی اجلاس عام کی صدارت کے دوران کیا۔ آپ نے ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا اور ساردا ایکٹ کی بھی سخت مخالفت کی۔ آپ کی چند ایک تصانیف کے علاوہ کچھ رسائل، مکتوبات اور خطبات بھی ہیں۔ آپ کے مکتوبات کو مولانا نجم الدین اصلاحی نے " مکتوبات شیخ الاسلام " کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا ہے۔ آپ کی تصانیف الشہاب الثاقب، اسیر مالٹا، متحدہ قومیت اور نقش حیات ہیں۔ {روزینہ، پروین، جمعیت العلماء ہند (دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۵ء)، جلد دوم، اسلام آباد؛ قومی ادارہ برائے تحقیق و ثقافت، ۱۹۸۱ء، ص ۸۴۷۔۸۴۸

۱۱۷۔ اقبال، محمد علامہ، کلیات اقبال (ارمغان حجاز)، حسین احمد مدنی (قطعہ)، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۹ء، ص ۴۹

۱۱۸۔ آپ جمیعت علماء ہند، مجلس عاملہ کے رکن تھے۔

۱۱۹۔ ان انتہا پسندوں میں ہردیال اور لالہ لاجپت رائے قابل ذکر ہیں۔

۱۲۰۔ قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم، پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۳۶۹

۱۲۱۔ ایضا، ص ۳۲۵

۱۲۲۔ تفصیلات کے لیے معین الدین عقیل، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ص ۶۸۵ تا ۷۳۶

باب سوم

حوالہ جات:

۱۔ عثمانی، مفتی عتیق الرحمن، مولانا، نظرات، برہان، جلد دہم شمارہ (۳) مارچ ۱۹۴۳ء، ص ۱۶۲

۲۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۴

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۴۔ بھگتی تحریک کی ابتدا بارھویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند میں ہوئی۔ یہ تحریک تصوف کی ہندوستانی شکل تھی۔ اس کے بانی سوامی رامانج (۱۰۱۶ء۔۱۱۳۷ء) مادھو (۱۱۹۹ء۔۱۲۷۸ء)، آنند تیرتھ، وشنو سوامی اور باسو تھے۔ بھگتی کے اصول یہ تھے۔ ایشور سے لو لگانا، جگ میں جگدیو کی چمک دمک اور روپ میں سروپ کی جھلک دیکھنا، بھگوان اور اللہ، رام اور رحیم کو ایک سمجھنا، سب آدمیوں سے چاہے وہ چمار چنڈال ہو یا ترک افغان، پریم کرنا، اور پریم راگ کی نوبت بجانا، اونچ نیچ اور ذات پات کے فرق کو نہ ماننا، پوجا پاٹ، جنتر منتر تیرتھ جاترا، گنگا اشنان، برت بھوگ، تلک مالا اور دکھاوے کی دوسری رسموں سے انکار کرنا، بھائی چارے اور میل ملاپ کو دھرم بنانا، کسی کو دکھ نہ دینا، بلکہ دکھیوں کی سیوا کرنا، دھن دولت کا موہ نہ کرنا، من کی جوت جگانا اور تن کے سکھ پر دھیان نہ دینا، سرکار دربار سے دور رہنا اور گیان دھیان کے دیپک جلانا۔ جنوبی ہند کے بعد شمالی ہند میں اس کی ترویج کرنے والے رامانند تھے۔ (حسن، سبط، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی؛ مکتبہ دانیال ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۸)

۵۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۴

۶۔ نظریہ پاکستان نمبر، چراغ راہ، کراچی؛ ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۵

۷۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۴

۸۔ ملا عبدالقادر بدایونی اکبر کا پیش نماز تھا۔

۹۔ برکے، ایس ایم، اکبرنامہ، مترجم مفتی، مسعود، لاہور؛ علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۳

۱۰۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۵

۱۱۔ خواجہ باقی باللہ کا تعلق نقشبندیہ سلسلہ سے تھا۔

۱۲۔ نظریہ پاکستان نمبر، چراغ راہ، کراچی؛ ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۹

۱۳۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، علماء میدان سیاست میں، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء، ص ۹۷

۱۴۔ اکرام، شیخ محمد، رودکوثر، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۱

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹۰

۱۷۔ نظریہ پاکستان نمبر، چراغ راہ، کراچی؛ ۱۹۶۰ء، ص ۱۴۰

۱۸۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم، پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۴

۱۹۔ نظریہ پاکستان نمبر، چراغ راہ، کراچی؛ ۱۹۶۰ء، ص ۱۹۰

۲۰۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۵

۲۱۔ ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید، حصہ اول، خواجہ بک ڈپو، اردو بازار، ۱۹۵۸ء، ص ۳۵۔۳۶

۲۲۔ اکرام، شیخ محمد، رودکوثر، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۵ء، ص ۳۲۵

۲۳۔ جاوید، قاضی، ہندی مسلم تہذیب، لاہور؛ تخلیقات، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۴

۲۴۔ اکرام، شیخ محمد، رود کوثر، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۵ء، ص ۳۲۴

۲۵۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۵

۲۶۔ اکرام، شیخ محمد، رود کوثر، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، جون ۲۰۰۵ء، ص ۴۴۶

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۶

۲۹۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۶۵

۳۰۔ شاہ ولی اللہ کے والد شیخ عبدالرحیم علمائے دین کے ایک معزز خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے آباؤ اجداد درس و تدریس سے منسلک رہے۔ آپ کے والد شیخ عبدالرحیم نے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کیا۔ جس نے ہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے علم حدیث کے کام کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ شاہ عبدالرحیم نے اپنے عہد کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کے لیے شیخ کی خدمات حاصل کیں لیکن نقطۂ نظر کے اختلاف کے باعث جلد ہی علیحدہ ہو گئے۔ شیخ نقشبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے اپنے بیٹے شاہ ولی اللہ کی انہی خطوط پر تربیت کی۔ شاہ ولی اللہ ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی نام قطب الدین احمد تھا۔

رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی اور فارسی کتب کا مطالعہ کیا اور صرف ونحو کے مسائل کی تعلیم حاصل کی۔ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد سے بیعت ہوئے اور اشغال صوفیاء خصوصاً نقشبندیہ کے اشغال کی جانب توجہ دی۔ والد کی وفات کے بعد ۱۷۱۹ء میں سولہ برس کی عمر میں مدرسہ رحیمیہ سے منسلک ہوگئے۔ ۱۷۳۱ء تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور علم حدیث کا درس دیتے رہے۔ اس کے بعد فریضہ حج کے لیے چلے گئے۔ سفر حجاز انقلاب مضمرات کا حامل ثابت ہوا اور آپ نے واپس آکر ہندی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کام کیا۔ (جاوید، قاضی، ہندی مسلم تہذیب، لاہور؛ تخلیقات، جولائی ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۵۔۲۱۹)

۳۱۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۲۸

۳۲۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۴۸؛ تفہیمات الٰہیہ، جلد اوّل، ص ۱۲۰

۳۳۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۲۹

۳۴۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، کراچی؛ دارالاشاعت، ۲۰۰۵ء، ص ۸۵

۳۵۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۳۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۳۰؛ التفہیمات الالہیہ، جلد اوّل، ص ۲۱۳ و بعدہ؛ نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، لاہور؛ ادارہ اسلامیات، ۱۹۷۸ء، ص ۴۲۔۴۴

۳۷۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۳۴

۳۸۔ صہیب، ناعمہ، تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات، کراچی؛ فضل سنز لمیٹڈ، اگست ۲۰۰۶ء، ص ۲۹۱

۳۹۔ ولی اللہ، شاہ، تفہیمات الہیہ، ص ۲۱۷، سن ندارد

۴۰۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ہندوستان میں علم حدیث کی بنیاد ڈالی۔ شاہ عبدالرحیم جنہوں نے شیخ سے علم فیض حاصل کیا۔ ایک مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد رکھی۔ جہاں علم حدیث کی تعلیم دینا شروع کی۔ آپ کی اس کاوش سے ہندوستان میں علم حدیث کا چرچا ہوا اور طلبا کی ایک کثیر تعداد اس علم کے حصول کے لیے اس مدرسہ سے فیض حاصل کرنے لگی۔ اس طرح مسلمانوں میں ایک قسم کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک کو سربلندی تک پہنچانے والے شاہ عبدالرحیم کے بیٹے شاہ ولی اللہ تھے۔ (دہلوی، مولانا رحیم بخش، حیات ولی، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، لاہور؛ مکتبہ طیبہ بلال گنج ۱۹۷۲ء، ص ۳۰۴

۴۱۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۶؛ بحوالہ البلاغ المبین (اصل) ص ۱

۴۲۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۶؛ بحوالہ ولی اللہ، وصیت نامہ، ص ۷

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ ایضاً،ص ۲۴۸

۴۵۔ ایضاً،ص ۲۵۰

۴۶۔ ان کتب کی مختصر تفصیل خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات سے لی گئی ہے۔مزید تفصیل کے لیے ص ۲۱۵۔۲۲۱

۴۷۔ تفصیل کے لیے اکرام، شیخ محمد، رودکوثر، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، جون ۲۰۰۵ء، ص ۵۹۶

۴۸۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۰

۴۹۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید کو حجۃ الاسلام کہتے تھے اوران کے علم وفضل کی بہت تعریف کرتے تھے۔ (ندوی، ابوالحسن، سیرت سید احمد شہید، کراچی؛ سعید ایچ ایم کمپنی ۱۹۷۴ء، ص ۱۱۷)

۵۰۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۴۹

۵۱۔ اکرام، شیخ محمد، رودکوثر، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، جون ۲۰۰۵ء، ص ۵۹۷

۵۲۔ شاہ عالم ۱۸۰۴ء میں انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو چکا تھا۔

۵۳۔ ندوی، ابوالحسن، سیرت سید احمد شہید، حصہ اول، لاہور؛ خواجہ بک ڈپو، جنوری ۱۹۵۸ء، ص ۲۳

۵۴۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۰۔۲۵۱؛ عبدالعزیز، جلد اول، ص ۱۶۔۱۷

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۵۲

۵۷۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۵۱

۵۸۔ سید احمد شہید کے اس خط سے جو انہوں نے شہزادہ کامران کو لکھا تھا، واضح اظہار ہوتا ہے کہ اس جہاد سے آپ کا اصلی مقصود ہندوستان تھا، جو بتدریج انگریزوں کے قبضے میں چلا جا رہا تھا، خط میں تحریر فرماتے ہیں، "اس مہم (سرحد و پنجاب) سے فراغت کے بعد یہ خاکسار مع مجاہدین وصادقین کفر وطغیان کے ازالے کی نیت سے ملک ہندوستان کی طرف متوجہ ہوگا کہ وہی مقصود اصلی ہے۔" (ندوی، سید ابوالحسن علی، مولانا تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم، کراچی؛ مجلس نشریات اسلام ۱۹۸۴ء، ص ۳۷۰)

۵۹۔ مجاہدین ہندوستان میں بڑھی ہوئی آزاد طاقت تھی اور جس کو کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا اور جس کو منظم کر کے انگریزوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں لایا جا سکتا تھا۔ (ندوی، سید ابوالحسن علی، مولانا تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم، کراچی؛ مجلس نشریات اسلام ۱۹۸۴ء، ص ۳۷۱)

۶۰۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۶۔۲۵۷

۶۱۔ پشاور کے سردار یار محمد خان نے پہلے سید احمد کو زہر دلوادیا تھا، سوری، جلد دوم، ص ۳۴۱

۶۲۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۹

۶۳۔ مہر، غلام رسول، سید احمد شہید، جلد اول، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۶۴ء، ص ۳۷۵

۶۴۔ قریشی، اشتیاق، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۶۸

۶۵۔ تفصیلات کے لیے، مہر، غلام رسول، سرگزشت مجاہدین، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ص ۳۷۱۔۴۲۵؛ ندوی، مسعود عالم، ہندوستان کی پہلی سیاسی تاریخ، ص ۱۲۷۔۱۷۱، سن ندارد

۶۶۔ مہر، غلام رسول، سرگزشت مجاہدین، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ص ۲۰۸، سن ندارد

۶۷۔ ایضاً ص ۱۶۳

۶۸۔ سورۃ الحج آیت ۴۱

۶۹۔ گیلانی، سید اسعد، "اسلامی ریاست میں حکام کے اوصاف" مرتب حکیم محمد سعید، تصور ریاست اسلامی مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۸۳ء، ص ۲۴۸

۷۰۔ ایضاً ص ۲۸۵

۷۱۔ عثمانی، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا، نظرات، برھان، جلد دہم، شمارہ (۳)، دہلی؛ مارچ ۱۹۴۳ء، ص ۱۶۲

۷۲۔ ایضاً ص ۱۶۳

۷۳۔ برہان ص ۱۶۴

۷۴۔ القرآن سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۳

۷۵۔ القرآن سورۃ انعام آیت ۵۷

۷۶۔ القرآن سورۃ یوسف آیت ۴۰

۷۷۔ القرآن سورۃ اعراف آیت ۳

۷۸۔ القرآن سورۃ الناس

۷۹۔ رحمٰن، گوہر، مولانا، اسلامی سیاست، مردان؛ دارالعلوم تفہیم القرآن، جون ۱۹۹۵ء، ص ۵۰

۸۰۔ ایضاً ص ۵۰

۸۱۔ القرآن سورۃ النمل آیت ۳۴

۸۲۔ القرآن سورۃ القصص آیت ۸۳

۸۳۔ رحمٰن، گوہر، مولانا، اسلامی سیاست،، مردان؛ دارالعلوم تفہیم القرآن، جون ۱۹۹۵ء، ص ۵۲

۸۴۔ دہلوی، عبدالرحمٰن، مولانا، مقدمہ تاریخ ابن خلدون، لاہور؛ الفیصل ۲۰۰۵ء، ص ۲۸۷

۸۵۔ رحمٰن، گوہر، مولانا، اسلامی سیاست، مردان؛ دارالعلوم تفہیم القرآن، جون ۱۹۹۵ء، ص ۵۳

۸۶۔ نجار، عبدالوہاب، قصص الانبیاء، طبع قاہرہ؛ ۱۹۶۶ء ص ۱۸۲

۸۷۔ ندوی، سید سلیمان، ارض القرآن، کراچی؛ دارالاشاعت، ۱۹۷۵ء ص ۳۶۵

۸۸۔ آزاد، ابوالکلام، ترجمان قرآن، ج دوم، ص ۴۶۲

۸۹۔ بان، گستاؤلی، ڈاکٹر، تمدن ہند، مترجم سید علی بلگرامی، کراچی؛ بک لینڈ ۱۹۶۲ء، ص ۲۳۹

۹۰۔ احمد، نثار، ڈاکٹر، عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء، کراچی؛ ۱۹۷۶ء، ص ۱۷ بحوالہ

Beyce, James Viscount, The Holy Roman Empire, MacMillan and Co Ltd. London; 1950, p.xxxi

۹۱۔ احمد، نثار، ڈاکٹر، عہد نبوی میں ریاست کا نشو و ارتقاء، کراچی؛ ۱۹۷۶ء، ص ۱۸

۹۲۔ Webster's Biographical Dictionary. G & C Marian Co. USA

۹۳۔ احمد، نثار، ڈاکٹر، عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء، کراچی؛ ۱۹۷۶ء، ص ۱۹، بحوالہ بلنچلی "حکمران کے اختیار و اقتدار کے لیے، ص ۳۸۸

۹۴۔ احمد، نثار، ڈاکٹر، عہد نبوی میں ریاست کا نشوو ارتقاء، کراچی؛ ۱۹۷۶ء، ص ۱۹ بحوالہ Gibbon vol-II pg.752

۹۵۔ ایضاً

۹۶۔ ایضاً، ص ۲۰

۹۷۔ ایضاً

۹۸۔ ایضاً

۹۹۔ Briffault, Robert, The making of Humanity, Allen and Unwin Ltd London; 1928, p.159

۱۰۰۔ ندوی، سید ابوالحسن، مولانا، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، کراچی؛ مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۲ء ص ۴۳

۱۰۱۔ ایضاً

۱۰۲۔ میکیاؤلی کے نظریات و افکار کو جاننے کے لیے Renaissance از ول ڈیورائٹ جس کا اردو ترجمہ یاسر جواد نے کیا ہے دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۰۳۔ "دی پرنس" کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہوا۔ اردو زبان میں اسکا ترجمہ "بادشاہ" کے نام سے کیا گیا۔ اس کتاب کو اردو زبان کے قالب میں ڈھالنے والے ڈاکٹر محمود حسین تھے۔

۱۰۴۔ میکیاؤلی، نکولو، دی پرنس، ترجمہ بادشاہ از ڈاکٹر محمود حسین، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۲۰۰۰ء، ص ۵۷

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۹۳

۱۰۶۔ کیلانی، عبدالرحمٰن، مولانا، خلافت و جمہوریت، لاہور؛ مکتبہ الاسلام، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۰

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۱۶۶

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۱۰۹۔ شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، لاہور؛ سنگ میل پبلیکیشنز، ۳۱واں ایڈیشن، ۲۰۰۵ء، ص ۷۹۷

۱۱۰۔ کیلانی، عبدالرحمٰن، مولانا، خلافت و جمہوریت، لاہور؛ مکتبہ الاسلام، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۱

۱۱۱۔ سعید، حکیم محمد، تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۸۲، ص ۱۲

۱۱۲۔ ایضاً

۱۱۳۔ القرآن سورۃ المائدہ آیت ۱۸

۱۱۴۔ حیدری، کرم، پروفیسر، ریاست کا قرآنی تصور، کراچی: مرتب، حکیم محمد سعید، تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، مکتبہ ہمدرد پریس کراچی، ۱۹۸۲ء ص: ۹۳

۱۱۵۔ القرآن سورۃ زمر آیت ۴۴

۱۱۶۔ القرآن سورۃ توبہ آیت ۱۱۶

۱۱۷۔ حیدری، کرم، پروفیسر، ریاست کا قرآنی تصور، کراچی؛ مرتب، حکیم محمد سعید، تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، مکتبہ ہمدرد پریس کراچی، ۱۹۸۲ء ص: ۴۰

۱۱۸۔ القرآن سورۃ انعام آیت ۵۷

۱۱۹۔ القرآن سورۃ قصص آیت ۸۸

۱۲۰۔ اکرام الرحمٰن، محمد، پروفیسر، تصور ریاست اسلامی تعلیمات قرآنی کی روشنی میں، کراچی، مرتب حکیم محمد سعید، تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ۱۹۸۲ء، ص ۷۸

۱۲۱۔ القرآن سورۃ فاطر آیت ۱۳

۱۲۲۔ القرآن سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۱۱

۱۲۳۔ القرآن سورۃ الکہف آیت ۲۶

۱۲۴۔ القرآن سورۃ اعراف آیت ۵۴

۱۲۵۔ القرآن سورۃ النساء آیت ۱۰۵

۱۲۶۔ القرآن سورۃ المائدہ آیت ۴۹

۱۲۷۔ اکرام الرحمٰن، محمد، پروفیسر، تصورریاست اسلامی تعلیمات قرآنی کی روشنی میں، کراچی، مرتب حکیم محمد سعید، تصورریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ۱۹۸۲ء، ص ۸۰

۱۲۸۔ القرآن سورۃ النساء آیت ۱۱۵

۱۲۹۔ ایضاً آیت ۶۵

۱۳۰۔ اکرام الرحمٰن، محمد، پروفیسر، تصورریاست اسلامی تعلیمات قرآنی کی روشنی میں، کراچی، مرتب حکیم محمد سعید، تصورریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ۱۹۸۲ء، ص ۸۰

۱۳۱۔ ایضاً ص ۸۱

۱۳۲۔ کیلانی، عبدالرحمٰن، مولانا، خلافت وجمہوریت، لاہور؛ مکتبہ الاسلام، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۰

۱۳۳۔ ایضاً ص ۲۲۸

۱۳۴۔ ایضاً ص ۲۲۳

۱۳۵۔ القرآن سورۃ الحجرات، آیت ۴۹

۱۳۶۔ القرآن سورۃ الاحزاب، آیت ۴۵

۱۳۷۔ کیلانی، عبدالرحمٰن، مولانا، خلافت و جمہوریت، لاہور؛ مکتبہ الاسلام، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۴

۱۳۸۔ ایضاً

۱۳۹۔ القرآن سورۃ الحجرات آیت ۱۰

۱۴۰۔ کیلانی، عبدالرحمٰن، مولانا، خلافت و جمہوریت، لاہور؛ مکتبہ الاسلام، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۴

۱۴۱۔ ایضاً ۲۳۵

۱۴۲۔ کاندھلوی، محمد مالک، مولانا، تصورریاست اسلامی تعلیمات نبوی میں، مرتب حکیم محمد سعید، تصورریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ۱۹۸۲ء ص ۱۳۵

۱۴۳۔ ایضاً

۱۴۴۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۱۴۵۔ ایضاً

۱۴۶۔ القرآن سورۃ نور آیت ۵۵

۱۴۷۔ القرآن سورۃ النحل آیت ۴۱

۱۴۸۔ کاندھلوی، محمد مالک، مولانا، تصور ریاست اسلامی تعلیمات نبوی میں، مرتب حکیم محمد سعید، تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ۱۹۸۲ء ص ۱۳۶

۱۴۹۔ القرآن سورۃ الحج، آیت ۳۹

۱۵۰۔ کاندھلوی، محمد مالک، مولانا، تصور ریاست اسلامی تعلیمات نبوی میں، مرتب حکیم محمد سعید، تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ۱۹۸۲ء ص ۱۳۶

۱۵۱۔ ایضاً ص ۱۳۷

۱۵۲۔ ایضاً

۱۵۳۔ انوارالحق، شیخ، جسٹس (ریٹائرڈ)، تصور ریاست اسلامی تعلیمات قرآنی کی روشنی میں، مرتب حکیم محمد سعید، تصور ریاست اسلامی، مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، کراچی؛ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ۱۹۸۲ء ص ۲۷

باب چہارم

حوالہ جات

۱۔ کامران، جیلانی، قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۷

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۵۔ ایضاً

۶۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۴۔۳

۷۔ ایضاً، ص ۴

۸۔ ایضاً، ص ۷

۹۔ خطبہء صدارت ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مغربی پاکستان اُردو کانفرنس، ۱۹۵۹ء

۱۰۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۸

۱۱۔ قیامِ پاکستان کے وقت دو ہی یونیورسٹیاں پاکستان کے حصے میں آئیں تھیں۔ ایک پنجاب یونیورسٹی اور دوسری ڈھاکہ یونیورسٹی، جو مشرقی پاکستان میں تھی

۱۲۔ روداد کے لئے عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۳۸۔۳۹

۱۳۔ اُردو کانفرنس کے انعقاد کی غرض (قلمی مسودہ) ۹ فروری ۱۹۴۸ء کو مجلس استقبالیہ کے پہلے اجلاس میں پڑھا گیا

۱۴۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱

۱۵۔ عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۴۷

۱۶۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲

۱۷۔ عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۴۷

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ جالبی، جمیل ڈاکٹر، قومی زبان، یک جہتی، نفاذ اور مسائل، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۸

۲۱۔ مکمل روداد کے لئے، ذوالفقار، غلام حسین ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، جلد دوم۔ حصہ اوّل، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۔۳۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۵

۲۴۔ کامران، جیلانی، قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۰

۲۵۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۲ء، ص ۴۱

۲۶۔ آبادی، ہاشمی فرید سید، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو، کراچی؛ انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۰۔۲۴۸

۲۷۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصہ اوّل اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۴۸۔۴۹

۲۸۔ ایضاً،ص۴۹

۲۹۔ عبداللہ،سید،تحریک نفاذِ اُردو،اسلام آباد؛مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵، ص ۵۰

۳۰۔ کامران جیلانی،قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان،اسلام آباد؛مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۲ء، ص ۲۱۲

۳۱۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر،قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصہ اوّل، اسلام آباد؛مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۶ء، ص ۵۰۔۴۹

۳۲۔ محمود،صفدر،مسلم لیگ کا دورِحکومت،لاہور؛غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۳ء، ص ۲۴۶۔۲۴۷

۳۳۔ عبداللہ،سید،تحریکِ نفاذِ اُردو،اسلام آباد؛مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۵ء، ص ۵۶۔۵۹

۳۴۔ ایضاً،ص۷۰

۳۵۔ ایضاً،ص۷۱

۳۶۔ کامران،جیلانی،قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان،اسلام آباد؛مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء، ص ۲۱۳

۳۷۔ Khan, Ayub, Friends Not Masters: A Political Biography, Karachi; Oxford University Press, 1967, Pg 25

۳۸۔ ایضاً،ص۴۳

۳۹۔ Rehman, Tariq Dr, The History of the Urdu-English Controversy in Pakistan, Islamabad; National Language Authority, 1996, Pg 57

۴۰۔ ایس۔ایم شریف اس کمیشن کے بعد ایک طویل عرصے تک مرکزی حکومت کے سیکریٹری تعلیمات رہے۔

۴۱۔ عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۷۳

۴۲۔ رحمان، طارق ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو انگریزی تنازع کی تاریخ، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء، ص ۶۷

۴۳۔ Edn. Comm. Report of the National Education Commission, Karachi; Govt. of Pakistan, Ministry of Education, 1959

۴۴۔ عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۷۹

۴۵۔ ایضاً، ص ۸۲

۴۶۔ Report of The Commission on Student Problems and Welfare: Summary of Important Observations And Recommendation, Islamabad; Govt. of Pakistan, Ministry of Education, Central Bureau of Education, Pg 18

۴۷۔ عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸

۴۸۔ کامران، جیلانی،قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۳۔۲۱۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۱۶۔۲۱۷

۵۰۔ ذوالفقار ، غلام حسین ، ڈاکٹر ،قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصّہ اوّل
اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۶

۵۱۔ رحمان، طارق، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو انگریزی تنازع کی تاریخ، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان ،
۱۹۹۶ء، ص ۷۰

۵۲۔ عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۱

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۰۴۔۱۴۹

۵۴۔ رحمان، طارق، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو انگریزی تنازع کی تاریخ، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان،
۱۹۹۶ء، ص ۷۰

۵۵۔ ذوالفقار ، غلام حسین ، ڈاکٹر ،قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصّہ اوّل
اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۷

۵۶۔ ایضاً

۵۷۔ عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۵۔۱۰۷

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۵۹۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں انگریزی حکمتِ عملی کو اس طرح واضح کیا۔ "ہمیں ایسے کارندے اور آدمیوں کی ضرورت ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں لیکن جو اپنے طور طریقوں، اپنی سوچ، اپنے اخلاق اور نقطہ نظر اور آراء کے اعتبار سے انگریز ہوں، اسی وقت انگریزی حکومت صحیح معنوں میں کامیابی کا منہ دیکھ سکتی ہے"

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۶۱۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصّہ اوّل، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۰

۶۲۔ عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۹

۶۳۔ کامران، جیلانی، قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۹

۶۴۔ Butt, M. Rafiq, The Constitution of Pakistan-1973, Lahore; Mansoor Book House, 2004, p.420

۶۵۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصّہ اوّل اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۳

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۴۳۔۱۴۴

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔۱۴۵

۶۹۔ کامران، جیلانی، قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۲۰

۷۰۔ مقتدرہ قومی زبان، ایک تعارف، اسلام آباد؛ مطبوعہ ۱۹۸۴ء

۷۱۔ کامران، جیلانی، قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۲۰

۷۲۔ The Pakistan Times, Lahore; Feb. 4, 1979

۷۳۔ Daily Dawn, Karachi; Feb. 18, 1987

۷۴۔ Daily Dawn, Karachi; Nov. 24, 1980

۷۵۔ رحمان، طارق، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو انگریزی تنازع کی تاریخ، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء، ص ۷۶

۷۶۔ Daily Dawn, Karachi; Dec. 28, 1981

۷۷۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصہ اوّل، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۹

۷۸۔ The Pakistan Times, Lahore; Oct. 6, 1987

۷۹۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصہ اوّل، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۰

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۸۱۔ رحمان، طارق، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو انگریزی تنازع کی تاریخ، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء، ص ۷۷

۸۲۔ ریاض فتیانہ، مشیر برائے وزیرِ اعلیٰ پنجاب، دی نیوز، ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء

۸۳۔ یادگاری مجلّہ، وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج، کراچی؛ ۱۹۹۵ء، ص ۵۹

۸۴۔ ایضاً، ص ۶۲

باب پنجم

حوالہ جات

۱۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۱

۲۔ کامران، جیلانی، قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ٦٧

۳۔ فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر، اُردو ہندی تنازع، اسلام آباد؛ نیشنل بک فاؤنڈیشن، ١٩٧٦ء، ص ٥٦۔

۴۔ بریلوی، مصطفیٰ علی سید، انگریزوں کی لسانی پالیسی، کراچی؛ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ١٩٧٠ء، ص ٧٨۔٨٥

۵۔ فتحپوری، فرمان ڈاکٹر، اُردو ہندی تنازع، اسلام آباد؛ نیشنل بک فاؤنڈیشن، ١٩٧٦ء، ص ٥٧

٦۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۲

٧۔ فتحپوری، فرمان ڈاکٹر، اُردو، قومی یکجہتی اور پاکستان، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۲ء، ص ۳۴

٨۔ لیفٹننٹ گورنر جارج کیمبل کے اُردو زبان کے بارے میں خیالات مقالات گارساں، تاسی، جلد اوّل، ص ١٧٦۔١٨٣ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

۹۔ صابر، ایوب پروفیسر، پاکستان میں اُردوزبان کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۳

۱۰۔ فتحپوری، فرمان ڈاکٹر، اُردو، قومی یکجہتی اور پاکستان، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۲ء، ص ۴۴۔۴۵

۱۱۔ صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اُردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۳

۱۲۔ فتحپوری، فرمان ڈاکٹر، اُردو، قومی یکجہتی اور پاکستان، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۲ء، ص ۶۱

۱۳۔ آبادی، ہاشمی فرید، سید، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۵

۱۶۔ صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اُردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۴

۱۷۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۶

۱۸۔ ایضاً،ص ۷

۱۹۔ ایضاً،ص ۸

۲۰۔ آبادی، ہاشمی فرید، سید، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۶۲

۲۱۔ منظر،شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۹

۲۲۔ ایضاً،ص ۱۰

۲۳۔ ایضاً،ص ۱۶

۲۴۔ منظر،شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۳۴۔۳۵

۲۵۔ ایضاً،ص ۱۸

۲۶۔ ہفت روزہ "قومی زبان" کراچی؛ ۲۲ مارچ ۱۹۴۹ء

۲۷۔ منظر شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۶

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۰

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۲۔۳۳

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۱

۳۶۔ اس کانفرنس کی مکمل روداد کے لئے منظر شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۴۰۔۴۹

۳۷۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان؛ ۲۰۰۲ء، ص ۲۴۷

۳۸۔ صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اُردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۶

۳۹۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان؛ ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۹

۴۰۔ مقتدرہ قومی زبان، تعارف نامہ، اسلام آباد؛ ۱۹۹۷ء، ص ۳۔۴

۴۱۔ راقمہ مقتدرہ قومی زبان کے افسر مطبوعات، نیّر عباس زیدی کی ممنون ہے کہ جنھوں نے اس مفید معلومات سے مستفید فرمایا

۴۲۔ مقتدرہ قومی زبان، تعارف نامہ، اسلام آباد؛ ۱۹۹۷ء، ص ۵،

۴۳۔ خان، رفیق احمد، محمد، مقتدرہ قومی زبان اور ٹیلی پرنٹر، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۴ء، ص ۲

۴۴۔ "تعارف نامہ"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد؛ ۱۹۹۷ء، ص ۹۔۱۰

۴۵۔ ایضاً ص ۱۱

۴۶۔ایضاً ص ۱۴

۴۷۔ایضاً ص ۱۵

۴۸۔ایضاً ص ۱۶

۴۹۔ایضاً

۵۰۔ایضاً ص ۱۷

۵۱۔ایک مختصر تعارف نامہ،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد؛ ۲۰۰۲ء

۵۲۔مقتدرہ قومی زبان،مجموعی کارکردگی،اسلام آباد؛ ۲۰۰۷ء

۵۳۔راقمہ ادارے کی مدیر اعلیٰ محترمہ فرحت فاطمہ کی مشکور ہے کہ جنھوں نے ادارے کے بارے میں مفید معلومات سے مستفید فرمایا۔

۵۴۔عبداللہ،سید،ڈاکٹر،تحریکِ نفاذ اُردو،اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان پاکستان،۲۰۰۵ء، ص ۳۴۳

۵۵۔ایضاً ۳۴۴

۵۶۔اختر،نصیب،تاریخ جامعہ کراچی،کراچی؛شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ،جامعہ کراچی،۱۹۷۷ء، ص ۵

۵۷۔ایضاً ص ۷۲

۵۸۔ایضاً

۵۹۔ستارسس، رینا، اُردو زبان کے حوالے سے دارالتصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی کی خدمات (تحقیقی جائزہ)، جامعہ کراچی؛ شعبہ اُردو، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۶

۶۰۔صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اُردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۱۹۸۵ء، ص ۲۴

۶۱۔ستارسس، رینا، اُردو کے حوالے سے دارالتصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی کی خدمات (تحقیقی جائزہ)، جامعہ کراچی: شعبہ اُردو، کراچی؛ ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۸

۶۲۔عبداللہ، سید، تحریکِ نفاذِ اُردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۳۴۵

۶۳۔صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۲۴

۶۴۔ایضاً

۶۵۔عبداللہ، سید، ڈاکٹر، تحریک نفاذ اردو، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۷

۶۶۔ایضاً،ص ۲۶۸

۶۷۔روداد ۱۹۷۶ء۔۱۹۷۷ء،مرکزی اردو بورڈ،لاہور؛ص ۲

۶۸۔ذوالفقار،غلام حسین،ڈاکٹر،قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات،جلد دوم۔حصہ اول،اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۶ء،ص ۱۱۳۔۱۱۴

۶۹۔روداد ۱۹۷۶ء۔۱۹۷۷ء،مرکزی اردو بورڈ،لاہور؛ص ۱۵

۷۰۔عبداللہ،سید،تحریکِ نفاذِ اُردو،اسلام آباد؛مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء،ص ۲۷۱

۷۱۔تاج،امتیاز علی،تعارف اور خدمات،لاہور؛مجلس ترقی ادب،ص ۲

۷۲۔صابر،ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے،اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۱۶

۷۳۔روداد ۱۹۹۹ء،مجلس ترقی ادب،لاہور؛ ص ۵

۷۴۔صابر،ایوب، پروفیسر،پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵ء، ص ۵۷

۷۵۔کتابچہ،کل پاکستان اہل قلم کانفرنس (منعقدہ) ۲۵۔۲۶ نومبر ۱۹۸۰ء،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد

۷۶۔ صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۵۸

۷۷۔ اقبال اکادمی، کارگزاری اور منصوبے، ص ۳

۷۸۔ صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۵۰

۷۹۔ ایضاً

۸۰۔ راہنمائے طلبہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد؛ ص ۳

۸۱۔ سالانہ روداد، یکم جولائی ۱۹۸۳ء تا ۳۰ جون ۱۹۸۴ء، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ص ۶

۸۲۔ صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۵۶

۸۳۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔ حصہ اول، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۴

۸۴۔ کتابچہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ تعارف، تاریخ، آئندہ کے علمی و تحقیقی منصوبے، ۲۰۰۳ء، ص ۳

۸۵۔لائیڈن ہالینڈ کا علمی مرکز ہے۔

۸۶۔ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد دوم۔حصہ اول، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۴

۸۷۔کتابچہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ تعارف، تاریخ، آئندہ کے علمی و تحقیقی منصوبے، ۲۰۰۳ء، ص ۴

۸۸۔ایضاً، ص ۵

۸۹۔بشکریہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف، مدیر اعلیٰ، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، بذریعہ خط، ۱۲۸ کتوبر، ۲۰۰۸ء

۹۰۔کتابچہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ تعارف، تاریخ، آئندہ کے علمی و تحقیقی منصوبے، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵

۹۱۔ایضاً، ص ۶۔۸

۹۲۔بشکریہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف، مدیر اعلیٰ، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، بذریعہ خط ۱۲۸ کتوبر ۲۰۰۸ء

۹۳۔ کتابچہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ تعارف، تاریخ، آئندہ کے علمی و تحقیقی منصوبے، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵

۹۴۔منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷۴

۹۵۔ یادگاری مجلہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج، کراچی؛ ۱۹۹۵ء، ص ۵۹

۹۶۔ قومی زبان، جشن صد سالہ نمبر، جنوری، فروری ۲۰۰۳ء، ص ۲۱

۹۷۔ برگ گل، جوہر نمبر، ص ۴۶۱۔۴۶۲

۹۸۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۲ء، ص ۲۴۳

۹۹۔ صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۲۶

۱۰۰۔ منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۲ء، ص ۲۱۳

۱۰۱۔ صابر، ایوب، پروفیسر، پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۲۷

ماحصل

حوالہ جات:

۱۔ بیگم،عبیدہ،ڈاکٹر،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،کراچی؛سٹی بک پوائنٹ،ص ۱۳

۲۔ حسین،سید عابد،قومی تہذیب کا مسئلہ،علیگڑھ؛انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۵ء،ص ۱۲۵

۳۔ کشفی،سید ابوالخیر،اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر،کراچی؛ادبی پبلشر،۱۹۷۵ء،ص ۳۵۳

۴۔ بیگم،عبیدہ،ڈاکٹر،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،کراچی؛سٹی بک پوائنٹ،ص ۱۴

۵۔ Wellesley's Minute, referred from "College of Fort William in Bengal", pp.23-24

۶۔ جالبی،جمیل،ڈاکٹر،قومی زبان،یکجہتی،نفاذ اور مسائل،اسلام آباد؛مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۹ء،ص ۱۳

۷۔ ایضاً

۸۔ نیر،طاہرہ،ڈاکٹر،اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار،کراچی؛انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۹۹ء، ص ۳۸

۹۔ فتح پوری،فرمان،ڈاکٹر،اردو ہندی تنازع،اسلام آباد؛نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۷۷ء،ص ۹

۱۰۔ Bress, Paul,R., Language, Religion and Politics, Cambridge University Press, 1974, p.136

۱۱۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، حیات جاوید، لاہور؛ دوست ایسوسی ایٹس ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۴۔۱۵۵

۱۲۔ Zaidi, Z.H., Jinnah Papers, vol.I, Quaid-e-Azam Papers Project, Cabinet Division, Government of Pakistan, 1998

۱۳۔ اردو اور بنگلہ کا مسئلہ شاید اس لیے ابھارا گیا تا کہ اس سے انگریزی کو تحفظ مل سکے۔ (مؤلف)

۱۴۔ نیر، طاہرہ، ڈاکٹر، اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، کراچی؛ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۹۹ء، ص ۳۸

۱۵۔ جامعہ عثمانیہ نے اردو کو یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنا کر اور علوم وفنون پر سینکڑوں کتابیں ترجمہ اور تالیف کرا کر اردو زبان کی بنیادوں کو نا صرف مضبوط کیا بلکہ یہ ثابت کر دیا کہ اردو ملکی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ اردو زبان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہو جائے، مضحکہ خیز لگتا ہے۔ مؤلف

۱۶۔ Butt, M. Rafiq, The Constitution of Pakistan-1973, Lahore; Mansoor Book House, 2004, p.420

کتابیات

کتابیات

احمد، سید نور، مارشل لا سے مارشل لا تک، لاہور؛ دین محمدی پریس، ۱۹۶۵ء

احمد، وحید، شاہراہ آزادی (انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء، پس منظر، عوامل اور تجزیہ) کراچی؛ قائداعظم اکادمی، ۱۹۹۰ء

احمد، ڈپٹی نذیر، لیکچر در مخالفت واظہار مضرت، انڈین نیشنل کانگریس، آگرہ؛ مطبع مفید عام، ۱۸۸۸ء

احمد، سعید، روزنامہ زمیندار اور تحریک آزادی (توضیحی اشاریہ)، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، جون، ۱۹۸۸ء

احمد، ملک زادہ منظور، ڈاکٹر، مولانا عبدالکلام آزاد، فکر و فن، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۸ء

احمد، نثار، ڈاکٹر، عہد نبوی میں ریاست کا نشو و ارتقاء، ۱۹۷۶ء

اختر، سلیم، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، آغاز سے ۲۰۰۰ء تک، لاہور؛ سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

اختر، شبیر محمود، قومی زبان اخبارات کے آئینے میں، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

اختر، نصیب، تاریخ جامعہ کراچی، کراچی؛ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۷۷ء

اسلامی تہذیب و ثقافت، رسالہ ندیم گیا (۱۹۳۱ء۔۱۹۴۹) سے انتخاب ۱۶، جلد دوم، پٹنہ؛ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۹ء

اسلامی تہذیب و ثقافت، رسالہ ندیم گیا (۱۹۳۱ء۔۱۹۴۹) سے انتخاب ۱۵، جلد دوم، پٹنہ؛ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۹ء

اسپر ی، ایل۔ ایس، ہندوستان اور آزادی مترجم یوسفی مظفر شاہ خان، دہلی؛ مکتبہ برجان، ۱۹۴۴ء

اصفہانی، ایم۔اے۔ایچ، قائداعظم میری نظر میں، لاہور؛ مکتبہ شاہکار، ۱۹۷۶ء

اصلاحی، شرف الدین، ڈاکٹر، اُردو سندھی کے لسانی رشتے، لاہور؛ مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۰ء

اعجاز، منظر، ڈاکٹر، اقبال اور قومی یکجہتی، نئی دہلی؛ جون ۱۹۹۴ء

اقبال، محمد، اقبال کی لغوی اور لسانی بحثیں (لیاقت علی چودھری)، وزیر آباد؛ بشارت پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

اقبال، جاوید، مئے لالہ فام، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۳ء

اقبال، محمد علامہ، کلیات اقبال، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۸۹ء

اقبال، محمد، خطبات اقبال (ایک جائزہ) مصنف محمد شریف بقا، لاہور؛ اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۱ء

اکرام، شیخ محمد، رودِ کوثر، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۵ء

اکرام، شیخ محمد، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، جون، ۲۰۰۳ء

اکرم، شیخ محمد، ثقافت پاکستان، کراچی؛ ادارہ مطبوعات پاکستان، سن ندارد

البیرونی، ابوریحان، کتاب الہند، مترجم اصغر علی، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۴۱ء

امروہی، افسر صدیقی، انجمن ترقی اُردو، کراچی کی پچیس سالہ کارکردگی کی رپورٹ، کراچی؛ فائن آرٹ لیتھو ورکس، ۱۹۴۰ء

انجم، خلیق، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، نئی دلی؛ انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۹۶ء

انور، محمد رفیع، تحریک قیام پاکستان، لاہور؛ علمی کتب خانہ، ۱۹۷۲ء

اُردو انسائیکلوپیڈیا، جلد اوّل، مدیرِ اعلیٰ پروفیسر فضل الرحمٰن، نئی دہلی؛ کونسل برائے ترقی اُردو، ۱۹۹۶ء

اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد چہارم، لاہور؛ دانش گاہ پنجاب، طبع اوّل، ۱۹۶۹ء

آبادی، ہاشمی فرید سید، پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۷ء

آرنلڈ، تھامس، دعوت اسلام، مترجم عنایت اللہ دہلوی، کراچی؛ مسعود پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۴ء

آزاد، ابوالکلام، مولانا عبدالکلام آزاد کی تقریریں مترجم، عارف انور، کراچی؛ مکتبہ ماحول، ۱۹۶۱ء

آزاد، ابوالکلام، ہماری آزادی، مترجم محمد مجیب، بمبئی؛ اوریئنٹ لونگ مینس، ۱۹۶۱ء

آزاد، عبدالکلام، تحریک آزادی اور مسلمان، مترجم انور عارف، لاہور؛ اشرف پریس، ۱۹۵۹ء

آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، اتر پردیش؛ اُردو اکادمی، ۱۹۹۳ء

آزاد، مولانا ابوالکلام، انڈیا ونز فریڈم، لاہور؛ مکی دارالکتب، ۲۰۰۳ء

آغاخان، سر، آپ بیتی آغاخان، مترجم عباس سبزواری، کراچی؛ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن پاکستان، ۱۹۵۵ء

آل انڈیا ریڈیو کی تقریریں، ہندوستانی کیا ہے؟، دہلی؛ مکتبہ جامعہ، ۱۹۳۹ء

بٹالوی، عاشق حسین، ہماری قومی جدوجہد (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۲ء)، لاہور؛ پاکستان ٹائمز پریس، ۱۹۷۵ء

بٹالوی، عاشق حسین، ہماری قومی جدوجہد (۱۹۳۹ء)، لاہور؛ پاکستان ٹائمز پریس، ۱۹۶۸ء

بٹالوی، عارف، خطبات لیاقت ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۰ء، لاہور؛ ملک دین محمد اینڈ سنز، سن ندارد۔

بٹالوی، عاشق حسین، ہماری قومی جدوجہد (۱۹۳۸ء)، لاہور؛ پاکستان ٹائمز پریس، ۱۹۶۶ء

بٹالوی، عاشق حسین، اقبال کے آخری دو سال، دہلی، ہندوستانی پبلشرز، ۱۹۴۳ء

برکے، ایس ایم، اکبر نامہ، مترجم مفتی مسعود، لاہور؛ علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۶ء

برنیر، ڈاکٹر، شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب، مترجم سید محمد حسین مرحوم، کراچی؛ نفیس اکیڈمی، اپریل ۱۹۶۰ء

بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، خطبات مولوی عبدالحق، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۶۴ء

بریلوی، سید الطاف علی، تعلیمی مسائل، کراچی؛ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۵ء

بریلوی، الطاف علی، علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، کراچی؛ اکیڈمی ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۰ء

بریلوی، مصطفیٰ علی سید، انگریزوں کی لسانی پالیسی، کراچی؛ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۰ء

بریلوی، مولوی عبدالعزیز خان، تاریخ روہیل کھنڈ مع تاریخ بریلی، کراچی؛ مہران اکیڈمی، اکتوبر ۱۹۶۳ء

بریلوی، سید الطاف علی، علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، کراچی؛ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ۱۹۷۰ء

بقا، مظہر، ڈاکٹر، اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، اسلام آباد؛ ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۷۳ء

بھٹی، اقبال احمد، آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء، جہلم؛ بھٹی پبلشرز، ۱۹۷۵ء

بیگم، عبیدہ، ڈاکٹر، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، کراچی؛ سٹی بک پوائنٹ ۲۰۰۴ء

پام دت، رجنی، نیا ہندوستان، لاہور؛ قومی دارالاشاعت، سن ندارد

پانی پتی، اسمٰعیل، مقالات سرسید، حصہ پانزدھم، لاہور؛ مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳ء

پانی پتی، اسمٰعیل، مقالات سرسید، حصہ ہشتم و نہم، لاہور؛ مجلس ترقی ادب ۱۹۶۲ء

پرشاد، راجندر، اپنی کہانی، دہلی؛ ساھتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۱ء

پنڈت، کول کشن پرشاد، ادبی وقومی تذکرے، علیگڑھ؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۵۱ء

پیرزادہ، سید شریف الدین، پاکستان منزل بہ منزل، کراچی؛ گلڈ انجمن کتاب گھر، ۱۹۶۵ء

پیرزادہ، شریف الدین، پاکستان منزل بہ منزل، کراچی؛ گلڈ اشاعت گھر، سن ندارد

تاج، امتیاز علی، تعارف اور خدمات، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، سند ندارد

تاریخ ہند عہدِ وسطیٰ (غیر مطبوعہ مآخذ، جنوبی ایشیائی علاقائی سیمینار منعقدہ ۲۲۔۲۶ مارچ ۱۹۸۸ء کے مقالات)،

پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۹ء

ترپاٹھی، رما شنکر، تاریخ قدیم ہندوستان، ترجمہ سید یحییٰ حسن نقوی، کراچی؛ سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۵ء

تمنائی، صفیہ، ڈاکٹر، انجمن پنجاب "تاریخ وخدمات" (قلمی) مخزونہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، جامعہ کراچی

ٹالبوٹ، آئین، تاریخ پاکستان (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۷ء)، ترجمہ طاہر منصور فاروقی، لاہور؛ تخلیقات، ۲۰۰۵ء

ٹامسن، ایڈورڈ، انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ، مترجم حسام الدین شیخ؛ امرتسر؛ موتی پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۱ء

ٹائن بی، آر نلڈ، جے، مطالعہ تاریخ، حصہ اوّل، مترجم مولانا غلام رسول مہر، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۷ء

جالبی، جمیل، ڈاکٹر، قومی زبان، یکجہتی، نفاذ اور مسائل، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء

جالبی، جمیل، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، جلد اوّل، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء

جاوید، قاضی، ہندی مسلم تہذیب، لاہور؛ تخلیقات، ۱۹۹۵ء

جائزہ زبان اُردو، حصہ اوّل، ریاستہائے راجپوتانہ، دہلی؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۴۰ء

جذبی، معین احسن، حالی کا سیاسی شعور، لاہور؛ آئینہ ادب، ۱۹۶۳ء

جعفری، رئیس احمد، اوراق گم گشتہ، لاہور؛ محمد علی اکیڈمی، ۱۹۶۸ء

جعفری، نور الحسن، منتشر یادیں، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء

جوہر، محمد علی، مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر، لاہور؛ ادارہ ادبیات، ۱۹۴۶ء

چند، تارا، ڈاکٹر، تاریخ تحریک آزادی ہند، حصہ دوم، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی، نئی دہلی؛ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند، ۲۰۰۱ء

چند، تارا، ڈاکٹر، تحریک آزادی ہند، حصہ سوم، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی، نئی دہلی؛ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند، ۱۹۹۸ء

چند، تارا، ڈاکٹر، تاریخ تحریک آزادی ہند، حصہ چہارم، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی، نئی دہلی؛ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند، ۲۰۰۲ء

چندر بوس، سوبھاش، سوبھاش بابو کی تقریریں، دہلی؛ اعلیٰ پریس، تاریخ ندارد

چندر، کرشن، شکست کے بعد، لاہور؛ البیان، چوک انارکلی ۱۹۶۶ء

چند، تارا، ڈاکٹر، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، مترجم ڈاکٹر مسعود احمد، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۴ء

چنگیزی، اسلام لیگ، ایشیائی بیداری اور اُردو شعراء۔ الہ آباد، ۱۹۶۱ء

حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید، لاہور؛ دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء

حجازی، مسکین، ڈاکٹر، پاکستان و ہند میں مسلم ثقافت کی مختصر تاریخ، لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

حسن، خواجہ سرور، تشکیل پاکستان، مترجم خواجہ رضی حیدر، کراچی؛ قائداعظم اکادمی، ۱۹۹۶ء

حسن، سبط، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی؛ مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲ء

حسن، شہاب مسعود، بہاولپور میں اُردو کی قدیم دستاویزات، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء

حسن، محمد، ڈاکٹر، ہندی ادب کی تاریخ، علیگڑھ؛ انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء

حسین، مظہر، علیگڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، نئی دلی؛ انجمن ترقی اُردو ہند، ۲۰۰۲ء

حسین، احتشام پروفیسر، مقدمہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، لکھنو؛ دانش محل، ۱۹۴۸ء

حسین، سید عابد، ڈاکٹر، قومی تہذیب کا مسئلہ، علیگڑھ؛ انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء

حیدر، خواجہ رضی، قائداعظم کے ۷۲ سال، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء

خالدہ، ادیب خانم، اندرون ہند، مترجم ہاشمی، سید، دہلی؛ انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۹ء

خالد، کریم بخش، سندھ صوبائی لیگ کانفرنس ۱۹۳۸ء (پس منظر و اہمیت)، کراچی؛ قائداعظم اکادمی، ۱۹۸۸ء

خان، حمید احمد، پروفیسر، تعلیم و تہذیب، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء

خان، حمید اللہ، قائداعظم محمد علی جناح کی فہم و فراست، حیدرآباد؛ ۲۰۰۵ء

خان، سرسید احمد، اسباب بغاوت ہند، کراچی؛ باب الاسلام پریس، ۱۹۵۷ء

خان، سرسید احمد، تذکرہ اہل دہلی، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۵ء

خان، سرسید احمد، آثار الصنادید، کانپور؛ مطبع نامی، ۱۹۰۴ء

خان، سر سید احمد، تذکرہ اہل دہلی، مرتب اختر احمد میاں، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۶۵ء

خان، صدیق علی، بے تیغ سپاہی، کراچی؛ الاتیز بک کارپوریشن، ۱۹۷۱ء

خان، محمد یامین، نامہ اعمال، حصہ اول ودوم، لاہور؛ آئینہ ادب، ۱۹۷۰ء

خان، مسعود حسین، ڈاکٹر، مقدمہ تاریخ زبان اردو، علیگڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۵ء

خان، یوسف حسین، ڈاکٹر، یادوں کی دنیا، اعظم گڑھ؛ دارالمصنفین، ۱۹۶۷ء

خاں، رفیق احمد محمد، مقتدرہ قومی زبان اور ٹیلی پرنٹر، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۴ء

خلیق الزماں، چودھری، شاہراہ پاکستان، کراچی؛ انجمن اسلامیہ، ۱۹۶۷ء

خورشید، عبدالسلام، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء

دتاسی، گارساں، تاریخ ادب ھندوستانی (اُردو ترجمہ قلمی)، کراچی؛ مخزونہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، جامعہ کراچی

دتاسی، گارساں، مقالات، جلد اوّل، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۶۴ء

دتاسی، گارساں، خطبات، جلد دوم، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۴ء

دتاسی، گارساں، خطبات، حصّہ اوّل ودوم، اورنگ آباد؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۳۵ء

دہلوی، ظہیر، داستان غدر، لاہور؛ مطبع جدید، ۱۹۵۵ء

دہلوی، عبدالرحمٰن، مولانا، مقدمہ ابن خلدون، لاہور؛ الفیصل ناشران، مئی ۲۰۰۵ء

دہلوی، مولانا بخش رحیم، حیات ولی، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، لاہور؛ مکتبہ طیبہ بلال گنج، ۱۹۷۲ء

دیوا، محمد فاروق، ڈاکٹر، سر سید اور شبلی (تعلیمی اور سماجی خدمات کا تقابلی مطالعہ)، سرینگر کشمیر؛ گلشن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

ڈادول، ہنری، ڈوپلے اور کلائیو، مترجم مولوی مسعود علی، حیدرآباد دکن؛ دارالطبع جامعہ عثمانیہ، سن ندارد

ڈی وئیر، رابرٹ وین، ہندومت، مترجم ملک اشفاق، لاہور؛ بک ہوم، ۲۰۰۷ء

ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد اوّل۔ حصہ اوّل، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات، جلد اوّل۔ حصہ دوم، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، تاریخ اورینٹل کالج (لاہور)، لاہور؛ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۲ء

راجندر پرشاد، ڈاکٹر، ہندوستان کا مستقبل، دہلی؛ حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۶ء

رام نتھو منشی، راجہ رام موہن رائے، لاہور؛ مطبع خادم التعلیم پنجاب، ۱۸۹۴ء

راندیری، مشتاق، انقلاب مشرق اور مسلمان مع مکمل و مستند تاریخ تحریک آزادی ہند، دہلی؛ آرمی پریس، ۱۹۴۷ء

رپورٹ کارکردگی تحریک تنظیم (جولائی ۱۹۳۰ء تا دسمبر ۱۹۳۰ء)، الہ آباد؛ سبحان اللہ پریس، ۱۹۳۰ء

رحمان، طارق، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو انگریزی تنازع کی تاریخ، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء

رحمٰن گوہر، اسلامی ریاست، دارالعلوم تفہیم القرآن، مردان؛ جون ۱۹۹۵ء

روزینہ، پروین، جمیعت العلماء ہند (دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ۱۹۱۹ء ۔ ۱۹۴۵ء)، جلد اول، اسلام آباد؛ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، ۱۹۸۰ء

روزینہ، پروین، جمیعت العلماء ہند (دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۵ء)، جلد دوم،

اسلام آباد؛ قومی ادارہ برائے تحقیق وثقافت، ۱۹۸۱ء

ریاض، سید حسن، پاکستان ناگزیر تھا، کراچی؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء

زبیری، محمد امین، حیات محسن، علیگڑھ؛ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۳۴ء

زبیری، انوار احمد، خطبات عالیہ، حصہ اوّل، علیگڑھ؛ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۲۷ء

زبیری، انوار احمد، خطبات عالیہ، حصہ دوم، علیگڑھ؛ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۲۸ء

زبیری، محمد امین، تذکرہ وقار الملک، اٹاوہ؛ اسلامیہ ہائی اسکول، ۱۹۲۵ء

زبیری، محمد امین، تذکرہ محسن، دہلی؛ جامع برقی پریس، ۱۹۳۵ء

زبیری، محمد امین، سیاست ملیہ، آگرہ؛ مطبع عزیزیہ، ۱۹۴۱ء

زمن، مختار، بھارت میں قومی زبان کا نفاذ، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

زور، محی الدین قادری، ہندوستانی لسانیات، علیگڑھ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۵ء

زیبا، شجاع احمد، مولوی نذیر احمد اور علیگڑھ تحریک، کراچی؛ مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۷ء

سالک، عبدالمجید، مسلم ثقافت ہندوستان میں، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۷ء

سبزواری، شوکت، ڈاکٹر، اُردو زبان کا ارتقاء، ڈھاکہ؛ مکتبہ گہوارہ ادب، ۱۹۵۶ء

سبزواری، شوکت، ڈاکٹر، داستان زبان اُردو، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۰ء

سبزواری، شوکت، لسانی مسائل، کراچی؛ مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۲ء

ستیارامیہ، بی۔ پٹابھی، تاریخ کانگریس، دہلی؛ انڈین بک کمپنی، سن ندارد

ستار سس، رینا، اُردو زبان کے حوالے سے دارالتصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی کی خدمات (تحقیقی جائزہ)،
جامعہ کراچی، شعبہ اُردو، ۲۰۰۷ء

سدید انور، اُردو ادب کی تحریکیں، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۴ء

سرور، محمد، مولانا عبیداللہ سندھی، لاہور؛ سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۴۳ء

سراج السلام، سید، تاریخ پاک وہند، (عہد قدیم سے ۱۹۶۵ء تک)، کراچی ۲۰۰۳ء

سرور، محمد، تحریک پاکستان کا ایک باب، لاہور؛ سندھ ساگر اکیڈمی، ۱۹۷۵ء

سعید، احمد، پروفیسر، حصول پاکستان، لاہور؛ ایجوکیشنل امپوریم، ۱۹۷۵ء

سعید، حکیم محمد، تصور ریاست اسلامی مقالات مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۸۳ء

سعید الدین، مشرقی پاکستان کا زوال، کراچی؛ ناظر پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۹ء

سکینہ، رام بابو، تاریخ ادب اُردو، ترجمہ مرزا محمد عسکری، لاہور؛ سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۴ء

سلیم، وحید الدین، مولوی، سرسید احمد خان کے خطوط، پانی پت؛ حالی پریس، ۱۹۰۱ء

سلیم، مولوی وحید الدین، مضامین سلیم، جلد اول، کراچی؛ انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۱ء

سمیع اللہ، ڈاکٹر، انیسویں صدی میں اُردو کے تصنیفی ادارے، سلطان پور؛ ۱۹۸۸ء

سلیم، وحید الدین، مولوی، وضع اصطلاحات، کراچی؛ انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۴ء

شاہ، شوکت علی، اردو زبان مسائل اور امکانات (مقالات عالمی اردو کانفرنس ملتان ۱۹۹۲ء)، لاہور؛ ۲۰۰۴ء

شاہجہاں پوری، پیام، تاریخ نظریہ پاکستان، لاہور؛ انجمن حمایت اسلام، ۱۹۷۰ء

شاہد، حمید الدین، سرگزشت ادارہ ادبیات اُردو، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۰ء

شاہین، رحیم بخش پروفیسر، نقوش قائد اعظم، لاہور؛ شیخ اکیڈمی، ۱۹۷۶ء

شجاع، ناموس محمد، ڈاکٹر، آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان، لاہور؛ یونائیٹڈ پبلشرز، ۱۹۴۷ء

شجاعت علی، سندیلوی، تعارف تاریخ اُردو، لکھنؤ، ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۶۳ء

شکیل الرحمٰن، زبان اور کلچر، کشمیر؛ شاہین بک اسٹال، ۱۹۵۸ء

شمس الدین، محمد، پروفیسر ڈاکٹر، تبلیغ و ابلاغ، سیرت طیبہ کی روشنی میں، کراچی؛ آگہی پبلیکیشنز، ۱۹۹۴ء

شمس الدین، محمد، پروفیسر ڈاکٹر، صحافتی زبان، بہاولپور؛ ماہی پبلیکیشنز، ۲۰۰۰ء

شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

شیرانی، حافظ محمود، پروفیسر، پنجاب میں اُردو، لاہور؛ معین الادب، سن ندارد

شیرانی، مظہر محمود، مقالات محمود شیرانی، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

شیروانی، لطیف احمد، بانی پاکستان، مترجم خواجہ رضی حیدر، کراچی؛ قائد اعظم اکادمی، ۱۹۷۶ء

صابری، امداد، سن اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد شعرا، دہلی؛ مکتبہ شاہراہ، ۱۹۵۹ء

صابر، ایوب پروفیسر، پاکستان میں اُردو کے ترقیاتی ادارے، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تاریخ زبان و ادب اُردو، کراچی؛ رہبر پبلشرز، ۱۹۹۸ء

صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، جامع القواعد، لاہور؛ مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۱ء

صدیقی، افتخار احمد، ڈاکٹر، کلیات نظم حالی، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء

صدیقی، محمد عتیق، گلکرسٹ اور اسکا عہد، علیگڑھ؛ انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۰ء

صدیقی، محمد عتیق، صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، علیگڑھ؛ انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۳ء

صہیب ، ناعمہ ، تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات ، کراچی ؛ فضل سنز لمیٹڈ ، اگست ۲۰۰۶ء

طاہر ، محمد فاروقی ، پاکستان میں اُردو اور زبان وادب کا پاکستانی دور (۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۴ء) ، پشاور ؛ پشاور بک ایجنسی ، ۱۹۶۵ء

ظہیر ، سجاد ، اُردو ہندی ، ہندوستانی ، بمبئی ؛ کتب پبلشرز لمیٹڈ ، ۱۹۴۷ء

عبدالحق ، مولوی ، اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ ، کراچی ؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان ، ۱۹۵۳ء

عبدالحق ، مولوی ، انجمن ترقی اُردو کا المیہ ، کراچی ؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان ، ۲۰۰۲ء

عبدالحق ، مولوی ، اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم سائنس ، کراچی ، ۱۹۵۱ء

عبدالقادر ، رہنمائے تاریخ اُردو ، اعظم گڑھ ؛ مصارف پریس ، ۱۹۳۸ء

عبداللہ ، سید ، ڈاکٹر ، سرسید اوران کے رفقائے کار ، علیگڑھ ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس ، ۲۰۰۱ء

عبداللہ ، سید ، تحریک نفاذ اُردو ، اسلام آباد ؛ مقتدرہ قومی زبان ، ۲۰۰۵ء

عبداللہ ، سید ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ، نئی دلی ؛ انجمن ترقی اردو ہند ، ۱۹۶۲ء

عبدالحق ، مولوی ، مرحوم دہلی کالج ، دہلی ؛ انجمن ترقی اردو ، ۱۹۴۵ء

عبدالحق ، مولوی ، مقدمہ قواعد اردو ، دہلی ؛ انجمن ترقی اردو ، ۱۹۴۵ء

عبداللہ ، سید ، اردو ذریعہ تعلیم اور نفاذ اردو ، اسلام آباد ؛ مقتدرہ قومی زبان ، ۱۹۸۶ء

عسکری ، سید حسن ، عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ ، پٹنہ ؛ خدا بخش لائبریری ، ۱۹۹۵ء

عظیم ، سید وقار ، پروفیسر ، مقالات گارساں دتاسی ، حصہ دوم ، دہلی ؛ انجمن ترقی اردو ، ۱۹۴۳ء

عظیم، سید وقار، پروفیسر، مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور؛ اورینٹل کالج، ۱۹۷۰ء
عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء
علی احمد خان، چودھری، مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات، لاہور؛ تعلیمی پریس، ۱۹۵۶ء
علی اکرام، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی؛ انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۳۹ء
علی، عبداللہ یوسف، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، لاہور؛ دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء
علی، مبارک، ڈاکٹر، آخری مغلیہ عہد کا ہندوستان، لاہور؛ فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء
علی، مبارک، ڈاکٹر، تاریخ خاص نمبر ۱۸۵۷ء، جلد اول، لاہور؛ فکشن ہاؤس، ۲۰۰۷ء
علی، محمد چودھری، ظہور پاکستان، لاہور؛ مکتبہ کاروان، سن ندارد
علیگ، باری، کمپنی کی حکومت، لاہور؛ مکتبہ اردو، ۱۹۴۴ء
عوفی، محمد، لباب الالباب، مرتبہ سعید نفیسی، تہران بہمن ماہ، ۱۳۳۵ھ
فارانی، محمد الیاس، برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء، کراچی؛ ادارہ مطبوعات پاکستان، ۱۹۶۸ء
فاروق، محمد مجاہد، پاکستان کی نظریاتی تاریخ حکومت اور سیاست، لاہور؛ نیو بک پیلس، تاریخ ندارد
فائق، کامران، تحریک پاکستان ہماری جدوجہد آزادی، لاہور؛ فیروز سنز، ۱۹۷۶ء
فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، اقبال سب کے لئے، کراچی؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء
فتح پوری، نیاز، جذبات بھاشا، دہلی: جی اسٹینڈ سنز الیکٹرک پریس، ۱۹۱۵ء
فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، زبان اور اُردو زبان، کراچی؛ قمر کتاب گھر، ۱۹۷۲ء

فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر، اُردو، قومی یکجہتی اور پاکستان، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۲ء

فتحپوری، فرمان، ڈاکٹر، ہندی اُردو تنازع، اسلام آباد؛ نیشنل فاؤنڈیشن، ۱۹۷۶ء

فرمودات قائد، کراچی؛ قائداعظم اکیڈمی، ۲۰۰۶ء

فہمی، مفتی شوکت علی، انگریز کا شرمناک دورحکومت، دہلی؛ دین دنیا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۰ء

قادری، حامد حسن، مولانا، داستان تاریخ اُردو، طبع سوم آگرہ؛ لکشمن نرائن اگروال، ۱۹۵۷ء

قاضی، علامہ آئی۔ آئی، ادبی رابطے، لسانی رشتے، مترجم الیاس عشقی، حیدرآباد؛ مجلس ادب، ۱۹۷۶ء

قائداعظم، پاکستانی زبانوں کے آئینے میں، اسلام آباد؛ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء

قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء

قریشی، اشتیاق حسین، علماء میدان سیاست میں، کراچی؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء

قریشی، اشتیاق حسین، جدوجہد پاکستان، کراچی؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء

قریشی، سمیع اللہ، قیام پاکستان کا تاریخی اورتہذیبی پس منظر، لاہور؛ سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

قریشی، کامل، ڈاکٹر، اُردواور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، دہلی؛ اُردو اکادمی، ۲۰۰۹ء

کامران، جیلانی، قومیت کی تشکیل اوراُردوزبان، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء

کریوی، اسراراحمد، سی پی میں کانگریس راج، کراچی؛ نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۶ء

کریوی، حکیم اسراراحمد، سی۔ پی میں کانگریس راج، ناگپورہ، شہروضلع مسلم لیگ، ۱۹۴۱ء

کشفی، ابوالخیر، اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر، کراچی؛ ادبی پبلشرز، ۱۹۷۵ء

کل ہند کانفرنس، دہلی، (کیفیت و روئیداد)، دہلی؛ انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء

کوثر، انعام الحق، بلوچستان میں اُردو کی قدیم دفتری دستاویزات، اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

کوثر، اے۔ایچ، اُردو کے علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کا حصہ، کراچی؛ لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۴ء

کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر، جوئے کوثر، کوئٹہ؛ بابر اسٹیشنری مارٹ، ۱۹۷۶ء

کیلانی، عبدالرحمٰن مولانا، خلافت و جمہوریت، لاہور؛ مکتبہء السلام، ۲۰۰۲ء

کیفی، برجموھن دتاتریا، کیفیہ، لاہور؛ معین الادب، ۱۹۵۰ء

کیفی، برجموھن دتاتریہ، اردو زبان، علیگڑھ، ۱۹۵۲ء

گاندھی، مہاتما، تلاش حق، لاہور؛ فکشن ہاؤس، ۲۰۰۳ء

گاندھی، موہن داس کرم چند، قوم کی آواز آزادی ہند کا مطالبہ، لاہور؛ میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز، سن ندارد

گستاؤلی بان، ڈاکٹر، تمدن ہند، ترجمہ سید علی بلگرامی، ۱۹۱۲ء، کراچی؛ بک لینڈ، ۱۹۶۲ء

گل، حسن وقار، مطالعہ حسرت موہانی، کراچی؛ گلرنگ پبلیکیشنز، ۱۹۹۷ء

گورکھپوری، مجنون، پروفیسر، آزادی کا شیدائی، حسرت موہانی، کراچی؛ مجلّہ بیاد مولانا حسرت موہانی، مئی ۲۰۰۸ء

گوہر، سردار ہر بخش سنگھ، کانگریس کی تواریخ یا ہندوستان کی جنگ آزادی، لاہور؛ حجازی پرنٹنگ پریس، سن ندارد

لاری، احمد، مولانا حسرت موہانی، حیات و کارنامے، گورکھ پور: ۱۹۷۳ء

لال، سندر، سن ستاون، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء

مارہروی، انوار احمد، مرقع کانفرنس، علیگڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۱۹۳۵ء

مجیب الاسلام، دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی اور ادبی خدمات اور اُردو زبان و ادب پر اس کے اثرات، دہلی: ۱۹۸۶ء

محسن الملک، نواب، مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، حصہ اول، مرتبہ فضل دین ککے زئی، لاہور: نول کشور پریس، ۱۹۰۴ء

محمد، رضیہ نور، ڈاکٹر، اُردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (۱۴۹۸ء تا ۱۹۴۷ء)،

لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۸۵ء

محمد، ارباب نثر اردو (فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تذکرہ)، لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء

محمود فیاض، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد ۸، ۱۸۰۳ء تا ۱۹۱۴ء لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء

محمود، صفدر، مسلم لیگ کا دورِ حکومت، لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۳ء

مصطفیٰ، غلام، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقاء، کراچی: شہزاد، ۲۰۰۳ء

معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر، نقد مولوی عبدالحق، لاہور: نذر سنز، ۱۹۶۸ء

مغل، محمد اصغر، مولانا، ابوالکلام آزاد کے ادبی شہ پارے، ماخوذ الہلال، کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۲ء

ملک، عبداللہ، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء

ملک، عبداللہ، پنجاب کی سیاسی تحریکیں، لاہور: نگارشات، ۱۹۷۱ء

منظر، شہزاد، تاریخ انجمن، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء

منگلوری، طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، بدایوں؛ نظامی پریس، ۱۹۳۸ء

مودودی، ابوالاعلیٰ مولانا تحریک آزادی اور مسلمان، لاہور؛ اسلامی پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۹۶۴ء

مودودی، سید ابوالاعلیٰ تحریک آزادی ہند اور مسلمان (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش سوم) لاہور؛ اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۳ء

مودودی، ابوالاعلیٰ، مسئلہ قومیت، طبع پنجم، جمال پور؛ مکتبہ جماعت اسلامی ۱۹۴۵ء

مہدی، مظہر، اُردو دانشوروں کے سیاسی میلانات، نو آبادیاتی ہندوستان ۱۹۱۴ء ۔ ۱۸۵۷ء دہلی؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء

مہر، غلام رسول، خطوط غالب، لاہور؛ پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء

مہر، غلام رسول، سرگزشت مجاہدین، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، سن ندارد

مہر، غلام رسول، سید احمد شہید، جلد اوّل، لاہور؛ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۶۸ء

میکیاوَلی، بادشاہ، مترجم محمود حسین، کراچی، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۲۰۰۰ء

میاں، محمد، علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد اول و دوم وسوم، لاہور؛ مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۷ء

ناسک، صلاح الدین، تحریک آزادی، لاہور؛ عزیز بک ڈپو، ۱۹۷۲ء

نجار، عبدالوہاب، قصص الانبیاء، قاہرہ؛ ۱۹۶۶ء

ندوی، سید سلیمان، ہندوؤں کی علمی وتعلیمی ترقی میں مسلمان حکمرانوں کی کوششیں، پٹنہ؛ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۰۱ء

ندوی، ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہید، حصہ اوّل، لاہور؛ خواجہ بک ڈپو، ۱۹۵۸ء

ندوی، ابوالحسن، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، کراچی؛ مجلس نشریات اسلام، ۱۹۹۲ء

ندوی، ابوالحسن، سیرت سید احمد شہید، کراچی؛ سعید ایچ ایم کمپنی ۱۹۷۶ء

ندوی، سلیمان سید، ارض القرآن، کراچی؛ دارالاشاعت، ۱۹۷۵ء

ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، لاہور؛ مکتبہ عالیہ، ۱۹۴۳ء

ندوی، سید سلیمان، کلیات شبلی، کراچی؛ اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۵ء

ندوی، سید سلیمان، مولانا شبلی اُردو شاعری کے لباس میں، کراچی؛ اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۵ء

ندوی، محمد اکرام اللہ خان، وقار حیات، علیگڑھ یونیورسٹی ۱۹۲۵ء

نظامی، خلیق احمد، سن اٹھارہ سوستاون کا تاریخی روزنامچہ، دہلی؛ ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۹ء

نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، لاہور؛ ادارہ اسلامیات، ۱۹۷۸ء

نقوش، لاہور نمبر، (عہد غزنوی ۱۰۱۴ء سے دور حاضر ۱۹۶۱ء تک کی تاریخ) لاہور؛ ادارہ فروغ اردو، فروری ۱۹۶۲ء

نقوی، منظر عباس، ڈاکٹر، وحیدالدین سلیم، حیات اور ادبی خدمات، علیگڑھ یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

نکلس، بیورلی، فیصلہ ہندوستان، مترجم عبدالقدوس ہاشمی، حیدرآباد؛ سید عبدالرزاق تاجر کتب ادارہ اشاعت اردو،

۱۹۴۶ء

نگم، دیانرائن (مدیر)، تحریکِ آزادی کے چالیس سال (ہندوستانی سیاست ۱۹۰۳ء تا ۱۹۴۲ء میں)، رسالہ زمانہ کانپور (۱۹۰۳ء تا ۱۹۴۲ء) سے انتخاب، حصہ اوّل، پٹنہ؛ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۴ء

نگم، دیا نرائن (مدیر)، تحریکِ آزادی کے چالیس سال (ہندوستانی سیاست ۱۹۰۳ء تا ۱۹۴۲ء میں)، رسالہ زمانہ کانپور (۱۹۰۳ء تا ۱۹۴۲ء) سے انتخاب، حصہ دوم، پٹنہ؛ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۴ء

نگم، دیا نرائن (مدیر)، ہندو مسلم مسئلہ، رسالہ زمانہ کانپور (۱۹۰۳ء تا ۱۹۴۲ء) سے انتخاب، جلد پنجم، پٹنہ؛ خدا بخش پبلک لائبریری، ۱۹۹۳ء

نوتھویل، جین، پاکستان کی پہلی کتاب مترجم، ہاشمی فرید آبادی، لاہور؛ مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۳ء

نہرو، جواہر لال، تاریخ عالم پر ایک نظر جلد اول تا جلد سوم، مترجم طاہر منصور فاروقی، لاہور؛ تخلیقات، ۱۹۹۵ء

نہرو، جواہر لال، تلاش ہند، لاہور؛ ادارہ تخلیقات، ۲۰۰۴ء

نیر، طاہرہ، ڈاکٹر، اُردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار، کراچی؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۹ء

ورما، سدھیشور، آریائی زبانیں، لاہور؛ مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۰ء

ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، کراچی؛ دارالاشاعت، ۲۰۰۵ء

ہاشمی، نصیر الدین، دکن میں اُردو، لاہور؛ اُردو مرکز، ۱۹۵۲ء

ہنٹر، ڈبلیو، ڈبلیو، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ترجمہ صادق حسین، لاہور؛ قومی کتب خانہ، ۱۹۵۵ء

ہندوستانی مسلمان، سلسلہ انتخاب رسالہ الناظر لکھنو (۱۹۰۹ء۔۱۹۳۷ء)، پٹنہ؛ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۰۰ء

ھارون، ای۔اے، برطانوی ہند کا نظام سیاسی مترجم نجیب اشرف ندوی سید، حیدرآباد دکن؛ دارالطبع جامعہ عثمانیہ، ۱۹۳۱ء

ھاشمی، نصیر الدین، دکن میں اُردو، (جنوبی ہند میں اُردو کی ابتداء اور اس کی ترقی)، لاہور؛ ۱۹۶۰ء

Afzal M. Rafique, Selected Speeches and Statements of Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah (1911-34) and (1947-48), Lahore; Research Society of Pakistan, University of Punjab, 1966

Ahmed, Aziz, Islamic Modernism in India and Pakistan (1857-1964), London; Oxford University Press, 1967

Ahmed, Feroz, Ethnicity and Politics in Pakistan, Karachi; Oxford University Press, 1999

Ahmed, Jamiluddin, Speeches and Writings of Mr. Muhammad Ali Jinnah, vol.II, Lahore; Mohammad Ashraf, 1947

Ahmed, Rizwan, Saying of Quaid-e-Azam, Karachi; Quaid Foundation and Pakistan Movement Centre, 1993

Allana, G., Quaid-e-Azam Jinnah (The Story of a Nation), Karachi; Ferozsons Ltd., 1967

Amir, Safia, Muslim National in India, New Delhi; Kanishka Publishers, India, 2000

Beyce, James Viscount, The Holy Roman Empire, London; McMillan and Co Ltd., 1950

Bhatnagar, S.K. History of MAO College, Aligarh Bombay; Asia Publishing House, India, 1969

Briffault, Robert, The Making of Humanity, London; Allen and Unwin Ltd., 1928

Bruke, S.M. and Quraishi, Salim Al-Din, The British Raj in India (An Historical Review), Karachi; Oxford University Press, 2004

Burrow, T., The Sanskrit Language London; Faber and Faber, 1973

Butt, M. Rafiq, The Constitution of Pakistan-1973, Lahore; Mansoor Book House, 2004, p.420

Cavalli, Sforza Luigi-Luca, Genes, People and language, New York; North Point Press, 2000

Chatterji, S.K. 'Indo-Aryan and Hindi, New Delhi; Skylark Printers India, 1969

Das, Gupta Jyotrindra, Language Conflict and National Development. Group Politics and National Language Policy in India, Berkeley; University of California Press, 1970

Deshpande, M.M., Sanskrit and Prakrit: Sociological Issues, New Delhi; Motilal Banarsidass Publishers, India, 1993

Dodwell, H.H., Ed., The Cambridge History of the British Empire; vol. I-VI, London; Cambridge University Press, 1932

Edn. Comm: Report of the National Education Commission, Karachi; Govt. of Pakistan, Ministry of Education, 1959

Erdosy, George (edited), The Indo-Aryan of Ancient South Asia, New Delhi; Munshiran Monoharlal Publishers Pvt. Ltd. India, 1995

Fatehpuri, Dr. Farman Prof., History of Pakistan Movement and Language controversy, Karachi, Karachi University Press, University of Karachi, 2001

Fatehpuri, Farman Dr. Prof., The Present State of Indian Politics (Speeches and Letters, Sir Syed Ahmed Khan), Karachi; Karachi University Press, University of Karachi, 2000

History of Freedom Movement, vol. III pt I and II, Karachi; Pakistan Historical Society, 1963

History of Freedom Movement, vol. IV pt I and II, Karachi; Pakistan Historical Society, 1970

Iqbal, Javid, Ideology of Pakistan, Lahore; Ferozsons Publishers, 2000

Jalal, Ayesha, The Sole Spokesman (Jinnah, the Muslim League and the Demand for Pakistan), Karachi; Sang-e-meel Publications, 1999

Jinnah, M.A. Speeches of Mohammed Ali Jinnah as Govern General of Pakistan, Karachi; Observer Press Pakistan, 1948

Kadri, Syed Shamem Hussain, Justice, Creation of Pakistan, Rawalpindi; Army Book Club, 1983

Kazimi, Muhammad Reza, Jinnah-Liaquat Correspondence, University of Karachi, Karachi; Pakistan Study Centre, Jan 2003

Keay, John, History of India, New York; Grove Press, 2000

Khan, Abdul Jamil, Urdu/Hindi: An Artificial Divide, Algora Publishing, New York

Khan, Ayub, Friends Not Masters: A political Biography, Karachi; Oxford University Press, 1967

Khan, Rashid Hasan, Divan-e-Hali, Delhi; Urdu Academy India, 1999

Khan, Shafique Ali, Dr., Two Nation Theory (As a Concept Strategy and Ideology), Second Edition, Karachi; Royal Book Company, 1973

Lahiri, Nayanjot, The Decline and Fall of the Indus Civilization, New Delhi; Paul Press, 2005

Lakshmi, Bari B, and Ramkrishna Reddy, B., Studies in Dravidian and General Linguistics, Hyderabad; Nulan Art Press India, 1991.

Ludden, David, India, and South Asia: A Short History, New York; one world publication, 2002

Ludovici, LJ, Origin of Languages, New York; G.P. Putnam's Sons

Mahajan, V.D., History of Medieval India, New Delhi; S. Chand Company Ltd, 2007

Mohammad, Mujeeb, The Indian Muslims, Delhi; Munshiram Manoharlal Publishers Pvt. Ltd., 1995

Munawwar, Muhammad, Dimensions of Pakistan Movement (2nd ed.) Rawalpindi; Pap-Bard Printers (pvt) Ltd., 1989

Nehru. J.L, The Discovery of India, New Delhi; Oxford University Press, India, 1997

Noman, Mohammad, Muslim India (Rise and Growth of All India Muslim Leauge), Allahabad; Kitabistan, 1942

Parekh, Bikhu, The Legacy of Partition: Punjab in Indian Politics, Issues and Trends, Delhi; Ajanta Publishers India, 1985.

Pirzada, Syed Sharifuddin, Foundation of Pakistan, vol. 1, (1906, 1924), Karachi; National Publishing House Limited, 1969

Pirzada, Syed Sharifuddin, Foundation of Pakistan, vol. II, (1924, 1947), Karachi; National Publishing House Limited, 1970

Pirzada, Syed Sharifuddin, Foundation of Pakistan, vol. III, (1906, 1947), Karachi; Royal Book Company, 1990

Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah, Speeches and Statements 1947-48, Islamabad; Govt. of Pakistan Ministry of Information and Broadcasting Directorate of Films and Publications, 1989

Qureshi, I.H., A Short History of Pakistan, vol. I-IV, Karachi; University of Karachi, 1992

Rehman, Tariq, Dr., The History of the Urdu-English Controversy in Pakistan, Islamabad; National Language Authority, 1996

Report of the Commission on Student Problems and Welfare: Summary of Important Observations and Recommendation, Islamabad; Govt. of Pakistan, Ministry of Education, Central Bureau of Education.

Sayeed, K.B., Pakistan: The Formative Phase, Karachi, 1960

Sharif-al-Mujahid, Muslim League Documents, 1900-1947 Vol. 1, (1900-1908), Karachi; Quaid-e-Azam Academy, 1990

Sherwani, Latif Ahmed, Speeches, Writings and Statements of Iqbal, Lahore; Iqbal Academy Pakistan, 2005

Sherwani, Latif Ahmed, The Pakistan Resolution, Karachi; Quaid-e-Azam Academy, 1988

Sindh, Durlab, A Complete Record of Unity Talks, Lahore; Hero Publications, 1945

Tarachand, The influences of Islam on the Indian Culture, Allahabad; The Indian Press India, Ltd. 1963

Toynbee, Arnold J., A Study of History, New York; Oxford University Press: 1962

Webster's Biographical Dictionary, USA; G and C Marian Co.

Yusuf, The Khilafat Movement (Moulana Mohammad Ali Jouhar), Karachi; Mulana Muhammad Ali Society, 1984

Zaheer, Sajjad, The light (A History of the Movement for Progressive Literature in the Indo-Pak Subcontinent), Karachi; Oxford University Press, 2006

Zaidi, Z.H., (Editor in Chief), Jinnah Papers, vol.V, Quaid-e-Azam Papers Project, Cabinet Division, Govt of Pakistan, 2000

Ziring, Lawrence, Pakistan with Twentieth Century, (A political History), Karachi; Oxford University Press, 2005

رسائل:

اقبال ریویو، کراچی: جنوری ۱۹۶۳ء

Indian Annual Register (1922)، جلداول

برگِ گل، سرسید نمبر ۱۹۴۹ء۔ ۱۹۶۸ء

علیگڑھ میگزین، جنوری ۱۹۳۹ء

موہانی، حسرت، اررو ئے معلیٰ، جنوری ۱۹۴۲ء

نظریہ پاکستان نمبر، چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۰ء

برہان، دہلی (ہندوستان)، مارچ ۱۹۴۳ء، جلد دہم، شمارہ (۳)

یادگاری مجلّہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج، ۱۹۹۵ء

ہفت روزہ، قومی زبان، کراچی، ۲۲ مارچ ۱۹۴۹ء

ماہانہ نگار پاکستان، قائداعظم دستاویزات نمبر، کراچی ۱۹۷۶ء

ہفت روزہ، قومی زبان، جشن صد سالہ نمبر، کراچی: جنوری، فروری ۲۰۰۳ء

برگِ گل، جوہر نمبر، کراچی

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، فروری ۱۹۱۶ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، دسمبر ۱۹۲۵ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، اپریل ۱۹۲۸ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، اگست ۱۹۲۸ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، دسمبر ۱۹۲۸ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، جنوری ۱۹۳۱ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، مارچ ۱۹۳۸ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، اپریل ۱۹۳۸ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، جون ۱۹۳۸ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، اکتوبر ۱۹۳۸ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، جنوری ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، فروری ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، مارچ ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، اپریل ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، مئی ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، جون ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، جولائی ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، اگست ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، نومبر ۱۹۳۹ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، اپریل ۱۹۴۱ء

نگم، دیانرائن منشی، زمانہ، کانپور، جولائی ۱۹۴۱ء

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، مئی ۱۹۲۸ء، جلد ۲۱

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، اگست ۱۹۲۷ء، جلد ۲۰

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، اگست ۱۹۲۸ء، جلد ۲۲

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، دسمبر ۱۹۲۸ء، جلد ۲۲

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، دسمبر ۱۹۳۲ء، جلد ۳۰

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، اکتوبر ۱۹۳۴ء، جلد ۳۴

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، فروری ۱۹۳۷ء، جلد ۲۹

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، اکتوبر ۱۹۳۷ء، جلد ۴۰

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، مئی ۱۹۴۱ء، جلد ۵۳

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، فروری ۱۹۴۳ء، جلد ۵۱

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، مارچ ۱۹۴۳ء، جلد ۵۱

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، مئی ۱۹۴۳ء، جلد ۵۱

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہندوستان)، فروری ۱۹۴۴ء، جلد ۵۳

ہفت روزہ، قومی زبان، کراچی، مئی ۱۹۶۷ء

ہفت روزہ، قومی زبان، کراچی، دسمبر ۱۹۶۳ء

ہفت روزہ، قومی زبان، کراچی، جون ۱۹۶۷ء

ہفت روزہ، قومی زبان، کراچی، جون ۱۹۷۰ء

پمفلٹ:

تعارف نامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

ایک مختصر تعارف نامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء

روداد ۱۹۷۶ء۔ ۱۹۷۷ء، مرکزی اردو بورڈ، لاہور

روداد ۱۹۹۹ء، مجلس ترقی ادب، لاہور

کتابچہ، کل پاکستان اہل قلم کانفرنس (منعقد) ۲۵۔۲۶ نومبر ۱۹۸۰ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

سالانہ روداد یکم جولائی ۱۹۸۳ء تا ۳۰ جون ۱۹۸۴ء، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

کتابچہ، اردو دائرہ معارف اسلامیہ تعارف، تاریخ، آئندہ کے علمی و تحقیقی منصوبے ۲۰۰۳ء

اخبارات:

1- The Paksitan Times, Lahore, Feb. 4, 1979

2- Daily DAWN, Karachi, Nov. 24, 1980

3- Daily DAWN, Karachi, Feb. 18, 1987

4- The NEWS, Karachi, Oct. 29, 1993